زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثـالـث

جلد-۲ شمارہ -۷

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح

نائب مدیران: طیب رضا، اعجاز رحمانی

رابطہ: شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱
Mob.+91 9430667003
email.eqbalhasan35@yahoo.com
www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

قیمت۔فی شمارہ : .....۱۲۵روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۵۰/روپے)
سالانہ : .....۵۰۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۶۰۰/روپئے)
خصوصی تعاون : .....پندرہ ہزار روپئے یا ۳۰۰/امریکی ڈالر

'ثالث' غیر ممالک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	ساٹھ (۶۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	ستر (۷۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	چالیس (۴۰) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	چالیس (۴۰) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	پندرہ (۱۵) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو (۱۰۰) ریال
قطر	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) ریال
کویت	:	پچیس (۲۵) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں Western Union یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتہ پر رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتہ پر بھیجی جا سکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبر شپ کے لیے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad
Union Bank of India
Munger Branch
A/c No. 389002010003800
IFSC Code-UBIN0538906

◀◀ ● ▶▶

فہرست

	اداریہ	ادارہ	۵
	حمد و نعت	سید انور جاوید ہاشمی	۹
مضامین	عوامی جدوجہد کا شاعر حبیب جالب	عارف اشتیاق	۱۱
	اردو زبان کے معروف نظریات، اجمالی جائزہ	عظمیٰ سیٹھ	۲۳
	ادب لطیف کے افسانوں میں عورت	اشرف لون	۳۷
	مخمور سعیدی کی نظموں میں پیکر، استعارہ اور علامت	صابر حسن رئیس	۴۶
	مولانا محمد حسین آزاد نثری اسلوب	شاذیہ مجید ملک	۵۳
	زبان کی تخلیقی اور تشکیلی جمالیات	شاہد الرحمٰن	۶۸
اعتراف	افکار جدید کی شاعری	رضاء الحق صدیقی	۷۶
	مابعد جدید افسانہ اور محمد حامد سراج	شہناز رحمان	۸۰
یاد رفتگاں	کرچی کرچی خواب	منیر احمد فردوس	۸۸
تبرک	نور احمد ناز کی غزلیں		۹۲
غزلیں	عرفان ستار، ڈاکٹر ارمان نجمی، شمسی قریشی، ڈاکٹر سلیم محی الدین، احمد عرفان، ذکی طارق		۹۸ تا ۱۰۵
نظمیں	صدیق عالم، رضی شہاب		۱۰۶
افسانے	بلیکی	نعیم بیگ	۱۱۵
	ہم صورت گر کچھ خوابوں کے	امین صدر الدین بھایانی	۱۱۸
	گشتی	معظم شاہ	۱۳۰
	بد دعا کرنے والے	سلیم سرفراز	۱۳۸
	چھام چھاپ	سیمیں درانی	۱۴۶
	آنگن	فرحین جمال	۱۵۱

	گڈی	شاہین کاظمی	۱۵۵
	ہے تو یہیں کہیں	ثمینہ سید	۱۶۱
تجزیہ	قاضی عبد الستار اور پیتل کا گھنٹہ	مصاعد قدوائی	۱۶۷
انتخاب	پیتل کا گھنٹہ	قاضی عبد الستار	۱۷۰
ناول کا دوسرا باب	راج سنگھ لاہوریا	اقبال حسن خان	۱۷۵
نوسٹیلجا کا ایک باب	نوسٹیلجا	سلمان باسط	۱۹۳
تبصرے	نئی صدی کے افسانے	ارشد عالم	۲۰۰
	گردشِ ایام	انجم قدوائی	۲۰۲
	شجر ہونے تک	سلیم خاں	۲۰۳
	اردو کی شخصی مرثیہ نگاری میں چکبست اور محروم کا حصہ	ڈاکٹر شکیل احمد خان	۲۰۶
ثالث پر تبصرے	حامد سراج، ڈاکٹر یحییٰ صبا، صابر حسن رئیس، نسترن احسن فتیحی		۲۱۱
مکتوبات	سید انور جاوید ہاشمی، شہناز رحمان، صدیق عالم، عظمیٰ سیٹھ، سید محمد یحییٰ صبا، یونس خان، ڈاکٹر پرمود بھارتیہ، سردار آصف		۲۲۰

ثالث ملنے کے پتے

☆ ابن آس محمد، الشمس کمپلیکس، فلیٹ نمبر ڈی۔05، گراؤنڈ فلور، مین راشد منہاس روڈ، نزد جوہر موڑ، بالمقابل میگھنا شاپنگ مال، گلستان جوہر، کراچی (پاکستان) 0321-204358

☆ بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار) 9304888739 91+

☆ آزاد کتاب گھر، ساکچی، جمشید پور (جھارکھنڈ) 6576999980 91+

☆ سکندر نیوز ایجنسی، لال چوک، سری نگر (جموں کشمیر) 9797797124 91+

☆ عبد المغنی، تاج بک ڈپو، اقرا مسجد کمپلیکس، مین روڈ، رانچی (جھارکھنڈ) 9304514659 91+

اداریہ

نظریات، خرد کے مضمرات وممکنات پر مشتمل ہوتے ہیں، اور عقل وخرد کوئی جامد شے نہیں، یہ بھی ایک نامی وجود ہے جو ہر لمحہ متحرک اور متغیر رہتا ہے۔ اس تحرک اور تغیر کے مرحلے میں کبھی نمایاں اور کبھی معدوم بھی ہو جاتا ہے۔ اب اگر نظریات کو اصطلاحی اور تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں زوال ہی کی صورت نظر آئے گی۔

ادب میں دیکھنے یا جانچنے اور پرکھنے کے عمل کو تنقید کہتے ہیں جس کا دائرہ تخلیق کے مقابلے میں محدود ہوتا ہے کیوں کہ تخلیق کار کی جولان گاہِ حیات وکائنات کے ممکنات ومضمرات تک پھیلی ہوئی ہوتی ہے لیکن تنقید نگار کی جولان گاہ فن پارے کے ممکنات ومضمرات تک محدود ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بظاہر تنقید کا عمل تخلیق کے مقابلے میں کمتر ہوتا ہے لیکن درحقیقت ایسی بات نہیں۔ یہ عمل بھی قطرہ میں دجلہ اور جز میں کل دیکھنے کا ہوتا ہے لیکن یہ بھی دانش وبینش کا اسی طرح متقاضی ہوتا ہے جس طرح تخلیقی عمل گویا یہ دونوں صورتیں ہی دیدہ وری کا تقاضہ کرتی ہیں اور دیدہ وری یا دنشوری کوئی ایسی چیز نہیں کہ اٹھے اور بازار سے خرید لائے لیکن صارفیت کے اس دور نے اس کو بھی سہل الحصول بنا دیا ہے اور سچی بات تو یہ بھی ہے کہ موجودہ دور میں فنی تخلیق کو بھی موضوعات کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی مارکیٹنگ کی جاتی ہے اور مارکیٹنگ کے لیے وہی ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں جو دوسرے پروڈکٹس یا مصنوعات کے لیے ہوتی ہیں۔ ادب میں اس کے لیے خاص اصطلاح پی آر شپ ان دنوں بہت مقبول ہے۔ تخلیق اور تنقید دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے خواہ معیار واقدار یا سطح کے لحاظ سے یہ جو بھی ہو لیکن یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ پھر بھی جو چیز موقوف یا زوال پذیر ہو چکی ہے وہ ہے نظریہ۔ اور یہ المیہ تخلیق اور تنقید دونوں کے ساتھ ہے۔

اردو ادب میں اگر تحریکوں اور رجحانوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اسے دو خانوں ''مغل ہندوستان'' اور ''سلطنت برطانیہ در ہند'' کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی زاویۂ نظر سے دیکھا بھی جاتا ہے۔ اور جدید ادب کا دور انگلشیہ دور سے ہی مانا جاتا ہے اور اس کا آغاز حالی کی کاوش قلم سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے کہ یہیں سے نظریاتی ادب کا آغاز ہوا اور

خلیل الرحمٰن اعظمی کے مطابق نظریاتی ادب کا مطلب ہے جدید ادب۔ اگر اس نکتے کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے تاویل کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ نظریے کا فقدان ادب کو روایتی یا فرسودگی کا مظہر بنا دیتا ہے خواہ وہ تخلیقی ادب ہو یا تنقیدی۔

بیسویں صدی کے ثلث اول تک تنقیدی نظریات کی بڑی گہما گہمی رہی۔ تخلیق سے زیادہ تنقید یا مخصوص تنقیدی نظریات کا شور گونجتا رہا۔ یہ گونج انیسویں صدی کے ربع آخر میں مقدمہ شعر وشاعری سے شروع ہوئی تھی اور بڑی تیزی سے شور میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کلیم الدین احمد اور احتشام حسین وغیرہ کی تنقیدوں نے ایسا ماحول بنایا کہ تنقید کے وجود کے آگے تخلیق کمتر درجے کی چیز ہو کر رہ گئی۔ عملی تنقید کے بعد ترقی پسند تحریک کے دور میں اشتراکی تنقید کی جھنکار سب سے پرشور ثابت ہوئی۔ میرا جی نے بیک وقت تخلیقی، تاثراتی، جمالیاتی، نفسیاتی یہاں تک کہ قاری اساس تنقید تک کے بیج کشت ادب میں بو ڈالے۔ فراق اور آل احمد سرور وغیرہ نے تنقید کو تخلیقی اسالیب سے متصف کر کے نظریات کو کیفیات میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ جدیدیت پسندوں نے وجودیت کے فلسفے اور علم نفسیات کے گھال میل سے جمالیات کا جو دبستان قائم کرنے کی کوشش کی، نظریاتی تنقید کی تاریخ میں وہ بھی قابل توجہ بن گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ یہ سکہ بھی کھوٹا ہی ثابت ہوا۔ لیکن نظریاتی تنقید کے دبستان پر جو دبستان کھلتے گئے، اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں اشتقاقی تنقید کی بھی ایک کڑی جوڑنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ بھی بارآور نہ ہو سکی اور مابعد جدیدیت کا شوشہ چھوڑا گیا تو ادب میں نظریات کے سارے مہرے ہی بٹ گئے۔ موجودہ دور میں بازار ادب کے سارے دبستان اور دوکان بند ہیں۔ شور تھم چکا ہے، آوزگم ہو چکی ہے۔ یہ نظریات کے زوال کی کیفیت نہیں تو اور کیا ہے۔ ڈاکٹر منظر اعجاز نے تقریباً دس سال پہلے ''اعجاز نظر'' کے دیباچے ''حرفِ چند'' کے زیر عنوان لکھا تھا۔

> ''جہاں تک تنقید کا تعلق ہے، یہ ادب پارے یا فن پارے کی پرکھ کا نام ہے لیکن پرکھ کا مطلب تنقیص کبھی نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق خوبیوں اور خامیوں کے تعلق سے ہے .....اور قدر کا تعین کرنے والا ناقد ہوتا ہے لیکن یہ ناقد نہ تو سونے کے کھرے کھوٹے کی جانچ کرنے والی بے جان کسوٹی ہوتا ہے اور نہ تو مقدار واوزان کی جانچ کرنے والا بٹ کھرا۔ نہ ہی Equation کی تحلیل اور جانچ کرنے والا کمپیوٹر۔ وہ ایک نامی سیال داخلی خارجی واقعہ ہوتا ہے۔ جو ہر شے کی جانچ اپنے نقطۂ نظر سے کرتا ہے۔ فن تنقید پر لکھنے والے عموماً خیال آرائی اور قلم فرسائی کرتے وقت ناقد کو اکثر بھول جاتے ہیں جس کے نتیجے میں کبھی لاشخصی،

کبھی تاثراتی، کبھی جمالیاتی، کبھی اشتراکی، کبھی نفسیاتی، کبھی دو جہاتی اور ایسی ہی تنقیدوں کے مکتبے ایک دوسرے سے دست و گریبان نظر آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کئی پہلو شے کا ہر پہلو اسی شے کا پہلو ہوتا ہے اور کوئی پہلو کی ضد نہیں ہوتا۔''

تخلیق ہو یا تنقید، یہ انسان کا ذہنی عمل ہے اور انسانی ذہن اس قدر مرکب اور پیچیدہ ہے کہ اس کا سمجھنا انتہائی دشوار ہے۔ علم الابدان کی تجربہ گاہوں میں تحقیق کر کے اسے سمجھنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے لیکن یہ کوشش پورے طور پر اب تک بار آور نہیں ہو سکی ہیں۔ خرد کے نظریات یہاں بھی ناکام رہے ہیں، غالباً اسی احساسِ ناکامی نے افلاطون جیسے تعقل پسند فلسفی کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ فن عطیۂ ربانی ہے اس لیے کسی مخصوص نظریے کے تحت فن کے کسی خاص پہلو کا مطالعہ اور تجزیہ تنقید کی ذمہ داریوں سے پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ یہ مطالعہ جزوی ہی قرار دیا جائے گا۔ اس لئے بقول ڈاکٹر منظر اعجاز:

''یہ بات تو کہی ہی نہیں جا سکتی کہ کوئی بھی جزوی مطالعہ غلط ہے۔ لیکن یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ کسی بھی جزوی مطالعے کا اطلاق کل پر کر دینا غلط ہے۔''

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تقریباً تمام نظریاتی تنقید نے جزوی تنقید کو کل پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ ادب میں نظریات کے زوال کی اہم ترین وجہ یہی ہے۔

☆☆☆

ہم نے ثالث شمارہ نمبر ۵ میں ایک مذاکرہ پیش کیا تھا جس کا عنوان تھا ''کیا اردو افسانہ نگاروں کے پاس نیا لکھنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے؟'' ہمیں خوشی ہے کہ اس مذاکرہ کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور ہندی سہ ماہی ''شیش'' (جودھپور) نے اپنے اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء کے شمارے میں اسے شامل کیا۔ علاوہ ازیں مذکورہ رسالے نے ''ثالث'' شمارہ نمبر ۶ کے اداریہ کو بھی شایع کیا۔ اس عزت افزائی کے لئے ہم رسالے کے مدیر محترم جناب حسن جمال کے شکر گزار ہیں۔

☆☆☆

ثالث شمارہ نمبر ۷ حاضر خدمت ہے۔ ہم اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یادرفتگاں کے تحت ہر شمارے میں ایک یا دو مرحوم ادیبوں کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا رہا ہے۔ زیر نظر شمارے سے ہم نے ایک نیا کالم شروع کیا ہے جس کے تحت ہم عصر قلم کاروں کی خدمات کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ محمد حامد سراج اردو کے کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ ان کے اب تک پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں ''وقت کی فصیل''، ''برائے فروخت''، ''چوب دار''، ''بخیہ گری'' اور ''مجموعہ حامد سراج'' علاوہ ازیں ایک ناولٹ ''آشوب

گاہ'' بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ ہم اس شمارے میں جناب حامد سراج کے فن پر محترمہ شہناز رحمان کا مضمون ''مابعد جدید افسانہ اور محمد حامد سراج'' شائع کر رہے ہیں۔ صبیحہ صبا دنیائے ادب میں ایک درخشاں ستارے کی مانند ہیں۔ ان کا شعری سفر طویل عرصے سے جاری و ساری ہے ان کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں ''لفظوں کا شہر''، ''تری صدا آئی''، ''لفظ بنے تصویر''، ''تخیل'' اور ''دل درد آشنا''۔ شاعری کی یہ سوغات صبیحہ صبا کو ورثے میں ملی ہے۔ صبیحہ صبا نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو زمانے سے منوالیا ہے۔ متحدہ عرب امارات میں مقیم رہیں۔ پاکستان ایمبیسی سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ دبئی میں نوائے وقت کی جانب سے علامہ اقبال ادبی ایوارڈ، انڈس یونیورسٹی ادبی فورم اور میٹروٹی وی ادبی فورم کی جانب سے گولڈ میدل، شیلڈ اور متعدد توصیفی اسناد حاصل کر چکی ہیں۔ ہم اس شمارے میں رضاء الحق صدیقی کا ان پر لکھا گیا مضمون ''افکار جدید کی شاعری'' شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کرام کو یہ سلسلہ پسند آئے گا۔

''ثالث'' نے ایک قلیل عرصہ میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے اور اس نے پوری اردو دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ اس کے لیے ہم اپنے باذوق قارئین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس رسالے کی ویب سائٹ کو تادم تحریر بتیس ہزار چھ سو ایک (۳۲۶۰۱) سے زیادہ بار وزٹ کیا جا چکا ہے۔ آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر اس کے گذشتہ شمارے بالکل مفت پڑھ سکتے ہیں:

www.salismagazine.in

www.facebook.com/salismag

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔ (ادارہ)

◂◂ ● ▸▸

اردو کے منتخب اشعار با اعتبار حروف تہجی و عنوانات

چمن در چمن

مؤلف

ڈاکٹر سید سکندر اعظم

صفحات ۴۰۰ قیمت ۵۰۰

ناشر : ثالث پبلیکیشنز ، شاہ کالونی ، شاہ زبیر روڈ مونگیر

● سید انور جاوید ہاشمی

حمد باری تعالیٰ

دستِ قدرت کا سمجھ اس کو سبق پیشِ نظر
ہے ہویدا آسمانی جو شفق پیشِ نظر

مبتلا کوئی بشر آلام میں ہو جس گھڑی
صبر و استقلال کا رکھے سبق پیشِ نظر

''باخُدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار''
یعنی دیوانوں کو بھی رکھنا ہے حق پیشِ نظر

رزق کرتا ہے فراہم رب جو مخلوقات کو
کیا نہیں رکھتا طبق اندر طبق پیشِ نظر؟

حمد ہو یا نعت، لکھنا ہاشمی آساں نہیں
لکھ چکو پھر بھی لگے خالی ورق پیشِ نظر

◂◂ ● ▸▸

● سید انور جاوید ہاشمی

نعت

ہاشمی لفظوں کی ارزانی رہے پیشِ نظر
جب محمدؐ کی ثناء خوانی رہے پیشِ نظر

پیٹ پر پتھر بندھے ،تکیہ رکھا تھا خِشت کا
کون تھے وہ؟ اُن کی سلطانی رہے پیشِ نظر

سب سے آخر جن کو رب نے بھیجا وہ ختم الرسل
جن کا پھر آیا نہیں ثانی رہے پیشِ نظر

آیتِ قرآن بھی اِس کی گواہی میں ملے
سجدہ داروں کی وہ پیشانی رہے پیشِ نظر

اِذن مِل جائے تو پیدا خود بہ خود اسباب ہوں
پھر نہ کوئی تنگ دامانی رہے پیشِ نظر

سُوئے طیبہ بِن بُلائے کوئی جاتا ہے بھلا!
جاؤ تو پھر اُن کی مہمانی رہے پیشِ نظر

پیش کرنا ہے اگر ہدیہ اُنہیں جذبات کا
پھر عقیدت کی فراوانی رہے پیشِ نظر

◂◂ ● ▸▸

Flat No: B-301, Al Amna Avenue, 7D/1
North Karachi (Pakistan)

● عارف اشتیاق

عوامی جدوجہد کا شاعر: حبیب جالب

حبیب جالبؔ کی شاعری کا دورکم وبیش چالیس سال پر محیط ہے۔ان کے کلام کا دوتہائی حصہ نظموں پر مشتمل ہے ان کی نظمیہ شاعری میں پاکستان کے سیاسی ومعاشی حالات کے تحت فوری طور پر کہی گئی نظموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ نظمیں جنرل ایوب خان کے دور سے شروع ہوکر نواز شریف کے مقتدر ہونے تک بیس سالہ دور کا احاطہ کرتی ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد اس نئے ملک کے لیے جدو جہد کرنے والی عوام کو جس طرح خوابوں کی شکست وریخت کے مرحلے سے دوچار ہونا پڑا. جالبؔ کی غزلوں میں اس کا بیان بہت ہی کرب آمیز طریقے سے کیا گیا ہے۔

وہ چمن جسے ہم نے خون دل سے سینچا تھا — اس پہ حق جتاتی ہیں آج بجلیاں اپنا
فریب رنگ و بو نہ کھا ابھی چمن چمن ہے کہاں — ابھی تو شاخ شاخ پر چمک رہی ہیں بجلیاں
آئے تھے یہاں جن کے تصور کے سہارے — وہ چاند وہ سورج وہ شب ور وز کدھر ہیں
بجلیوں کی یورش ہے، شاخ شاخ ویراں ہے — کیا یہی بہاراں ہے، کیا یہی گلستاں ہے

حبیب جالب اپنی شاعری کے آغاز میں ایک روایتی غزل گو شاعر تھے مگر جب انہوں نے تقسیم ہند کے وقت انسانیت کا قتل عام ہوتے دیکھا تو وہ اس طبقے کے دشمن ہوگئے جنہوں نے اپنے مفادات کے لیے عوام کو تقسیم کیا اور تمام انسانی حقوق کو بالائے طاق رکھ کر اپنے سیاسی مفادات حاصل کیے۔ تقسیم کے بعد حبیب جالب نے یہ محسوس کرلیا کہ نئی آزاد ریاستوں کے حکمرانوں اور ظالم وجابر انگریزوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حبیب جالب نے مزدوروں اور عام لوگوں کو اپنی شاعری سنانے کے لیے منتخب کیا اور وہ ایک بہترین عوامی شاعر کہلائے۔ جالب نے بھی اپنی شاعری کے آغاز میں غزل کی روایت کا انتخاب اسی انداز کے زیر اثر کیا۔ لیکن جلد ہی ان کو احساس ہوگیا کہ ورکنگ کلاس کی جدو جہد کے موضوعات کو مؤثر طریقے سے ادا کرنے کے لیے کلاسیکل انداز نا کافی ہے۔ اس لیے سلیس انداز اور زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ فیضؔ

نے کہا تھا کہ اردو شاعری کا آغاز اگرچہ ولی دکنی سے ہوا مگر جالبؔ سے زیادہ کسی نے بھی اس قدر عوام کو اپیل نہیں کیا۔ وہ آخر تک ایک سچے اشتراکی اور عوام کے حقوق اور امن کے لیے لڑنے والے سپاہی رہے۔ اکثر لوگ موقع پرستی سے کام لیتے رہے لیکن جالبؔ سچائی پر ڈٹے رہے۔

جالب کا پیدائشی نام حبیب احمد تھا۔ والد کا اسم گرامی عنایت اللہ اور والدہ کا رابعہ بصری تھا۔ انکی پیدائش 26 فروری 1929 کو میانی افغاناں، ضلع ہوشیار پور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اینگلو عربک اسکول دہلی میں نویں تک حاصل کی۔ تعلیم ادھوری رہی۔ ابتدائی عمر میں ہی انہوں نے معاشی ضرورتوں کی خاطر ملازمت سے وابستگی اختیار کرلی۔ کئی روزناموں میں کام کیا کچھ دنوں تک فلموں سے بھی وابستہ رہے۔ وہاں نغمے لکھے اور فلم سازی میں بھی حصہ لیا۔ اس لیے حبیب جالبؔ کا انداز دوسرے شعراء سے جدا ہے۔ وہ موسیقی سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے جس کے اثرات کا اندازہ ان کی شاعری کی نغمگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ دکھی دلوں کی ترجمانی کرنے والے شاعر حبیب جالبؔ کئی ماہ تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد 12 مارچ 1993 کو اپنے عشاق عوام کو داغ مفارقت دے گئے۔

حبیب جالب کی پیدائش اور پرورش محرومی کے حالات میں ہوئی۔ ان کا تعلق اس پچھڑے طبقے سے تھا جو نسلوں سے کسی نہ کسی طرح سماجی جبر کا شکار ہیں۔ انہوں نے آرام وآسائش کو اپنے مشن کے بدلے قبول نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''میں عوام میں سے ہوں، ایک پیدائشی مزدور اور پسماندہ لوگوں کے جذبات کا صحیح ترجمان۔'' حبیب جالب ہمیشہ مظلوم غریب اور نچلے طبقات کے ساتھ وابستہ رہے اور ان کے حقوق کی بات کہتے رہے۔ وہ کبھی کسی ایوارڈ یا اعزاز کے خواہش مند نہیں رہے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ ادیب وشعراء ایسے لوگوں سے ایوارڈ ہرگز نہ لیں جو حقوق انسانی پورے نہیں کرتے اور انسانیت پر ظلم کرتے ہیں ۔

اقتصادی جبر اور سامراجی نظام کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے وقت ذرہ برابر حکمرانوں سے خائف نظر نہیں آتے۔ پاکستان کی سیاست پہ طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے — اپنا حلقہ ہے حلقۂ زنجیر
اور حلقے ہیں سب امیروں کے — ہر بلاؤل ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے — وہی اہلِ وفا کی صورتِ حال
وارے نیارے ہیں بے ضمیروں کے

حبیب جالب کی حمایت ہر اس طبقے کو حاصل ہے جو کسی نہ کسی طرح ظلم کا شکار ہے مزاحمت کر رہے طلبہ کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے ''شہر بدر طلباء'' کے نام میں کہتے ہیں:

فضا میں اپنا لہو جس نے بھی اچھال دیا ستم گروں نے اسے شہر سے نکال دیا
یہی تو ہم سے رفیقانِ شب کو شکوہ ہے کہ ہم نے صبح کے رستے پہ خود کو ڈال دیا

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص:۱۶۸

سرمایہ دارانہ نظام:

حبیب جالب کے زمانہ میں درمیانی طبقے کے نوجوانوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی سماجی و معاشی بنیادوں سے جانکاری حاصل کر لی تو ان کو اندازہ ہوا کہ جدید معاشرہ میں، نہ صرف یورپ اور مغربی ممالک بلکہ امریکہ ایشیاء اور لاطینی امریکہ کے ان تمام ممالک میں جو اپنی آزادی کو جدوجہد کر رہے ہیں تمام برائی کی جڑ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ اس جانکاری کے اظہار کی ضرورت نے ترقی پسند شاعری اور نثر کو جنم دیا۔ کسی نے لکھا ہے کہ یونانی دیومالا کے ہیرو پرومیتھوس کا قصور یہ تھا کہ اس نے انسان کو آگ کا استعمال سکھایا تھا اور اس طرح دیوتاؤں کا راز دیویوں پر افشا کر دیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں دیوتاؤں نے پرومیتھوس کو چٹان سے بندھوا دیا تھا جہاں ایک گدھ دن بھر اس کی بوٹیاں نوچ کر کھاتا تھا۔ اس اذیت ناک سزا کے باوجود جب دیوتا اس سے کہتے کہ معافی مانگ لو تا کہ اس عذاب سے چھٹکارہ پاؤ تو وہ جواب دیتا کہ مجھے یہ اذیت منظور ہے مگر تمہاری یہ غلامی نامنظور۔ پاکستان میں دور آمریت میں اظہار خیال پر پابندیاں عائد کی گئیں اور حکومت وقت کے خلاف بولنے والوں کو پا بہ زنجیر کیا گیا۔ جالبؔ بھی اس جرم کے مرتکب ہوئے تو انہیں بھی قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑی۔ اس خیال کو لطیف کلاسیکی پیرایوں میں یوں قلم بند کرتے ہیں ؎

صیاد نے یونہی تو قفس میں نہیں ڈالا

حبیب جالب کے سلسلے میں سبط حسن لکھتے ہیں:

''ایوب خان کی آمریت اس لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گی کہ اس تاریک دور میں جسٹس کیانی مرحوم اور حبیب جالبؔ ابھر کر سامنے آئے۔ جب کبھی اس ملک کی سچی تاریخ لکھی جائے گی تو دنیا کو معلوم ہوگا کہ خوف اور دہشت کی اس فضا میں جہاں سانس لیتے ڈر لگتا تھا انہوں نے قوم کی ڈوبتی نبض میں کس طرح زندگی کا خون دوڑایا۔''

حبیب جالبؔ کی شاعری پر اگر نظر ڈالتے ہیں تو بیشتر نظمیں احتجاجی جذبات سے پر نظر آتی ہیں۔ ان کے بارے میں لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان کی نظمیں ہنگامی حالات اور فوری واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں اور ان میں بیشتر سیاسی نوعیت کی ہیں۔ ان میں پانچویں دہائی سے لیکر نویں دہائی کے ابتدائی چند برسوں تک کے پاکستان کی سیاسی تاریخ کے نقوش بکھرے پڑے ہیں۔ عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کی

طرح حبیب جالب بیسویں صدی کے عوامی شاعر ہیں۔ ''روئے بھگت کبیر'' اور ''بھئے کبیر داس'' میں طبقاتی کشمکش اور معاش جبر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اک پٹڑی پر سردی میں اپنی تقدیر کو روئے دو جازلفوں کی چھاؤں میں سکھ کی سیج پہ سوئے
راج سنگھاسن پر اک بیٹھا اور اس کا داس بھئے کبیر اداس
اونچے اونچے ایوانوں میں مورکھ حکم چلائیں قدم قدم پر اس نگری میں پنڈت دھکے کھائیں
دھرتی پر بھگوان بنے ہیں دھن ہیں جن کے پاس بھئے کبیر اداس

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور ۱۹۹۳ء ص:۱۱۱

روئے بھگت کبیر

سوچو نہ کیا لاہور میں دیکھا ہم نے میاں نظیر پہنیں سوٹ انگریزی بولیں اور کہلائیں میر
چودھریوں کی مٹھی میں ہے شاعر کی تقدیر روئے بھگت کبیر
اک دوجے کو جاہل سمجھیں نٹ کھٹ بدھی وان میٹرو میں جو چائے پلائے بس وہ باپ سمان
سب سے اچھا شاعر وہ ہے جس کا یار مدیر روئے بھگت کبیر
سڑکوں پر بھوکے پھرتے ہیں شاعر موسیقار ایکٹروں کے باپ لیے پھرتے ہیں موٹر کار
فلم نگر تک آپہنچے ہیں سید میر فقیر روئے بھگت کبیر

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور ۱۹۹۳ء ص:۱۰۹

سیاسی آمریت کی تنقید:

حبیب جالبؔ خالص تخلیق کار تھے اور ناقدین کی صف سے اپنے آپ کو الگ سمجھتے تھے۔ ذوقؔ اور غالبؔ میں سے غالبؔ پسند تھے۔ وہ ہمیشہ عوام کی ترجمانی کرتے اور اپنے آپ کو عوام سے قریب پاتے۔ اس لیے فیضؔ نے انہیں کہا تھا کہ ولی دکنی سے لے کر آج تک کسی بھی شاعر کو اتنے سامعین میسر نہیں آئے جتنے آپ کو ملے اور یہ حقیقت ہے کہ آپ سچ مچ عوامی شاعر ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہوسکتا ہے کہ امراء و شرفاء یا نقاد انہیں عظیم شاعر نہ تسلیم کریں لیکن وہ عوامی پریشانیاں، مظالم اور سیاسی جبر کو کبھی قبول نہیں کر پائے۔ لندن میں ایک محفل کے دوران زہرہ نگار نے حبیب جالبؔ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حبیب جالبؔ نے علامہ اقبالؔ کے جشن صد سالہ کے موقع پر کہا تھا کہ علامہ اقبال مرحوم میری ڈیوٹی لگا گئے تھے کہ ''اٹھو میری دنیا

کے غریبوں کو جگا دو' اور میں اس ڈیوٹی کو بھگتانے کے لیے پندرہ بار جیل جا چکا ہوں۔

حبیب جالب عوامی شہرت یافتہ نظیر اکبر آبادی کے رنگ میں نظمیں کہنے والے شاعر تھے لیکن انہوں نے سیاسی آمریت کی تنقید کی اور جنرل ایوب خاں کی وضع کردہ 1962 کے دستور کے خلاف کہی گئی نظم ''دستور'' میں لب ولہجہ تلخ ہو گیا اور وہ حکومت کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے:

دیپ جس کا محلات میں ہی جلے — چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے — ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں مانتا — میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے — ظلم کی رات کو ، جہل کی بات کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں جانتا

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص:۱۲۹

وہ بڑے جذباتی، حساس اور عظیم انسان تھے۔ عوام کے دکھ دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔ عوام کے دکھوں کو الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرنا اس کا شعار تھا۔ تقسیم کے بعد جب جمہوریت بحال ہوئی تو ان کے چہرے پر شدید ردعمل کے آثار نمایاں تھے۔ وہ جمہوریت کے خاتمہ اور بنیادی حقوق کی معطّلی پر بہت زیادہ مضطرب تھے۔ ان کی نظم ''جمہوریت'' جنرل ایوب خاں کے اس دستور کے خلاف احتجاج کی کھلی تصویر تھی۔ یہ نظم ان کے دوسرے مجموعہ کلام ''سرمقتل'' میں شامل ہے جسے 1966 میں ضبط کر لیا گیا۔ یہ نظم معاشی نابرابری اور جبر وتشدد کے خلاف الم بغاوت ہے۔

یہ ملیں یہ جاگیریں — کس کا خون پیتی ہیں
بیرکوں میں یہ فوجیں — کس کے بل یہ جیتی ہیں
کس کی محنتوں کا پھل — داشتائیں کھاتی ہیں

دس کروڑ انسانوں
زندگی سے بیگانوں

صرف چند لوگوں نے — حق تمہارا چھینا ہے
خاک ایسے جینے پر — یہ بھی کوئی جینا ہے
بے شعور بھی تم کو — بے شعور کہتے ہیں
سوچتا ہوں یہ ناداں — کس ہوا میں رہتے ہیں

اور یہ قصیدہ گو — فکر ہے یہی جن کو
ہاتھ میں علم لے کر — تم اٹھ سکو لوگوں
کب تلک یہ خاموش — چلتے پھرتے زندانوں
جھونپڑوں سے رونے کی — کیوں صدائیں آتی ہیں
جب شباب پر آکر — کھیت لہلہاتے ہیں
کس کے نین روتے ہیں — کون مسکراتا ہے
کاش تم کبھی سمجھو — کاش تم کبھی جانو

دس کروڑ انسانوں

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص:۱۳۱

جنرل ایوب پاکستان میں ترقی اور معاشی مساوات فروغ دینے کے دعویدار تھے لیکن نواب آصف کالاباغ جیسی جاگیردار شخصیت کا وزیر اعلیٰ بنایا جانا ان کے قول وفعل کے تضاد کا ایک بڑا مظہر ہے:

سینکڑوں حسن ناصر — ہیں شکار نفرت کے
صبح و شام لٹتے ہیں — قافلے محبت کے
جب سے کالے باغوں نے — آدمی کو گھیرا ہے
مشعلیں کر و روشن — دور تک اندھیرا ہے

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص:۱۳۲

۱۹۷۱ء میں برصغیر کی تاریخ میں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کا قیام تاریخ کا ایک ایسا جبر ہے حبیب جالب نے اپنی شاعری میں جگہ دی اور عملی طور پر اس کی مخالفت بھی کی۔ جب مشرقی پاکستان میں فوج کے ہاتھوں قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ جنرل یحیٰ خان کی مخالفت میں جیل بھیجے گئے:

محبت گولیوں سے بو رہے ہیں — وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہیں
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے — یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہیں

تقسیم کا مسئلہ:

حبیب جالب کو ملک کی تقسیم کا شدید غم تھا۔ آزادی کی جدوجہد میں شامل بزرگوں نے جس آزاد ہندستان کا تصور پیش کیا تھا ویسا ہرگز نہیں ملا۔ انگریزوں سے نجات تو پالی لیکن اپنے ہی بھائی کے خون کے

پیاسے ہوگئے۔تقسیم کے وقت لاکھوں لوگ بے گھر، ہزاروں مائیں بیوہ اور بے شمار بچے یتیم ہوگئے۔بہت سی دوشیزائیں اغوا ہوئیں۔ان حادثات نے اپنے پیچھے ایک کربناک فضا کو چھوڑا تھا۔شاعر کا دل اس سے تڑپ اٹھا۔حبیب جالب کی ایک طویل نظم ''داستان دل دونیم'' میں تقسیم کے مظالم کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ملاحظہ ہو:

ایک بار اور ہم ہوئے تقسیم — ایک بار اور دل ہوا دو نیم
ہوگئے دور راہبر کیا کیا — چھن گئے ہائے ہم سفر کیا کیا
یہ فسانہ ہے پاسبانوں کا — چاق و چوبند نوجوانوں کا
سرحدوں کی نہ پاسبانی کی — ہم سے ہی دادلی جوانی کی

اقتصادی جبر:

حبیب جالب کی اقتصادی جبر پر بھی نگاہ تھی۔امریکہ اور اس کے رفیق پہلے غریب ملکوں کو قرض دیتے ہیں پھر ان کو محکوم بنانے کی ناپاک سازشیں کرتے ہیں۔آج امریکہ کی سرپرستی میں چلنے والی دہشت گرد مخالف کارروائیاں اس کے اسی اقتصادی حربے کا جز ہیں کیونکہ جن الزامات کا بہانا بنا کر عراق اور دوسرے ممالک پر حملے کیے گئے۔اس میں عراق کو اقتصادی اور جانی نقصان ہی ہوا ہے ملاحظہ ہو یہ اشعار:

قرض دے کر غریب ملکوں کو — چھین لیتا ہے روح آزادی
آج زیر عتاب ہیں اس کے — ہر بڑا شہر ہر حسین وادی

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص:۱۷۶

آج کے دور میں سرمایہ پرستی کا سب سے بڑا علمبردار امریکہ ہے۔امریکہ ہمیشہ پاکستان کو خطیر مالی امداد دیتا رہا ہے اور ایشیا کے اس خطے میں اپنا اُلّو سیدھا کرتا رہا ہے جس کی وجہ سے پاکستان کے اندر پہلے سے زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں اور ہندوستان و پاکستان میں کشیدگی کی اصل وجہ خود امریکی پالیسیاں رہی ہیں۔

پاکستان کے سیاسی و معاشی دور میں امریکی ریشہ دوانیاں یہاں کے باشعور طبقے کے لیے ہمیشہ سے اہم مسئلہ رہی ہیں اس کے برعکس ملک کے حکمراں طبقے نے اکثر امریکہ کی مداخلت منظور کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔اس ضمن میں جالب کی نظمیں ''صدر امریکہ نہ جاؤ'' امریکہ یاترا کے خلاف'' ''امریکہ نہ جا'' پاکستان کے حکمرانوں کی اس روش کے خلاف احتجاج ہیں ''امریکہ یاترا کے خلاف'' میں غزل کی اشاریت اور ایمائیت سے کام لیا گیا ہے:

طواف کوئے ملامت کو پھر نہ جا اے دل — نہ اپنے ساتھ ہماری بھی خاک اڑا اے دل

نہیں ہے کوئی وہاں درد آشنا اے دل — اس انجمن میں نہ کر عرض مدعا اے دل

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص:۱۷۸

بیرون ملکی پالیسیاں:

نچلے طبقے کے معاشی کوائف کے موضوع پر کہی گئی نظم ''آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے'' بھی حکمرانوں کے بے سود غیر ملکی دوروں اور قول و فعل کے تضاد پر گہرا طنز ہے۔روس اور چین سو شلسٹ ممالک رہے ہیں، پاکستان کے رہنما ان ممالک کے دورے تو کرتے رہے ہیں مگر ان ملکوں کی معاشی پالیسی سے حتی الامکان اجتناب کرتے ہیں۔نظم ''مشیر'' میں شاعر پاک، چین تعلقات پر کچھ یوں طنز کرتا ہے:

چین اپنا یار ہے — اس پہ جاں نثار ہے
پر وہاں جو ہے نظام — اس طرف نہ جایئے
اس کو دور سے سلام

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص:۱۴۰

یہ نظمیں جو امریکہ اور چین سے پاکستان کے رشتے کے تعلق سے کہی گئی ہیں دراصل ترقی پذیر ملکوں کے اس نچلے طبقے کی ترجمانی کرتی ہیں جو کہ معاشی جبر کے عوض سوشلسٹ نظام کا حامی ہے۔روس سے متعلق پاکستان کے تعلقات کے سلسلے میں ''ترانہ دوستی'' کو بھی اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔امریکہ اور دوسرے جابر ممالک کے سلسلے میں جالبؔ کی یہ نظم شدید طنز کا تیور لیے ہوئے ہے۔حالانکہ ایسے اشعار میں شعریت متاثر بھی ہوئی ہے:

انگریزوں کے مٹھو کہلاؤ نا — امریکہ کے تلوے سہلاؤ نا
آج تلک ان کے دھوکے کھائے ہیں — آزادی کے سر پر خاک نہ ڈالو
بھیک نہ مانگو

''امریکہ نہ جا'' اسی قبیل کی ایک منفرد نظم ہے یہاں طنز اس سے زیادہ شدید ہے۔اس نظم میں پاکستانی نئی سیاست اور معیشت کے تلخ حقائق کو سامنے لایا گیا ہے:

تیرے ہی لطف و کرم سے ہے ہماری زندگی — کر کے کم جینے کے امکانات امریکہ نہ جا
ایک پنڈی کیا نچھاور پورا ملک — بھیجتا رہ آتشیں آفات امریکہ نہ جا

خاک زریں تجھ سے ہے تیری بدولت تخت وتاج　　تجھ سے قائم ہے ہماری ذات امریکہ نہ جا
تو ہی بتلا کس طرح پالیں گے اتنی فوج کو　　جوڑتے ہیں تیرے آگے ہاتھ امریکہ نہ جا

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص ۲۹۵

مذکورہ نظم کا دوسرا شعر اوجڑی فوجی کیمپ کے اسلحہ خانے میں ہوئی آگ زنی کے واقعہ کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ جنرل ضیاء کے عہد میں شہر راولپنڈی میں ہونے والے اس حادثے میں بڑی تباہی و بربادی ہوئی تھی اور سینکڑوں جانیں تلف ہوئی تھیں۔ اس سانحے کے سلسلے میں ایک طبقے کا خیال رہا ہے کہ یہ حکومت کی ایک سوچی سمجھی چال تھی یعنی اسلحہ خانے میں آگ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی:

جو اوجڑی میں مارا گیا پس وہ مر گیا　　خاکی تھا اور خاک کی صورت بکھر گیا
منتہائے ایزدی کے مطابق گزر گیا　　ہر بے گناہ کا خون مقدر کے سر گیا

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص: ۳۵۴

مذہب کے نام پر جبر:

جالب کا خیال تھا کہ مذہب کی آڑ لے کر تقدیر پرستی کا رجحان عام کرنا ملائیت کا شیوہ رہا ہے۔ مذہبی رہنما غریب عوام کو قناعت کا درس دیتے ہیں مگر خود ہر قسم کی مادی آسائش کے حصول کی خاطر اپنے ایمان کا سودا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ نظم ''علماء سو کے نام'' میں استحصالی طبقے کی حمایت دینے والے علماء پر تنقید کی گئی ہے۔

رضائے ایزدی تم نے کہا دین الٰہی کو　　نہیں مٹنے دیا تم نے نظام کج کلاہی کو
دیا تم نے سہارا ہر قدم پر زار شاہی کو　　کہا تم نے کہ جائز ہے فرنگی کی وفاداری
بتایا تم نے ہر اک عہد میں مذہب کو سرکاری　　لیے پرمٹ دیئے فتوے رکھی ایوب سے یاری

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص: ۶۵۔۱۶۴

مذہب کی آڑ لے کر حکومت نے جب تک چاہا اسلام خطرے میں ہے کہہ کر اپنی حکومت کی بقا کے لیے ملاؤں کی حمایت حاصل کرتے رہے۔ سیاست اور ملائیت کے گٹھ جوڑ نے پاکستان کے بنیادی مسائل سے عوام کا دھیان ہٹائے رکھا اور تقدیر پر بھروسہ کر کے پڑے رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ تقدیر پرستی کے رجحان کو ہمیشہ تقویت بخشتے رہے۔ حبیب جالب کی نظم ''خطرے میں اسلام نہیں'' اور ''وطن کو کچھ نہیں خطرہ'' اس ضمن میں لکھی گئی ہیں:

خطرہ ہے زرداروں کو　　گرتی ہوئی دیواروں کو
صدیوں کے بیماروں کو　　خطرے میں اسلام نہیں
ساری فوجوں کو گھیرے ہیں آخر چند گھرانے کیوں
نام نبی کا لینے والے الفت سے بیگانے کیوں

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص: ۱۶۲

وطن کو کچھ نہیں خطرہ نظام زر ہے خطرے میں　　حقیقت میں جو رہزن ہے وہی رہبر ہے خطرے میں
اگر تشویش لاحق ہے تو سلطانوں کو لاحق ہے　　نہ تیرا گھر ہے خطرے میں نہ میرا گھر ہے خطرے میں

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص ۱۴۴

بدعنوان سیاست دانوں کی حمایت کرنے والے ایمان فروش ملاؤں کو بھی جالبؔ نے اپنی کئی نظموں میں ہدف ملامت بنایا ہے۔ اس سلسلے میں نظم ''مولانا'' اور ''علماء سو کے نام'' قابل توجہ ہیں:

حقیقت کیا ہے یہ تو آپ جانیں یا خدا جانے　　سنا ہے جمی کارٹر آپ کا ہے پیر مولانا
زمینیں ہوں وڈیروں کی مشینیں ہوں لٹیروں کی　　خدا نے لکھ کے دی ہے یہ تمہیں تحریر مولانا

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص: ۱۶۶

کہا تم نے کہ جائز ہے فرنگی کی وفاداری　　بتایا تم نے ہر اک عہد میں مذہب کو سرکاری
لیے پرمٹ دیئے فتوے رکھی ایوب سے یاری

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص: ۶۵۔۱۶۴

ادیبوں اور قلمکاروں کے رویئے پر تنقید:

پاکستانی حکومت نے نہ صرف مولویوں کی ہی حمایت حاصل کی بلکہ ادیبوں و شاعروں، صحافی اور دانشوروں کے ایک طبقے نے ہمیشہ جاہ و منصب اور مراعات حاصل کرنے کے لیے حکومت کے قصیدے لکھے اور ان کے مظالم کی تاویلیں پیش کیں ہیں لیکن ایسے ماحول میں حبیب جالبؔ ہمیشہ حکومت اور ان جیسے ایمان فروشوں کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ جنرل ایوب کی آمریت کے دور میں رائیٹر گلڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے سربراہ خود جنرل ایوب تھے جن کے ہاتھوں قلمکاروں کو ان کی بہترین تخلیق کے لیے ہر سال انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک حساس اور باشعور ادبی تنظیم ہونے کے لحاظ سے اس کا کردار قدرے مشکوک رہا ہے۔ اور وہ سارے پاکستانی قلمکار جن کو اپنے عہد کے مسائل کے تئیں ذرا بھی تشویش تھی رائٹرز گلڈ سے دور رہے۔ یاد رہے کہ ہمارے دور کی مشہور فکشن رائٹر قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے ناول ''آگ کا دریا'' پر

ملنے والے ایوارڈ کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ جالبؔ کے قطع ''رائٹرز گلڈ'' ''میں خوش نصیب شاعر''، ''آدم جی ایوارڈ''، وغیرہ ادبی بدعنوانی سے پیدا ہونے والے اسی جبر کے خلاف کہے گئے ہیں:

ذہانت رو ہی ہے منھ چھپائے جہالت قہقہے برسا رہی ہے
ادب پر افسروں کا ہے تسلط حکومت شاعری فرما رہی ہے

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص:۱۸۴

ادیبوں اور قلمکاروں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہیں کہ دراصل ایک حساس شاعر و ادیب کی سماج اور معاشرے کے لیے کیا ذمہ داریاں ہونی چاہئیں۔ ''میں خوش نصیب شاعر'' میں کہتے ہیں:

ہر دور کے بھکاری شاعر ادیب شاعر بکتے قدم قدم پہ دیکھے خطیب شاعر
بیچا نہیں ہے میں نے اپنا ضمیر جالبؔ میں خوش نصیب شاعر وہ بدنصیب سارے

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 صفحہ نمبر ۱۸۳

حبیب جالبؔ کی نظم ''ظلمت کو ضیاء'' میں جنرل ضیاء الحق کو ظلمت کے استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے:

لوگوں یہ ہی ہم نے جاں واری کی ہم نے انہی کی غمخواری
ہوتے ہیں تو ہوں یہ ہاتھ قلم شاعر نہ بنیں گے درباری

ابلیس نما انسانوں کی اے دوست ثنا کیا لکھنا ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
اے میرے وطن کے فنکار ظلمت پہ نہ اپنا فن وارو یہ محل سراؤں کے باسی قاتل ہیں سبھی اپنے یارو
ورثے میں ہمیں یہ غم ہے ملا اس غم کو نیا کیا لکھنا ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
اے دیدہ ور و اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص۔۱۸۱

اس نظم کی وجہ سے حبیب جالبؔ کو پنجاب کی بدترین جیل سیالوامی میں چھ ماہ مقید رہنا پڑا۔ اسی طرح سے صحافتی بے ضمیری کے ذیل میں جالبؔ کی نظم ''صحافی سے'' بڑی مؤثر انداز سے لکھی گئی ہے:

قوم کی بہتری کا چھوڑ خیال فکر تعمیر ملک دل سے نکال
تیرا پرچم ہے تیرا دست سوال بے ضمیری کا اور کیا ہو ملال
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

خواتین کے مسائل:

رجعت پسند قوموں کے غلبے کے سبب پاکستان میں خواتین کی آزادی ایک اہم مسئلہ رہی ہے۔ خواہ وہ جنرل ایوب کے عہد کا Family ordinance جیسا ترقی پسندانہ قدم ہو۔ خواہ عہد ضیاء الحق کے متنازعہ فی حدود آرڈ نینس اور آدھی گواہی کے قانون ہوں۔ رجعت پسند قوتوں کا رویہ ہمیشہ ہی خواتین مخالف رہا ہے۔ نظم ''عورت'' ملاحظہ ہو:

بازار ہے وہ اب تک جس نے تجھے نچوایا دیوار ہے وہ اب تک جس میں تجھے چنوایا
دیوار کو آتوڑیں ، بازار کو آڈھائیں انصاف کی خاطر ہم سڑکوں پہ نکل آئیں
مجبور کے سر پر شاہی کا وہی سایا بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا
تقدیر کے قدموں پر سر رکھ کے پڑے رہنا تائید ستم گر ہے چپ رہ کے ستم سہنا
تو آگ میں اے عورت زندہ بھی جلی برسوں سانچے میں ہر اک غم کے چپ چاپ ڈھلی برسوں

کلیات حبیب جالب، ماورا پبلشرز، لاہور 1993 ص ۲۰۲

حبیب جالب بیسویں صدی کا ایسا شاعر ہے جس کو سب سے زیادہ عوامی مقبولیت حاصل ہے۔ عوام کے ہر اس طبقے کے ساتھ اس کی ہمدردیاں تھیں جس کے خلاف ظلم ہو رہا ہو:

کچھ لوگ خیالوں سے چلے جائیں تو سوئیں بیتے ہوئے دن رات نہ یاد آئیں تو سوئیں
محسوس یہ ہوتا ہے ابھی جاگ رہے ہیں لاہور کے سب یار بھی سو جائیں تو سوئیں

◀◀ ● ▶▶

Delhi University , New Delhi, India
aarifdu@gmail.com

نام کتاب	:	اختر شیرانی کی جنسی اور رومانی شاعری
مصنفہ	:	قمر جہاں
اشاعت	:	۲۰۱۵ء
قیمت	:	۱۴۴/روپے
ملنے کا پتہ	:	ڈاکٹر قمر جہاں، سابق یونیورسیٹی پروفیسر شعبۂ اردو، تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسیٹی، بھاگلپور بہار

● عظمیٰ سیٹھ

اُردو زبان کے معروف نظریات.....اجمالی جائزہ

اُردو زبان کی کہانی کا آغاز اُس وقت ہوا جب آریہ وسط ایشیاء کے میدانوں سے اُتر کر پنجاب آئے اور یہاں کے قدیم باشندوں کو جنوبی ہندوستان میں دھکیل دیا۔ آریہ ہندوؤں کی زبان سنسکرت تھی۔ مختلف لوگوں کے باہمی میل جول سے جو زبان وجود میں آئی ''پراکرت'' کہلائی۔ بدلتے بدلتے پراکرت برج بھاشا میں بدل گئی۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں وارد ہونے کے بعد فارسی زبان رواج پائی۔ فارسی میں بہت سے ترکی وعربی الفاظ ملے ہوئے تھے۔ اسی طرح فارسی اور ترکی کے بے شمار الفاظ برج بھاشا میں ملنے لگے۔ کچھ پرتگالی اور فرانسیسی الفاظ بھی برج بھاشا میں مل گئے اور برج بھاشا ایک نئی صورت اختیار کر گئی۔

> ''اس زبان کو ہندو مسلمان سمجھ سکتے تھے کیونکہ اس میں ہندی بھاشا اور فارسی کے الفاظ ملے ہوئے تھے۔ چونکہ مغلوں کے لشکروں میں ہندو مسلمان سب ہی نوکر تھے اس لیے یہ زبان چھاؤنیوں میں پھیل گئی۔ سب سپاہی ایک دوسرے کا مطلب اسی بولی کی مدد سے سمجھ لیتے تھے۔ اس طرح یہ بولی ''اردو'' کہلائی ترکی زبان میں اردو لشکر کو کہتے ہیں گویا اردو لشکری بولی تھی۔''(۱)

اُردو زبان کے مختلف نام مختلف ادوار میں سننے میں آتے رہے۔ اول روایت کے مطابق اردو زبان کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی اور اُس سے متعلق ہر چیز ہندی یا ہندوی کہلاتی تھی اردو کو بھی ہندی و ہندوی کے نام سے پکارا گیا۔ دکنی، گوجری، دہلوی وریختہ اپنے اپنے علاقوں می نسبت سے کہلائی:

> ''اردو کا لفظ ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے یعنی اوردو، اوردہ، اردہ اور اورودو، جس کے معنی لشکر یا لشکر گاہ کے ہیں۔ یہ لفظ ترکوں کے ساتھ پاک و ہند میں داخل ہوا۔ شاہجہان نے اردو کو اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ''اردوئے معلیٰ'' کا نام دے دیا۔''(۲)

اُردو نے پاک و ہند میں کس خاص خطے میں اور کب جنم لیا اس سلسلے میں مختلف آراء ملتی ہیں۔ میر امن نے اردو کو دہلی کی پیدائش، اور یہی رائے کم وبیش انشاءاللہ خان، سرسید احمد خان اور محمد حسین آزاد کی ہے۔

محققین میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور نصیرالدین ہاشمی نے اردو زبان کے حوالے سے اپنے اپنے نظریات پیش کیے۔ شیرانی کے خیال میں اردو پنجاب، ڈاکٹر مسعود حسین خان کے مطابق اردو راجستھان اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق بہار میں پیدا ہوئی۔ نصیرالدین ہاشمی کے بقول اردو کی اولین پیدائش دکن میں ہوئی۔ پاک و ہند کے محققین و مورخین نے اردو کا اپنے اپنے علاقے کی زبان سے تعلق ثابت کرنے میں ایک طرح کا فخر محسوس کیا اور اسے اردو کا پہلا گہوارہ قرار دیا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''کہ یہ امر خاص مسرت کا باعث ہے کہ تقریباً ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اردو زبان نے وہیں جنم لیا۔ اس سے اردو کی مقبولیت اور وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔''(۳)

زبان کیا ہے؟ یہ منشائے دل کے اظہار کرنے کا آلہ ہے۔ کوئی ملک یا خطۂ زمین ہو ہر جگہ زبان مختلف ہوسکتی ہے مگر ذریعۂ اظہار جذبات واحساسات ہی ہوں گے۔ زبان کے مختلف لہجے اور انداز ہر چند میل پر بدل جاتے ہیں:

> ''تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ بارہ بارہ کوس کے فاصلے پر زبان بدل جاتی ہے۔''(۴)

عام طور پر لوگ اُردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کیونکہ فارسی کے بہت سے الفاظ بکثرت اس میں پائے جاتے ہیں۔ یہ خیال غلط ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں سے دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی ہے:

> ''یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے زبان اردو کی اصل اور ماں سمجھی جاسکتی ہے گو کہ ''اردو'' کا نام اس زبان کو ایک عرصۂ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اردو کی صرف ونحو، محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی۔''(۵)

دہلی اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا۔ مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کی سلطنت ہونے کے باعث اس کی بنیاد یہاں پڑی۔ زبان کی پیدائش دراصل انسان کی سماجی ومعاشرتی ضرورتوں کی ایجاد ہے۔ سماجی زندگی ہی کے سہارے پر زبان اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہے اسی کے زیر اثر اس کی صورت ومعنی میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اردو زبان بھی اس قانونِ فطرت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اردو زبان بہت سی زبانوں کا مجموعہ ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں خود اس کا اپنا کچھ نہیں بلکہ اس کا سارا سرمایہ دوسری

زبانوں سے آیا ہے یا بول کہہ لیجیے کہ اردو کی بنیاد ہی مختلف زبانوں کے اشتراک پر رکھی گئی ہے۔ گویا اردو بین الاقوامی زبانوں کی ایک انجمن ہے جس میں شرکت کے دروازے عام وخاص، ہر زبان کے الفاظ پر یکساں کھلے ہوئے ہیں۔''(۶)

اردو کی پیدائش کے بارے میں حافظ محمود شیرانی اپنی کتاب (پنجاب میں اردو) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اردو زبان کی پیدائش کے بارے میں مختلف مصنفین ومحققین نے اپنی اپنی مختلف رائے پیش کی ہے:

''بعض مصنفین نے دکن کو اردو کی جنم بھوم قرار دیا اور اردو شاعری کا آغاز دکن ہی تسلیم کیا ہے اور میر کے اس قول کو سند قرار دیا ہے (معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا) غرض کہ مصنفین میں اردو کی جائے پیدائش کے متعلق اختلاف ہے لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ اردو کی بنیاد ہندوستانی زبانوں میں عربی، فارسی الفاظ کے ملنے سے ہوئی ہے۔''(۷)

اردو زبان اپنی ساخت، اہمیت اور مزاج کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتی ہے:

''اردو کی اپنی ساخت اور اپنا مزاج ہے۔ لہٰذا وہ ایک جداگانہ حیثیت کی حاصل زبان ہے اس کی اپنی ایک علیحدہ مستقل حیثیت ہے اور وہ اپنی ظاہری ومعنوی حیثیت اور خصوصیات کے اعتبار سے دنیا کی اہم زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو ایک بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے۔''(۸)

اردو کی جائے پیدائش کے سلسلے میں مختلف علمائے زبان نے کام کیا ہے اور اسے دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱) ایک وہ جنھوں نے زبان کے ارتقاء پر مورخانہ نظر ڈالی اور سرسری جائزہ لے کر اس کی جائے پیدائش اور عہدِ پیدائش کا تعین کیا۔

۲) دوسرے وہ جن کو زبان کے مطالعے کے جدید اصول معلوم ہیں اور جو کچھ انہوں نے لکھا دلیل و برہان اور غور وفکر سے لکھا۔

پہلے گروہ میں سرفہرست، میر امن اور انشاء اللہ خان کے نام ہیں۔ میر امن نے باغ و بہار کے دیباچے میں لکھا کہ اردو کی ابتدا عہدِ اکبری سے ہوئی۔ ان کا بیان ہے کہ:

''جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تو چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوموں کے لوگ

قدر دانی اور فیض رسانی، اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آ کر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال و جواب کر کے، ایک زبان اردو بھی مقرر ہوئی۔''(۹)

دوسرے گروہ میں شامل محققین نے نہایت مدلل انداز میں اردو زبان سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے جو اردو زبان کے حوالے سے نہایت معروف نظریات قرار پائے۔ ان افراد میں ڈاکٹر محی الدین قادری، پروفیسر حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، احتشام حسین، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر سہیل بخاری، پروفیسر چٹرجی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی وغیرہ کے نام مستند ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو زبان کی ابتدا یا پیدائش اس وقت ہوئی جب مسلمانوں نے سندھ میں قدم رکھا اور عربی کا اثر سندھ کی قدیم بولی پر ہوا۔ یہ خیال ٹھیک نہیں ہے۔ سندھی پر عربی کا اثر ہوا لیکن سندھ میں اسلامی حکومت کے پہلے دَور کے مختصر دورانیے میں یہ بہت کم تھا۔ دوسرے موجودہ دَور میں اردو پر عربی کے جو اثرات نظر آتے ہیں وہ براہِ راست عربی سے نہیں بلکہ فارسی اور دوسرے وسیلے سے آئے ہیں اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی ابتدا، یا پیدائش اس وقت ہوئی جب فارسی بولنے والے مسلمان اس ملک میں داخل ہوئے۔ بعض ماہرین لسانیات کی رائے ہے کہ:

''جس زبان کو ہم آج کل اردو کہتے ہیں وہ دہلی، میرٹھ اور اس کے قرب و جوار کی بول چال کی نکھری ہوئی ترقی یافتہ شکل ہے۔''(۱۰)

اردو زبان کیوں اور کہاں پیدا ہوئی مختلف ماہرینِ لسانیات نے کچھ مخالف اور موافق آراء پیش کی ہیں البتہ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ:

''اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی اختلاط اور میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ باہمی تبادلۂ خیالات کے مواقع پیدا کرنے کے لیے یہ زبان خود بخود وجود میں آ گئی۔''(۱۱)

آغازِ اردو کے متعلق مختلف مصنفین نے بھی اپنی مختلف آراء دیں۔ ان میں سے بعض کو علمی اور بعض کو غیر علمی حیثیت حاصل ہے۔ مثال کے طور پر میر امن نے باغ و بہار کے مقدمے میں جو کچھ اردو کے بارے میں لکھا یہ اصل میں ایک روایت تو ہو سکتی ہے مگر کوئی مستند نظریہ قائم نہیں کرتا۔ اس کے بعد آزاد نے میر امن کی روایات کا سہارا لیا اور ہندوستان کی بولی کو اردو کا نام دیا۔ آزاد نے ان سوالوں کا جواب دیا کہ اردو کہاں سے اور کیونکر نکلی۔ اس سلسلے میں بعض امور آزاد نے بالکل درست پیش کیے اور بعض جگہ اُن سے

تسامحات ہوئے ہیں۔

اردو کی داغ بیل اسی دِن سے پڑنا شروع ہوگئی۔ جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر تو طن اختیار کیا۔ بقول آزاد اردو برج بھاشا سے نہیں نکلی ہے آزاد کہتے ہیں کہ:

''اردو کی وضع قطع اور ڈھنگ برج بھاشا سے بالکل مختلف ہے دونوں کے قواعد ایک دوسرے سے جدا ہیں اردو ایک حد تک پنجابی سے اور اس سے زیادہ ملتانی سے مشابہ ہے۔''(۱۳)

اردو زبان کی ابتدا و ارتقاء کا مسئلہ ہمارے ہاں ایک ایسا متنازع مسئلہ بنا ہوا ہے کہ جس پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ اردو زبان کی ابتدا اور ارتقاء کے بارے میں کئی مختلف اور متضاد نظریات ملتے ہیں یہ نظریات آپس میں اس حد تک متضاد ہیں کہ آدمی چکرا کر رہ جاتا ہے۔ یہاں یہ امر طے شدہ ہے کہ اردو زبان کا آغاز ہندو مسلم میل جول کا نتیجہ ہے۔ مشہور محقق اور ہند آریائی لسانیات کے ماہر ڈاکٹر سینتی کمار چٹر جی کے مطابق:

''اگر مسلمان ہندوستان میں نہ آتے تو جدید ہند آریائی زبانوں کے ادبی آغاز و ارتقاء میں ایک دو صدی ضرور تاخیر ہو جاتی۔''(۱۴)

اردو زبان کے بارے میں ابتدائی خیالات کے طور پر میر امن کی یہ بات تو صحیح ہے کہ زبان اسی طرح آپس کے میل جول سے ہی پیدا ہوئی مگر اس کی پیدائش کو کسی ایک بادشاہ کے دربار سے مخصوص کر دینا صحیح نہیں۔ زبان کی پیدائش ایک پیچیدہ اور طویل عمل ہے جسے کسی ایک دربار سے منسلک کر دینا درست نہیں۔ میر امن کو علمِ لسانیات سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ قصۂ چہار درویش کا ترجمہ کرتے ہوئے مقدمے میں سُنی سُنائی ایک بات لکھ دی یہ ایک قیاس آرائی تھی جس نے عجیب ترین قیاس آرائیوں کو جنم دیا۔

میر امن کی تحریر سے مستشرقین بھی گمراہ ہوئے چنانچہ ڈاکٹر ہارنلی نے اردو کو مخلوط زبان قرار دیا۔ مشہور ماہرِ لسانیات ڈاکٹر گریرسن کی ابتدائی رائے بھی یہی تھی۔ سرسید نے ''آثار الصنادید'' میں لکھا کہ:

''جب آپس میں معاملہ کرتے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا اور دو لفظ اس کی زبان کے، تین لفظ دوسرے کی زبان کے ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ خود بخود ایک نئی زبان پیدا ہوگئی۔''(۱۵)

۱۸۸۵ء میں مولانا محمد حسین آزاد کی شہرہ آفاق کتاب ''آبِ حیات'' پہلی بار چھپ کر سامنے آئی اس کے آغاز ہی میں مولانا نے اردو زبان کا برج بھاشا سے ماخوذ ہونا فرض کر لیا فرماتے ہیں:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔''(۱۶)

مولانا نے یہ دعویٰ تو کر دیا مگر اس کا لسانیاتی ثبوت مہیا کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ آپ نے بھی میر امن کی طرح اسے شاہی دربار سے جوڑنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے پردے میں میر امن بول رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''رفتہ رفتہ شاہجہان کے زمانے میں اقبال تیموری کا آفتاب عین عروج پر تھا شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکانِ دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف، اہلِ قلم، اہلِ حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو، بازارِ لشکر کو کہتے ہیں اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہی ہوگیا۔''(۱۷)

تحقیقی اعتبار سے آزاد کی رائے بھی کمزور بنیادوں پر استوار ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے نزدیک اردو وضع قطع کے اعتبار سے برج بھاشا سے بالکل مختلف ہے دونوں میں کوئی مطابقت نہیں۔ بقول ڈاکٹر محی الدین زور:

''جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ وجمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا تھا برج بھاشا کھڑی بولی اور جدید مشرقی پنجابی، یہ سب زبانیں بعد کو عالمِ وجود میں آئیں۔''(۱۸)

سید سلیمان ندوی کا مقالہ ''اردو کیونکر پیدا ہوئی'' ان کی کتاب ''نقوشِ سلیمانی'' میں شامل ہے۔ لکھتے ہیں:

''سندھ اور گجرات کا علاقہ اسلامی عہد سے پہلے بھی ہمیشہ ایرانیوں اور عربوں کے جہازوں کی گزرگاہ رہا چنانچہ ان زبانوں کے اثرات بھی خاموشی کے ساتھ پھیلتے رہتے تھے خصوصاً سندھ وہ صوبہ تھا جو اکثر ایران کی سلطنت کا جز بنتا اور خلیج فارس کے تمدن سے متاثر ہوتا رہا۔ فتح سندھ کے بعد ہندو اور مسلمانوں کا میل جول بھی سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھ میں ہوا اس لیے اردو وہیں پیدا ہوئی۔''(۱۹)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں اس لیے قرین قیاس ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ''ہیولہ'' اسی مادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''(۲۰)

''ادبیاتِ سرحد'' میں فارغ بخاری اردو کی پیدائش کے سلسلے میں بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اردو سرحد میں پیدا ہوئی اور ہندکو اس کی ابتدائی شکل ہے۔ اور ہندکو اردو کی نسبت پنجاب سے زیادہ قریب ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہندکو پنجابی اور اردو کا تعلق ہند آریائی سے ہے لیکن پشتو اور ہندکو میں ایسی قربت نہیں ہے۔ پشتو ہندکو کا ماخذ نہیں ہوسکتی علاوہ ازیں اگر اردو سرحد میں پیدا ہوتی تو آج یہاں کی مادری زبان ہوتی۔ اردو لنگوافرینکا اور ادبی زبان کی حیثیت سے برصغیر کے ہر علاقے میں پہنچی۔ اسی حیثیت سے وہ سرحد میں بھی آئی۔''(۲۱)

دکن میں اردو کی ابتدا کا نظریہ عام طور پر نصیرالدین ہاشمی سے منسوب مانا جاتا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے تسلیم کیا کہ دکن میں اردو کی ابتدا علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق کے زمانے میں ہوئی۔ شمالی فاتحین اسے ساتھ لے کر دکن گئے تب یہ زبان پختہ تھی۔

نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی ہے وہ ایک حد تک غلط نہیں کیونکہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے انہی مقامات پر ہوئی۔''(۲۲)

جدید تحقیقات کی روشنی میں نصیرالدین ہاشمی کا یہ نظریہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار عربی ایک سامی النسل زبان ہے جب کہ اردو کا تعلق آریائی خاندان سے ہے اس لیے دکن میں شمالی ہند سے خلجی اور تغلق عساکر کے ساتھ آئی اور یہاں کے مسلمان سلاطین کی سرپرستی میں اس میں شعر و ادب بھی تخلیق ہوا۔ بہرکیف اس کا تعلق اردو کے ارتقاء سے ہے۔ ابتدا سے نہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین نے پی۔ ایچ۔ ڈی لسانیات میں کی، ان کے تحقیقی مقالے کے ابتدائی ابواب ۱۹۴۸ء میں ''مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کے نزدیک اردو کا اصل سرچشمہ نواحِ دہلی کی بولیاں ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

''دہلی شہر ہریانی، کھڑی اور میواتی کے سنگم پر واقع ہے چنانچہ دہلی میں عرصے تک

زبان کا معیار اور ڈول متعین نہ ہوسکا۔ ابتدا میں اردو پر ہریان اور میواتی کے لسانی اثرات رہے جن کی تائید پنجابی سے بھی ہوتی رہی۔ بعد کو سکندر لودھی کے زمانے سے لے کر شاہ جہاں کے عہد تک آگرہ دارالسلطنت رہا۔ اس طرح برج بھاشا کی تائید سے کھڑی بولی کا محاورہ غالب آتا گیا یہی وجہ ہے کہ آج کی معیاری اردو مغربی یوپی کی بولیوں سے قریب تر ہے۔''(۲۳)

آپ کے موقف کی مزید وضاحت مقدمہ سے ہوتی ہے:

''اردو کی ابتدا پر کام کرنے والوں کی توجہ نواحِ دہلی کی بولیاں پر مرکوز ہونی چاہیے ساتھ ساتھ ہمسایہ بولیوں پنجابی، برج بھاشا اور راجستھانی پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔''(۲۴)

ڈاکٹر مسعود حسین کے بیانات سے میرامن کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کا یہ طنزیہ جملہ ذہن میں آتا ہے:

''چڑیا لائی چانول کا دانہ چڑا لایا مونگ کا دانہ، دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔''(۲۵)

ڈاکٹر مسعود حسین نے کم از کم چار بولیوں ہریانی، کھڑی، میواتی اور برج سے اردو کی کھچڑی پکائی ہے۔

ڈاکٹر محی الدین زور کہتے ہیں کہ:

''دکنی اردو نے جس وقت پنجاب میں نشوونما پائی اس وقت ہریانی اور کھڑی تو کُجا خود برج بھاشا ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالمِ وجود میں نہیں آئی تھی۔''(۲۶)

ڈاکٹر محی الدین زور اردو کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''ہندوی (اردو) بین صوبہ جاتی بن چکی تھی۔ یہ کوئی مقامی زبان نہ رہی تھی خسرو نے اسے الگ رکھا ہے اور صرف مقامی زبانوں کے نام لکھے ہیں۔ اگر دہلوی کو اردو سمجھا جائے تو خسرو پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے برج بھاشا جیسی اہم زبان کا ذکر ہی نہیں کیا۔''(۲۷)

ماضی میں ہارنل نے اردو زبان کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا تھا اور ۱۸۸۰ء میں برصغیر کی زبانوں کے موازنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آریہ دو مختلف گروہوں اور مختلف زمانوں میں اس ملک میں داخل ہوئے۔ پہلے گروہ نے دوسرے کو شرق کی طرف دھکیل دیا۔ گریرسن نے اس نظریے کو تھوڑی ترمیم سے قبول کیا۔ ہارنل فرماتے ہیں:

''ان گروہوں میں سے ایک گروہ اندرونی کہلاتا ہے اور دوسرا بیرونی۔ یعنی مغربی ہندی، مشرقی، پنجابی گجراتی، راجستھانی، بھیلی، خاندیشی اور اندرونی زبانیں ہیں۔ ان دونوں زبانوں کے بیچ میں پوربی ہندی رواج پذیر تھی۔ پہاڑی علاقوں کی بولیاں نیپالی وغیرہ ان سے مختلف ہیں۔'' (۲۸)

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف ''اردو زبان کا ارتقاء'' میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اردو قدیم ویدوں کے ہندوستان میں بولی جانے والی بولیوں میں سے کسی ایک کی ترقی یافتہ صورت ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

''میرے مقالے کے مطالعے کے بعد اس میں غالباً شبہ نہ رہے کہ اردو شورسینی، پراکرت، شورسینی اب بھرنش (لغوی مطلب: نقص، خراب، بگڑی ہوئی) اور اس سلسلہ کی موجودہ بولیوں یعنی برج، ہریانی، فندیلی وغیرہ سے ماخوذ نہیں۔ اردو، ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ رولتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ اُن سے لیتے، اس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔'' (۲۹)

مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر انہوں نے عام نظریہ کے برعکس قدیم ہندی کو اردو کی اصل نہ تسلیم کرتے ہوئے کہا:

''قدیم ہندی کو اردو کی اصل نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔'' (۳۰)

زبان کے بارے میں جدید ترین نظریات میں سے ڈاکٹر سہیل بخاری کا نظریہ خصوصی تذکرہ چاہتا ہے۔ زبان کے موضوع پر اپنے متعدد مقالات میں جو خیالات پیش کیے اُن کی رُو سے اردو کا ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے پنجاب، سندھ یا دکن اس کی جنم بھومی نہیں ہو سکتے۔ شوکت سبزواری اردو کو ویدک عہد تک لے گئے تھے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اسے بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ اسے ویدوں سے بھی قبل کی زبان مانتے ہیں۔ اپنے مقالے ''اردو زبان کا آغاز'' مطبوعہ ''نقوش'' سالنامہ ۱۹۶۲ء میں لکھتے ہیں:

''رِگ وید ہندوستان کی وہ قدیم ترین اور آریوں کی وہ پہلی کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے چنانچہ اس میں اردو الفاظ کی موجودگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ ہماری زبان ویدک کال سے بھی پہلے سے اس علاقے میں بھاشا کے طور پر کام آ رہی ہے۔'' (۳۱)

اسی استدلال کی بنا پر ڈاکٹر موصوف نے مروج نظریات کو مسترد کرتے ہوئے زبان کا آغاز مشرقی مہاراشٹر میں بتایا۔ لکھتے ہیں:

''اردو کی جنم بھومی مشرق میں اڑیسہ اور جنوب میں تلنگانہ سے محدود ہے۔ میرے نزدیک اصل میں اردو کا گھر یہی ہے۔'' (۳۲)

عین الحق فرید کوٹی نے وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کو بنیاد بنا کر اردو کو ہڑپا اور موہنجوداڑو کی مقامی بھاشا (یعنی موجودہ دراوڑی) کا تسلسل قرار دیا ہے۔ یہ نظریہ جدید ترین ہی نہیں غالباً سب سے زیادہ متنازعہ بھی ہے فرماتے ہیں:

''ابھی تک شمالی ہند کے لسانیاتی مطالعہ کے لیے دراوڑی زبانوں کو قابلِ التفات تصور نہیں کیا گیا گویا ان زبانوں پر اس زمرہ کے اثرات اتنے گہرے اور وسیع ہیں کہ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس سلسلہ میں دراوڑی زبانوں کی نسبت سنسکرت کو محض ایک ثانوی حیثیت حاصل ہے۔'' (۳۳)

اپنے نظریات کے انوکھے پن کا احساس خود عین الحق فرید کوٹی کو بھی ہے۔ شاید اس لیے ایک موقع پر اپنی لسانی جستجو کا بڑے جذباتی انداز میں تذکرہ کیا:

''نہیں معلوم کہ جن ان دیکھے راستوں پر چل رہا ہوں وہ کبھی کسی منزل پر پہنچاتے ہیں یا نہیں، میری مثال اس یکہ و تنہا راہرو کی سی ہے کہ جس کے آبلہ زدہ پاؤں کانٹوں سے چھلنی ہو چکے ہوں اور آگے رستہ بھی نہ سجھائی دیتا ہو۔'' (۳۴)

مختصر ترین الفاظ میں عین الحق فرید کوٹی کا نظریہ اس بات کا عکاس ہے کہ اردو زبان کے ماخذ کی تلاش میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ لسانی سفر کا حال اُن کے اپنے الفاظ میں:

''آج سے کوئی چودہ پندرہ سال قبل اردو زبان کے سرچشموں کی تلاش میں نکلا لیکن بجائے میکس اور جارج گریرسن کے بتائے راستے پر گامزن ہونے کے، جو کہ پراکرتوں کی وادی سے گزرتا ہوا سنسکرت کے چشمے پر جا کر ختم ہو جاتا ہے موہنجوداڑو اور ہڑپا کی وادیوں میں جا نکلا۔'' (۳۵)

اُردو کی جنم بھومی کے سلسلے میں غالباً سب سے مشہور نظریہ حافظ محمود شیرانی نے اپنی معروف تالیف ''پنجاب میں اُردو'' ۱۹۲۸ء میں پیش کیا۔ گو اس سے پانچ برس قبل نصیر الدین ہاشمی کی ''دکن میں اردو'' شائع ہو چکی تھی مگر جہاں تک نئے مباحث چھیڑنے اور لسانی نزاعات کا تعلق ہے تو محمود شیرانی کی یہ کتاب لسانی تحقیقات کے ٹھہرے پانی میں ایک بھاری پتھر ثابت ہوئی اور لسانیات کے محلاتی ایوانوں میں ایک ایسی آواز تھی کہ جس کی بازگشت آج تک سنی جا سکتی ہے۔

اُردو ادب کا مطالعہ کرنے پر واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے ترقی کے مدارج طے کیے اور دکن سے ہوتے ہوئے شمالی ہند میں پہنچی اور دہلی اردو ادب کا مرکز بنی جس کے زوال پر لکھنؤ میں ادب کا چراغ فروزاں ہوا اور سب سے آخر میں لاہور نے ادب کی آبیاری کی صحافت، ادبی جرائد اور ''انجمن پنجاب'' جیسے اداروں کے باعث اُردو زبان کا پودا تناور درخت بنتا گیا۔ شیرانی کا ''پنجاب میں اُردو'' کا نظریہ شیرانی کے اپنے الفاظ میں کچھ یوں ہے:

''یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ امیر خسرو کی زبان کو دہلوی کہتے ہیں۔ ابوالفضل بھی آئینِ اکبری میں اس کو ''دہلوی'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اب شیخ باجن (متوفی: ۹۱۲ھ) بھی اس کو دہلوی کہتے اور جو نمونہ اس زبان کا دیتے ہیں وہ قطعاً اردو ہے۔ اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔ اس نظریہ کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں ہے لیکن سیاسی واقعات اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدہ کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔'' (۳۶)

دراصل پنجاب میں اردو کی بحث کا آغاز شیرانی سے نہیں ہوتا کیونکہ انیسویں صدی کے اواخر سے ہی اردو زبان و ادب کے سلسلے میں پنجاب کی اہمیت اور خدمات کو جتلانے اور جھٹلانے کا قضیہ شروع ہو چکا تھا۔ اگر لسانی نقطۂ نظر سے پنجاب کا جائزہ نہ بھی لیں تو ادبی لحاظ سے پنجاب کی خدمات سے انکار ممکن نہیں ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو کی ترویج و ادب کی اشاعت کا سب سے اہم مرکز پنجاب کا دِل لاہور قرار پایا تھا۔ محمود شیرانی پنجاب کو اردو کا مولد قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اردو اور پنجابی کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر تیار ہوا ہے ان کی تذکیر و تانیث اور جمع و افعال کی تعریف کا اتحاد اسی ایک نتیجہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے۔'' (۳۷)

شیرانی کے لسانی نظریات کی تائید کرنے والوں میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ اپنی تصنیف ''کیفیہ'' کے پہلے باب بعنوان ''اردو کا تاریخی مطالعہ'' انہوں نے یقیناً 'پنجاب میں اُردو سے متاثر ہو کر لکھا ہے عہدِ غزنوی کے بعض واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قیاس یہ چاہتا ہے کہ اول اول ایک چوں چوں کے مربے کی سی ادھ کھچڑی بولی پنجاب میں شروع ہوئی ہوگی۔ پھر پنجاب سے شمال مغربی ہند میں پھیلی۔'' (۳۸)

ڈاکٹر گریہم بیلی نے اپنی کتاب ''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر'' کے آخر میں کتابیات میں جو لکھا ہے اس پر ''پنجاب میں اردو'' کی گہری چھاپ ہے۔

''Punjab main Urdu by Muhammad Shirani. 327 pp1928 much intersting material clams a high place for the Punjab in the development of Urdu from early times to the present day.'' (۳۹)

اردو کے لسانی ماہروں اور اساتذہ کے یہاں اردو کی پیدائش کے بارے میں بحثوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ملتا ہے۔ میر امن، انشاء اللہ خان، سرسید احمد خان، محمد حسین آزاد، عبدالغفور نساخ، ڈاکٹر جان گل کرسٹ، ڈاکٹر گریرسن وغیرہ نے اپنے اپنے طور پر اردو کے بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا۔

اردو زبان کے بارے میں معروف نظریات میں سے سب سے زیادہ مضبوط اور مستند نظریہ حافظ محمود شیرانی کا مانا جاتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' میں نہایت مستند دلائل و شواہد سے یہ ثابت کیا کہ پنجاب اردو زبان کا وطن ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنے مقالے میں قدرے اختلاف کے ساتھ شیرانی کے نظریے کی تائید کی۔ ڈاکٹر مسعود حسین نے ہریانی کو اردو کا ماخذ بتایا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے پالی زبان کو اردو کا سرچشمہ قرار دیا۔ نصیر الدین ہاشمی کے بقول دکن اردو کی جائے پیدائش ہے۔ سید سلیمان ندوی نے وادیٔ سندھ کو اردو کا مولد قرار دیا۔ سینتی کمار اور احتشام حسین کے مطابق یہ دہلی کے گرد و پیش کی کھڑی زبان ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث کے یہاں مربوط نقطۂ نظر کا فقدان نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کا نقطۂ نظر قدرے قابلِ توجہ ہے۔ وہ اردو کو دراوڑی زبان (جو کہ برصغیر کی قدیم ترین زبان ہے) سے نکلی ہوئی زبان سمجھتے ہیں۔ دراوڑی زبان ایسی ہے جس کا مرکز پاکستان میں ہے۔

مختصر ترین الفاظ میں یہ وہ نظریات ہیں جن سے ہم اردو کے آغاز، تشکیل میں مددِ محرکات اور صورت پذیری کے باعث بننے والے اہم عناصر سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ان تمام نظریات کو کلیتاً نہ تو رَد کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی خاص وجہ سے ایک دوسرے پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ سب میں کسی نہ کسی حد تک صداقت پائی جاتی ہے اور مختلف النوع ہونے کی بِنا پر یہ نظریات لسانیات کے سرمایے میں ایک اضافہ ہی ہیں۔ اپنے تمام تر تضادات کی وجہ سے انفرادی حیثیت کے حامل ہیں اور مل جل کر ''اردو زبان'' کی ایک

تصویر بن جاتی ہے۔ یہ تصویر مکمل نہ سہی اور اس میں قطعیت کا فقدان بھی تسلیم، لیکن اس کے ''رنگین'' ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہی ''رنگینی' اردو لسانیات کی خصوصیت بھی قرار پاتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اصغر علی شیخ، ڈاکٹر، محمد اسحٰق جلالپوری، اردو زبان و ادب (حصہ دوم)، لاہور، مکتبۂ کارواں، س ن، ص ۴
۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ادبی تنقید کے نئے دریچے، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۳
۳۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔۱۵۵
۴۔ سید احمد دہلوی، مرتبہ؛ وحید قریشی، ڈاکٹر، ادب پارے، لاہور، اردو مرکز، جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۹۴
۵۔ رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، لاہور، علمی کتاب خانہ، ۱۹۸۰ء، ص ۱۷
۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو تدریس، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹
۷۔ قاضی ظہور الحسن ناظمی سیوہاروی، مرتبہ؛ عاصمہ فرحت، اردو ادب کا انسائیکلوپیڈیا، لاہور، فیروز سنز، جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۱۷
۸۔ کاشر عدیل، مدیر؛ اردو مانامہ (سہ ماہی)، جلد ۲۷+۲۶، شمارہ ۴، ۳+۱، لاہور، مجلسِ زبانِ دفتری، جولائی۔ مارچ ۲۰۰۹ء/۲۰۱۰ء، ص ۴۸
۹۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو زبان و ادب، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۵۶
۱۰۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، عذیر خصوصی؛ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (چھٹی جلد)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، س ن، ص ۵۲
۱۱۔ محمد طفیل، مدیر؛ نقوش (ادبی معرکے نمبر ۱)، شمارہ ۱۲۷، لاہور، ادارۂ فروغِ اردو، ستمبر ۱۹۸۱ء، ص ۹
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۰
۱۳۔ حبیب اللہ خان غضنفر، زبان و ادب، لاہور، بک ٹاک ٹمپل روڈ، ۲۰۰۳ء، ص ۲۶
۱۴۔ سینتی کمار چٹرجی، انڈو آرین اینڈ ہندی (انگریزی)، کلکتہ، ۱۹۴۲ء، ص ۱۰۳، ۱۰۴
۱۵۔ سید احمد خان، سر، آثار الصنادید، س ن، ص ۲۵
۱۶۔ مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر، حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۹۳ء، ص ۱۸۷
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۸۷
۱۸۔ حمید اللہ شاہ، ہاشمی، تاریخ زبان و ادب، لاہور، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۷ء، ص ۴
۱۹۔ سلیمان ندوی، سید، نقوش سلیمانی، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۷ء، ص ۲۵۹
۲۰۔ ایضاً، ص ۲۵۹
۲۱۔ حمید اللہ شاہ، ہاشمی، تاریخ زبان و ادب، لاہور، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰
۲۲۔ نصیر الدین، ہاشمی، دکن میں اُردو، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء، ص ۳۲۔۳۳
۲۳۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر، تاریخ زبان اردو، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۶ء، ص ۹۲
۲۴۔ ایضاً، ص ۹۲

۲۵۔ حمید اللہ شاہ، ہاشمی، تاریخ زبان ادب اردو، لاہور، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۷ء، ص ۲۳
۲۶۔ فضل الحق، ڈاکٹر، اردو کی ابتدا، مشمولہ: اردو لسانیات، دہلی، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۸۱ء، ص ۵۲
۲۷۔ ایضاً، ص ۵۳
۲۸۔ حبیب اللہ خان غضنفر، زبان و ادب، لاہور، بک ٹاک ٹمپل روڈ، ۲۰۰۳ء، ص ۶۲
۲۹۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو زبان کا ارتقاء، ڈھاکہ، پاک کتاب گھر، ۱۹۵۶ء، ص ۸۵۔۸۷
۳۰۔ ایضاً، ص ۸۴
۳۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۴۷
۳۲۔ ایضاً، ص ۸۴
۳۳۔ ایضاً، ص ۸۶
۳۴۔ ایضاً، ص ۸۷
۳۵۔ ایضاً، ص ۸۷
۳۶۔ ایضاً، ص ۴۷
۳۷۔ ایضاً، ص ۴۷
۳۸۔ مظہر محمود، ڈاکٹر، حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات (جلد اول)، لاہور، مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۹۳ء، س ۲۱۳
۳۹۔ ایضاً، ص ۲۱۳

◂◂ ● ▸▸

Assistant Professor- Urdu Deptt
Govt. APWA College for Women,
Lahore,Pakistan.
Ph: 0092-321-4788759
Email: uzmasethi@yahoo.com

نام کتاب	:	نئی فکریاتی جہات		
مصنف	:	ڈاکٹر اجے مالوی	سال اشاعت	: ۲۰۱۵ء
قیمت	:	تین سو روپے		
ملنے کا پتہ	:	سروج شنکر پبلیکیشنز، 1278/1 مالوی نگر، الہ آباد (یو۔پی)		

● اشرف لون

ادب لطیف کے افسانوں میں عورت

ادب لطیف انگریزی اصطلاح Light Literature کا ترجمہ ہے۔ ادب لطیف کے لکھنے والے جمالیاتی قدروں اور حسن کے پرستار تھے۔ اُن کے یہاں بغاوت ہے لیکن اس بغاوت میں بھی جمالیاتی عنصر چھپا ہوا ہے۔ بقول قاضی عبدالودود:

''ادب لطیف لکھنے والے جمالیاتی دبستان کے ادیب کہے جاسکتے ہیں۔ یہ ادب برائے ادب کے نظریہ کے حامی تھے۔ ادب برائے ادب کے نظریہ کے حامی یہ غرض نہیں رکھتے کہ تخلیق اخلاقی ہے یا غیر اخلاقی۔ ان کے نزدیک کسی تخلیق کے اعلیٰ وارفع ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اسے فن کارانہ طریقے پر پیش کیا گیا ہو۔ وہ فن کے حسن کو دیکھتے ہیں نہ کہ موضوع کو۔ ان کے موضوعات رومانی ہوتے ہیں۔ ایسے رومانی موضوعات جو حسن وعشق کی دنیا کی سیر کراتے ہیں اور حسنِ فطرت کی طرف مائل کرتے ہیں۔'' ۱

ادب لطیف کے لکھنے والوں کا طرز تحریر نفیس ولطیف ہے۔ انہوں نے ایسے موضوعات چُنے جن میں حسن ودلکشی تھی۔ وہ حسن پرست ہیں۔ تلاش حسن ان کا سب سے پہلا مقصد ہوتا ہے۔ اُن کے نزدیک حسن کا سب سے بڑا مظہر عورت ہے۔ اُن کی ہر تخلیق میں کہیں نہ کہیں عورت موجود رہتی ہے۔ مضمون یا افسانہ کسی بھی قسم کا ہو عورت کا ذکر اس میں ضرور ہوگا۔ ادب لطیف کے لکھنے والوں نے عورت کا ایک آدرش وادی نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس میں لمس ولذتیّت کا بھی دخل ہے۔ ادب لطیف والے تخیل سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اُن کے یہاں ارضیت کی کمی ہے۔ ادب لطیف کے یہاں ایسی تحریریں موجود ہیں جن میں مقصدیت ہے لیکن یہ مقصدیت اُسلوب کے حسن کے نیچے دب گئی ہے۔ اردو افسانے کا آغاز ادب لطیف کے زیر اثر ہی ہوا۔ اس لیے اس صنف پر اس رجحان کے اثرات یقینی تھے۔ چنانچہ جب ہم ابتدائی افسانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان افسانہ نگاروں کے یہاں حقیقت نگاری کے بجائے تخیل آفرینی پر زیادہ زور ہے۔ بقول وزیر آغا:

''یہ سب افسانہ نگار ایک تخیلی فضا میں سانس لے رہے تھے اور محبت کے افلاطونی نظریے کی عکاسی، حسن کے غیر ارضی تصور کی نقاب کشائی اور مظاہر پر ایک چھچلتی سی نظر دوڑانے کے عمل میں مبتلا تھے۔'' ۲

اگرچہ ادب لطیف کے افسانہ نگاروں کا عام رجحان غیر ارضی اور تخیلی ہے لیکن انہوں نے کچھ ایسے اعلیٰ پائے کے افسانے بھی لکھے جن کا اردو افسانے کی تاریخ میں ایک خاص مقام ہے۔ ادب لطیف کے لکھنے والوں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، احمد اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم:

سجاد حیدر یلدرم اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ یلدرم نے اردو میں ادب لطیف کو باقاعدہ رائج کیا۔ عبدالحلیم شرر نے ذوقِ لطیف کو عام کیا۔ یلدرم نے اس رومانیت کو ایک نئی سمت دے کر زیادہ دلکش اور دل آویز بنایا۔ یلدرم کے یہاں زیادہ زور رومانی انفرادیت اور جمالیاتی حسن پر ہے۔ یلدرم کے افسانوں میں تخیل اور جذبہ کی شدت ہے لیکن اُن کے یہاں ہیجان نہیں۔ یلدرم کے افسانوی کردار مشرقیت کو نظر انداز نہیں کرتے۔ یلدرم پہلے فنکار ہیں جن کی تخلیقات میں ہمیں عورت، جنس، حسن وعشق کا ذکر ملتا ہے۔ یلدرم نے عورت کا ذکر بڑی بے باکی سے کیا۔ ان کے نسوانی کردار شعریت ولطافت کے مظہر ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے نزدیک ''فنی حیثیت سے ناکام ہونے کے باوجود عورت اور حسن کے بارے میں جو رویہ ان کی تحریروں میں ملتا ہے وہ اپنے وقت سے بہت آگے ہے۔'' ۳ مطلب یہ کہ یلدرم نے عورت کی نفسیات اور جنسی مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اپنی بعض تحریروں میں پیش کیا۔ یلدرم نے عورت کے جمالیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور جنس، عورت، حسن وعشق کو جدید تخیل اور رومانی پیرائے میں پیش کیا۔

''خارستان وگلستان''، ''ویران صنم خانے''، ''صحبت ناجنس اور نکاح ثانی'' یلدرم کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ ''خارستان وگلستان'' کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ گلستان، خارستان، شیرازہ۔ گلستان میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان ہوئی ہے جس کی ماں مردوں سے نفرت کرتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی نسرین نوش کو مردوں سے محفوظ رکھنے کے لیے دور ایک جنت نظیر جزیرے میں چھپا دیتی ہے۔ نسرین نوش مرد کی جنس سے بے گانہ ہوتی ہے۔ لیکن ایک دن اچانک اسے ایک کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اسے ایک ایسی قوت کی ضرورت ہے جو اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لے۔ یہ انجانی خواہش دراصل جنس مخالف کی مظہر ہے جس کے بغیر ایک عورت کو اپنا وجود نامکمل لگتا ہے۔ نسرین نوش ایک ایسی عورت ہے جو اگرچہ مجبور ومحکوم نہیں

لیکن نازک اور کمزور ضرور ہے۔ہنس پر تو اس کا زور چلتا ہے لیکن یلدرم کے نزدیک اسے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے:

''اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک ذات ،ایک وجود آئے ، جو اس پر قادر ہو جو اس پر حاوی ہو۔ جو اُسے دکھ دے،اس کے دل میں درد پیدا کرے، احساس پیدا کرے،اُسے مسل ڈالے۔''

یعنی کہ عورت کی زندگی میں بالآخر ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اُس کو ایسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے جو اس کو اپنے قابو میں رکھے، جو اس کا خیال رکھے اور اس سے محبت کرے۔اس طرح ایک عورت مرد کی کمی کو محسوس کرتی ہے اور مرد کے بغیر وہ اپنی زندگی کو نامکمل مانتی ہے اور یہاں جنس کا اتنا دخل نہیں جتنا دخل انسانی فطرت کا ہے کہ ایک انسان کو زندگی میں کسی ایسے انسان کی تلاش رہتی ہے جو اس کے دکھ درد کو سمجھ سکے اور جس سے وہ اپنی خوشیاں بانٹ سکے۔''خارستان'' میں ایک لڑکے خارا کا ذکر ہے۔خارا نے زندگی بھر عورت کی شکل نہیں دیکھی ہوتی ہے۔ایک دن وہ ایک بزرگ سے عورت کی تعریف سن کر عورت کا مجسمہ تیار کرتا ہے۔اس کے بعد ایک دن وہ عورت سے مشابہ رکھنے والی شکل دیکھتا ہے۔اس سے پہلے کہ خارا اسے چھو کر دیکھے وہ غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں پر پہلی کہانی کے برعکس دکھایا گیا ہے کہ جس طرح عورت مرد کے بغیر ادھوری ہے اُسی طرح مرد بھی عورت کے بغیر ادھورا ہے۔اس طرح مرد کی زندگی میں عورت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔'شیرازہ'' میں خارا اور نسرین نوش کی ملاقات دکھائی گئی ہے۔نسرین نوش کی ماں نے کچھ ایسا انتظام کیا ہوتا ہے کہ اگر کوئی نسرین نوش کو بوسہ دے تو جس جگہ وہ بوسہ دیا جائے گا وہاں پھول کھل جائے تا کہ اس کی ماں کو معلوم ہو جائے کہ کسی مرد نے اس کو چھوا ہے۔خارا نسرین نوش کو بوسہ دیتا ہے تو بوسے کی جگہ پھول کھلتا ہے۔نسرین نوش کے رونے پر خارا اسے اور بوسے دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک گلدستہ بن جاتی ہے اور اس کی ماں بھی اسے نہیں پہچان پاتی۔نسرین نوش کی بے ہوشی خارا کے گھر پہنچ کر رات بھر کے منتروں اور دعاؤں سے ختم ہو جاتی ہے اور اس کے جسم پر کھلے ہوئے پھول ایک ایک کر کے زمین پر گر پڑتے ہیں۔جب جزیرے کا ضعیف شخص نسرین نوش کو دیکھتا ہے تو خوشی کے عالم میں بے اختیار کہتا ہے:

''عورت میں حسن نہ ہوتا تو مرد میں جرأت اور عالی حوصلگی نہ ہوتی، مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی تو عورت کی خوبصورتی و دلبری رائگاں جاتی۔''

اس طرح افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کے بغیر یہ دنیا ادھوری ہے اور دنیا کی تمام خوبصورت اور قیمتی چیزوں کی اہمیت صرف عورت کی وجہ سے ہے۔دوسرے یہ کہ عورت مرد کی عالی

حوصلگی کی محرک بھی ہے اور مردوں کو بڑے بڑے کاموں پر اکسانے میں عورتوں کا ایک اہم رول رہا ہے۔اس افسانے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کے وجود سے ہی اس دنیا میں اتنے رنگ ہیں اور اتنی رونق ہے۔اگر عورت نہ ہوتی تو شائد دنیا اتنی رنگینی نہ ہوتی۔

''صحبتِ ناجنس'' دو لڑکیوں کے خطوط سے ترتیب دیا گیا افسانہ ہے۔یہ لڑکیاں اپنی شادیوں سے خوش نہیں۔دونوں کو اپنے شوہروں کے طور طریقے پسند نہیں۔عذرا کا شوہر غیر مہذب اور جاہل ہے اور اسے گندے گانے پسند ہیں۔عذرا کی موسیقی میں اعلیٰ تعلیم ہونے کے باوجود اُسے داد دینے والا کوئی نہیں۔اس کا شوہر ناقدر و ناشناس ہے۔سلمٰی اپنے انجینئر شوہر سے نالاں ہے۔سلمٰی کا شوہر ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتا ہے اور اگر کچھ فرصت ملی بھی تو اسے تاش کھیلنے میں گزار دیتا ہے۔یہ افسانہ دراصل ایسی شادیوں کے خلاف ایک احتجاج ہے جن میں لڑکیوں کی مرضی کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا اور انہیں ایسے مردوں سے باندھ دیا جاتا ہے جن کا تعلیمی، تہذیبی اور سماجی پس منظر ان سے بہت مختلف ہوتا ہے اور اس غیر مناسب نکاح کا انجام زیادہ تر برا ہی ہوا ہے۔''نکاح ثانی'' میں ایک ایسی عورت کی کہانی پیش کی گئی ہے جو اپنے عزم و حوصلے اور جرأت سے اپنے شوہر کو تباہی کے غار میں گرنے سے بچا لیتی ہے۔وہ اپنی محبت کی کشش سے اپنے شوہر کو بچا لیتی ہے۔وہ بیسوا سے اپنے شوہر کا مطالبہ کرتی ہے لیکن بیسوا اس کا مذاق اڑاتی ہے۔شوہر اپنی بیوی کے خلوص اور محبت سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنی بیوی سے معافی مانگتا ہے۔

نیاز فتحپوری:

ادب لطیف کے لکھنے والوں میں نیاز فتحپوری کا ایک ممتاز مقام ہے۔انہوں نے افسانے لکھنے کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کی اور تنقید بھی لکھی۔ نیاز ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔وہ ادب کو پروپیگنڈہ بنانے کے خلاف ہیں۔ نیاز نے یلدرم نے زیر اثر اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔'میرے ذوقِ ادب کو ابھارنے میں سجاد حیدر یلدرم کا بڑا ہاتھ ہے'۔انہوں نے اپنے افسانوں میں عورت کا آدرش وادی نقطۂ نظر پیش کیا۔عورت اور حسن و عشق ان کے خاص موضوعات ہیں۔ نیاز کے چند اقوال سے ان کے تصورات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

''جب عورت کسی مرد کے اندر جذبات عشق کی شدت محسوس کرتی ہے تو اس کا پندار خدا کا پندار ہو جاتا ہے۔''

''محبت ایک قسم کی نکہت ہے جو روح کی شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے۔عورت ایک لذت ہے مجسم،ایک سحر ہے مرئی ایک نور ہے مادی۔''

''کیوپڈ اور سائیکی'' میں عورت کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو ابھارا گیا ہے۔ ملکہ اپنے شوہر کی زندگی کی سلامتی کے لیے اپنی بیٹی کو قربان کر دیتی ہے۔ ماں اپنی بیٹی کے بچھڑنے پر مغموم ہوتی ہے۔ سائیکی بھی ماں کے جذبات اور اس کی مجبوری کو سمجھتی ہے۔ سائیکی ماں باپ کے چھوٹ جانے کی وجہ سے مغموم رہتی ہے۔ عورت کی فطرت ہے کہ کوئی اس کے حسن کی تعریف کرے لیکن سائیکی تمام باتیں بھول جاتی ہے جب کیوپڈ اسے مصائب سے بچا کر خوبصورت محل میں لے آتا ہے۔ سائیکی اپنے آپ کو کیوپڈ کی آغوش میں ڈال دیتی ہے اور اس کے تمام آلام ومصائب دور ہو جاتے ہیں۔ عورت کی اس فطرت کو نیاز فتحپوری نے اس طرح ظاہر کیا ہے:

> ''ہر چند ملک ووطن، ماں باپ کو اس طرح چھوڑنے کا رنج ایسا معمولی رنج نہیں جیسے ایک عورت اور عورت بھی ایسی حساس، ایسی لطیف الخیال اور ایسی نازک طبع جلد فراموش کر سکے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حِس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جس کا تعلق صرف اس کے شباب سے ہے۔''

عورت کے اندر حسن کی آگ بھی بہت ہوتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی اس کے حسن کا ثانی ہو۔ جب وینس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ سائیکی حد درجہ حسین ہے تو وہ حسد کی آگ میں جل کر کیوپڈ کو سائیکی کو مار ڈالنے کے لیے بھیجتی ہے لیکن کیوپڈ خود سائیکی پر عاشق ہو جاتا ہے۔ وینس ہی سائیکی کے باپ کی بے ہوشی کی وجہ ہے۔ باپ کی صحت یابی کے لیے سائیکی کو جان کی قربانی دینے کے لیے کوہ الوند پر پہنچایا جاتا ہے لیکن سائیکی بچ جاتی ہے۔ وینس سائیکی کو مار ڈالنا چاہتی ہے تاکہ اس کا حسن یکتائے زمانہ رہے لیکن اسے کامیابی نہیں مل پاتی۔ وینس کی تمام حاسدانہ چالیں ناکام ہو جاتی ہیں اور کیوپڈ اور سائیکی ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ یہ افسانہ 'رومانی محبت' کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہیں اس میں عورت کا ایک حاسدانہ روپ بھی دکھایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ نیاز کے دو طویل افسانے ''شہاب کی سرگزشت'' اور ''ایک شاعر کا انجام'' قابل ذکر ہیں۔ دونوں افسانوں میں حقیقت اور رومان کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان افسانوں کے کرداروں کو زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو انہیں زندگی کے بارے میں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ''شہاب کی سرگزشت'' کا محمود اس بات پر خوش ہے کہ اس کی شادی اس کی محبوبہ سکینہ سے ہوگی۔ لیکن جب محمود شہاب کو یہ خبر سناتا ہے تو شہاب کو مایوسی ہوتی ہے۔ دراصل شہاب کے نزدیک رشتہ ازدواج محبت کو زندگی نہیں بلکہ یہ محبت کو موت دیتا ہے۔ وہ محمود کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن شہاب اس کی باتوں کی پروا نہ کر کے سکینہ سے شادی کر لیتا ہے۔ محمود بذریعہ خط شہاب کو اپنی شادی کے بارے میں مطلع

کر دیتا ہے۔ محمود کچھ عرصہ کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ خوشی سے رہتا ہے لیکن آہستہ آہستہ ان کی ازدواجی زندگی میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں۔ محمود گھریلو زندگی سے تنگ آ کر بمبئی چلا جاتا ہے اور وہاں ایک اختر نامی اداکارہ میں دلچسپی لیتا ہے۔ لیکن اختر محمود کے بجائے شہاب میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ شہاب ایک بیوہ عورت سے شادی کر کے اخلاقی برتری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس پر اختر محمود سے شادی کرنے کا ارادہ کرتی ہے لیکن محمود اپنے سابقہ تجربے کی بنا پر شادی سے انکار کر دیتا ہے۔ ایک دن اختر محمود کے یہاں سکینہ کا خط دیکھتی ہے۔ وہ بہت متاثر ہوتی ہے اور اپنے وطن واپس چلی جاتی ہے اور ایک پردہ نشین زندگی گزارتی ہے۔ محمود اور سکینہ کا بھی ملن ہوتا ہے۔ ''کہکشاں کا ایک سانحہ'' زمین سے دور رومانی فضاؤں کی سیر کراتا ہے۔ نیاز نے ایک خیالی دنیا آباد کی ہے جس میں رومانی عناصر پنہاں ہیں۔ اس افسانے کے واقعات بھی حیرت انگیز ہیں۔ شاہزادہ قمر ریحانہ کی کشتی شعاعوں کی مدد سے کنارے لگاتا ہے۔ لالہ رُخ کی حکومت، عورتوں کے ملک اور ریحانہ کے لاثانی حسن کے ذکر سے افسانے میں ابتدا ہی میں ایک رومانی فضا ترتیب دی گئی ہے۔ بنفشہ، سوسن، سنبل اور صنوبر خادماؤں کے نام ہیں۔ ''محبت کی دیوی'' میں پاکیزہ محبت کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ رادھا محمد قاسم کے حسن اخلاق اور حسن صورت سے متاثر ہو کر محبت کرنے لگتی ہے۔ قاسم کو رادھا کے جذبات کی خبر نہیں۔ رادھا قاسم کو بھول جانے کی کوشش کرتی ہے لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی۔ وہ قاسم کے غم میں گھلتی ہے۔ وہ خدا سے اپنی غلطی کی معافی مانگتی ہے اور اپنے جذبات کا اظہار صرف معبود حقیقی سے کرتی ہے۔ اس کے الفاظ میں زور اور اثر ہے۔

> ''کیا تیری انگلیاں میرے دل سے اس محبت کو نکال کر پھینک نہیں دے سکتیں جس نے تیری پرستش کو چھین لیا ہے۔''

رادھا اپنی محبت سے مجبور ہے۔ وہ اپنے دل میں قاسم کے لیے نفرت پیدا کرنا چاہتی ہے لیکن پھر بھی وہ متنفر نہیں ہو پاتی۔ اس افسانے کا انجام دردناک ہے۔ رادھا سوز محبت میں اپنی جان دے دیتی ہے۔ رادھا کے جذبات اور قربانی سے متاثر ہوئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔

لطیف الدین احمد (ل۔احمد):

ل۔احمد کے یہاں بھی عورت ایک اہم موضوع بن کر سامنے آتی ہے۔ ل۔احمد نے اپنے افسانوں میں ایک بے باک اور نڈر عورت کو پیش کیا۔ یہ عورت محبت میں پہل کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں عورت کی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا۔ ان کے افسانوں کے نسوانی کردار کافی جذباتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی عورت ہرجائی بھی ہے لیکن کہیں کہیں عورت کے جذبۂ ایثار کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

''میں ہوں اپنی شکست کی آواز'' خطوط پر مشتمل افسانہ ہے۔اس افسانے میں عورت محبت میں پہل کرتی نظر آتی ہے۔ساتھ ہی اس میں عورت کی نفسیات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔نازلہ اپنی سہیلی نوشابہ کو خط لکھتی ہے جس میں وہ اپنی محبت کی ناکامی کا گلہ کرتی ہے۔محبت میں بے وفائی کی وجہ سے وہ موت کی خواہش کرتی ہے۔نوشابہ جوابی خط میں اپنی ناکامی محبت کا قصہ سناتی ہے۔نوشابہ کی ماں نہیں ہوتی ہے اور اس کا والد اس سے بہت زیادہ پیار کرتا ہے۔لیکن جوانی میں یہ محبت اسے ناکافی لگتی ہے اور وہ چاہنے اور چاہے جانے کے خواب دیکھتی ہے۔اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ اسے اپنی بازوؤں میں کوئی تھامے اور پیار کرے۔نوشابہ کی یہ محبت کی طلب اسے ایک بدصورت انسان سے محبت کرنے پر راضی کروالیتی ہے لیکن اس کی یہ محبت آخر تک یک طرفہ ہی رہتی ہے۔اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر عورت محبت کی طلبگار ہوتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے چاہے تاکہ وہ اس سے اپنے راز و نیاز کی باتیں کر سکے۔جوانی کے دوران اس کے اندر محبوب کی خواہش خود بخود جاگ جاتی ہے،جس کا خود بھی اسے پتہ نہیں چلتا۔یہی وہ جذبہ ہے جو نوشابہ کو خط میں یہ الفاظ لکھواتا ہے:

> ''میں تمہیں کن لفظوں میں سمجھاؤں کہ جس وقت میرا سن سولہ سال کا تھا،میں ایک صبح پلنگ سے اٹھ کر آئینے کے سامنے گئی تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنی رعنائی سے خود عشق ہوگیا ہے۔میں نے اپنے بالوں میں عنبر کی بو سونگھی،لبوں پر عقیق کو گرم گویائی دیکھا اور آنکھوں میں جوش جوانی کی موجیں مارتے ہوئے پایا۔میں اپنی نظروں میں خود ہی نسائیت محبوب ہوگئی تھی اور مجھے اپنے حسن و شباب کے نشے کا متکبرانہ احساس تھا۔میں حیران تھی کہ ایک ہی رات میں یہ انقلاب کیوں کر پیدا ہوگیا۔''

''ایک جج کی نفسیات'' میں ایک طوائف کے جذبات اور آرزوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ستیش کمار اپنی ازدواجی زندگی میں ناکام ہوجاتا ہے کیونکہ اس کی بیوی بدسلیقہ ہے۔اسے اپنی بیوی سے جس چیز کی مایوسی ہوتی ہے وہ اس کی تلاش دوسری عورتوں میں کرتا ہے۔عدالت سے نکلنے کے بعد اس کی ملاقات ایک اینگلو انڈین لڑکی سے ہوتی ہے۔یہ لڑکی تعلیم یافتہ ہے اور اسے اس کا شوہر گاؤں سے شادی کرنے لایا تھا،لیکن بعد میں اسے جسم فروشی پر مجبور کیا۔ستیش جاسوسوں کی مدد سے للّی کے شوہر کو پکڑوانا چاہتا ہے لیکن وہ یہ جان کر حیران رہ جاتا ہے کہ للّی اپنے شوہر کے ملک سے باہر جانے کے لیے جسم فروشی کر کے پیسے کا انتظام کر رہی ہے۔افسانے کا تھیم یہ ہے کہ طوائف کے اندر بھی ایک عورت کا دل ہوتا ہے جو محبت کرنا جانتا ہے۔دوسرے یہ کہ عورت اپنی مرضی یا خوشی سے طوائف نہیں بنتی بلکہ اسے ایسا کرنے پر یہ سماج اور ماحول مجبور کرتا ہے اور اس

طرح عورت کے استحصال میں اس کا اتنا رول نہیں ہوتا جتنا اس سماج کا۔''زہرہ کی کرن'' ایک خواب پر مشتمل افسانہ ہے۔اس میں کسی غیر مانوس مقام یا متحیر کرنے والی شے کا ذکر نہیں۔زہرہ کو خواب میں ایک عورت نظر آتی ہے جو اس سے اظہار محبت کرتی ہے اور غائب ہوجاتی ہے۔اس عورت کا محبت کا نظریہ رومانی ہے اور جنس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔اس عورت کے نزدیک محبت کا یہ مطلب نہیں کہ نکاح کرلیا جائے بلکہ محبت پاکیزہ جذبات کا نام ہے جو محبت کرنے کرنے والے شخص کے ساتھ زندگی بھر رہتے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری:

مجنوں گورکھپوری بحیثیت ایک نقاد کے زیادہ مشہور ہیں لیکن انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔مجنوں کے افسانوں کا بنیادی موضوع عورت ہے۔ان کے یہاں رومانیت ہے اور اس رومانیت میں قنوطیت اور مایوسی بھی ہے۔مجنوں نے حقیقی زندگی کے کردار پیش کیے لیکن ان کا ذہنی ربط روحوں کے ساتھ قائم ہے۔''سبز پری'' کا شاہد ادیب،شاعر اور نقاد ہے۔وہ سبز پری حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ایک دن شاہد اس خیال سے کہ اسے سبز پری مل گئی وہ ایک مکان کی طرف دوڑتا ہے۔عورت اسے اس مکان میں لے گئی۔شاہد کہاں گیا یہ کسی کو معلوم نہیں اور دوسرے دن شاہد کی نعش نالے میں تیرتی نظر آتی ہے۔نسیم روحانیت سے واقفیت رکھتا ہے اور اسے بہت دنوں کے بعد اصل حالت کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔دراصل سبز پری بلقیس تھی۔اسے شاہد کے باپ رشید سے محبت تھی لیکن اسے رشید نہ مل سکا۔وہ شاہد میں رشید کی شکل دیکھ کر شاہد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوتی ہے اور اس طرح بلقیس کی روح کو سکون ملتا ہے۔افسانے کا تھیم یہ ہے کہ روح بھی زندگی کی طرح بے چین رہتی ہے۔بلقیس زندگی میں محبت کی ناکامی کا بدلہ مرنے کے بعد شاہد کی موت سے لیتی ہے۔شاہد اور بلقیس کی روح کا ملن ہوتا ہے۔''سراب'' مجنوں کا ایک کامیاب افسانہ ہے۔افسانے کی فضا رومانی ہے۔افسانے پر شعر و شاعری اور ادبی فضا چھائی ہوئی ہے۔افسانے کا موضوع محبت کی ناکامی ہے۔افسانہ پڑھنے کے بعد محبت میں ناکام افراد سے ہمدردی کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔افسانے کے ہیرو یوسف کی زندگی میں نسرین،سرلا اور چمپا داخل ہوتی ہیں لیکن وہ کسی کو نہ اپنا سکا۔وہ بچپن میں نسرین سے محبت کرتا تھا لیکن نسرین کی شادی ایک مالدار بوڑھے سے کردی جاتی ہے۔سرلا ہندو تھی اس لیے اس کی رفیقۂ حیات نہ بن سکی۔چمپا شادی سے گھبراتی ہے۔چمپا کا ماننا ہے کہ اس کی شادی چمار سے ہی ہوسکتی ہے نہ کہ کسی شہزادے سے۔یوسف نے الگ الگ وقتوں میں مختلف قسم کی عورتوں کو چاہا اور اپنا شریک حیات بنانا چاہا لیکن ہر وقت سماجی رسوم اس کے راستے میں آ کھڑے ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے تجربوں سے سبق لیتے ہوئے یوسف اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے:

> ''محبت ہمیشہ ناآسودہ و ناکام رہتی ہے۔چاہے یہ ناکامی ابتدا ہی سے

رہی ہو چاہے کامیابی کے بعد اور کامیابی ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو۔اس حالت کو لوگ صبر وضبط سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کو فتح سمجھتے ہیں۔مگر یہ دراصل زمانے کی فتح اور ہماری شکست ہوتی ہے۔''

''سرنوشت''میں بھی ناکام محبت کی داستان بیان ہوئی ہے۔اس کا مرکزی کردار مظہر ہے۔مظہر اور روشن آرا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔روشن آرا کے والدین اسے گھر سے باہر جانے سے روک لیتے ہیں جس سے مظہر مغموم وملول رہتا ہے۔مظہر اپنے چچا زاد بھائی نذیر کے پاس الہ آباد تعلیم حاصل کرنے کے لیے چلا جاتا ہے جہاں اسے سلطانہ چاہنے لگتی ہے۔سلطانہ نذیر سے اپنی رشتہ منقطع کر کے مظہر سے شادی کا ارادہ جتاتی ہے۔مظہر اسے سمجھاتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شادی کر کے افسوس کرے گی،مظہر کی ماں بھی اس شادی کے خلاف ہے۔بالآخر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔مظہر اور سلطانہ کے تعلقات شادی کے کچھ ہی دن بعد بگڑ جاتے ہیں۔مظہر ڈاکٹروں سے آرام کرنے کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے گاؤں جانے کا ارادہ کر لیتا ہے لیکن سلطانہ گاؤں جانے کے لیے تیار نہیں۔ایک دن مظہر سلطانہ کو اپنے خالہ زاد بھائی رفیق کی آغوش میں دیکھتا ہے۔وہ گاؤں سے مہر کی رقم بھیج کر سلطانہ کو طلاق دیتا ہے۔افسانے کا ہیرو انا پسند ہے جسے اپنی انفرادیت کا احساس ہے۔افسانے پر رومانی فضا چھائی ہوئی ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب لطیف والوں نے اگرچہ عورت کا ادرش وادی کا نقطہ نظر پیش کیا لیکن ان کے افسانوں میں کوئی نہ کوئی اخلاقی درس چھپا ہوا ہے۔گو کہ ان افسانہ نگاروں کے یہاں لمس و لذت کا عنصر حاوی ہے لیکن اس لذتیت میں بھی ہمیں ایک ایسی عورت نظر آتی ہیں جو احساسات وجذبات رکھتی ہے اور دوسروں سے اپنے جذبات کا احترام کروانے اور اپنی اہمیت منوانے پر مصر ہے۔ادب لطیف کے افسانوں کی اہمیت ومقصدیت سے انکار کرنا ادب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

حواشی:

۱۔ڈاکٹر قاضی عبدالودود،اردو نثر میں ادب لطیف (لکھنو:نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۰ء)ص ۴۷

۲۔وزیر آغا،اردو افسانے کے تین دور،اردو افسانہ روایت اور مسائل،(مرتب) گوپی چند نارنگ (دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۸ء)ص ۱۲۵

۳۔شمس الرحمان فاروقی،افسانے کی حمایت میں (دہلی:مکتبہ جامعہ،۲۰۰۶ء)ص ۱۳۹

◀◀ ● ▶▶

Department of Urdu
Kashmir University, Hazrat Bal, Srinagar 190006
Mob: 09797061700

● صابر حسن رئیس

مخمور سعیدی کی نظموں میں پیکر، استعارہ اور علامت

مخمور سعیدی کی ہمہ جہت شخصیت اور اس شخصیت کے متعدد پہلو ہی ان کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں،مثلاً وہ مشاعروں کے مقبول شاعر تو تھے ہی لیکن اسی کے ساتھ وہ ایک کامیاب مدیر،مترجم، نقاد اور محقق بھی تھے۔فارسی پر انھیں مکمل دسترس حاصل تھی۔نیز وہ اردو اکادمی کے سیکریٹری اور متعدد ادبی تنظیموں کے رکن اور مشیر کی حیثیت سے بھی دنیائے ادب اور معاشرے میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود ان کے نام کو شہرتِ دوام بخشنے کا واحد ذریعہ ان کی شاعری ہے۔

کسی شاعر کی تخلیقات کو شہرتِ دوام عطا کرنے والے جو عناصر ہیں ان میں سب سے اہم اس کا بلاغتی نظام ہوتا ہے۔ایک عہد کے کسی ایک رجحان میں عموماً مسائل،موضوعات یہاں تک کہ زبان وبیان تک مشترک ہو سکتے ہیں،لیکن یہ شاعر کا بلاغتی نظام ہی ہے جو فکری اور فنی اشتراک کے باوجود اس کی انفرادیت کو قائم کرتا ہے۔ایک لفظ جو کسی ایک شاعر کے یہاں محض تشبیہ ہے،کسی دوسرے شاعر کے یہاں استعارہ اور کسی تیسرے شاعر کے یہاں علامت کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔شاعری میں لفظ کے مجازی معنی کی تخلیق ہی اسے معنی خیز اور تازہ کار بناتی ہے۔

مخمور سعیدی نے بھی لفظ کو اس کے لغوی اور عمومی استعمال کی جگہ اسے سیاق وسباق کے حوالے سے ایک نئے بلاغتی نظام کا حصہ بنا کر تازگی اور انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مخمور کی شاعری کی ابتدا روایت پسندی کے ساتھ ہوئی۔سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک نے زور پکڑا تو مخمور سعیدی کی غزل میں نہ سہی لیکن ان کی نظموں میں بیانیہ اسلوب کو مرکزیت حاصل ہوئی۔لیکن یہ مرکزیت تا دیر قائم نہیں رہی۔مخمور نے ماہنامہ تحریک کی ادارت کے ذریعہ جدیدیت کو نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ اس کی اہمیت اور افادیت کو اپنے کلام کے ذریعہ بھی ثابت کیا۔جدیدیت کے بانی اور ہمارے دور کے مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے الفاظ میں ,,مخمور سعیدی کی نظم میں اب وہ ارتکاز،کم گوئی میں کثیر المعنویت اور شدتِ احساس کے ساتھ ساتھ بالواسطگی نظر آنے لگی ہے جو جدید نظم کو گذشتہ نسل کی نظم سے الگ کرتی ہے،،

(مفکرانہ ٹھہراؤ اور استعاراتی کیفیت: عمر گزشتہ کا حساب، جلد دوم، صفحہ ۳۲۷)

اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مخمور سعیدی کی شاعری الفاظ کی نئی بلاغتی تنظیم کی شاعری ہے۔ شاعری کا بلاغتی نظام اس کے مجاز بننے سے لیکر استعارہ اور علامت کی منزل تک پہنچنے کا ایک ایسا ارتقائی سفر ہے جو شاعر کے فنی مرتبے اور مقام کو متعین کرتا ہے۔ مخمور سعیدی کی نظموں میں مضامین کا تنوع ان کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر فکر کا عکاس ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں گھر چھوڑ کر دہلی جیسے بڑے شہر میں تلاشِ معاش کے لئے نکل پڑنے والے ایک نوجوان سے لیکر تقریباً آدھی صدی تک حقائق کی سنگلاخ راہوں کے اس مسافر کی زندگی کے سفر کی داستان کی حامل ان کی نظمیں فکرِ معاش، عشقِ بتاں اور یادِ رفتگاں کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ان تصویروں میں جو پیکر مقدار اور معیار، ہر دو اعتبار سے نمایاں ہیں ان میں ,سفر، اور اس کے تلازموں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اگر لفظ 'سفر' کے حوالے سے ہی ان کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو تشبیہ، استعارہ اور پیکر نگاری کی ایسی ایسی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ ان کی بلاغت کی داد دئے ہی بنتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ 'سفر' کا یہ سفر پیکر نگاری تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ استعارے اور علامت کی منزل تک بھی پہنچتا ہے۔ مثال کے لیے ان کے پہلے مجموعۂ کلام 'گفتنی' کی ایک نظم 'ماضی' میں سفر کا جو حوالہ قدرے سرسری اور پیش پا افتادہ ہے وہ بعد کے مجموعوں میں مرکزی اور عمیق ہوتا چلا گیا ہے۔ نظم ,,ماضی،، کے آخری حصے میں مخمور کہتے ہیں:

اے غم نصیب راہی رحسرت زدہ مسافر رمڑ کر نہ دیکھ لینا
دستور ہے یہاں کا رپیچھے نظر نہ کرنا رایسا نہ ہو گر نہ
اقلیم عصر نو کا رحاکم تجھے سزا دے رپتھر کا بت بنا دے

اس نظم میں مسافر کے مقابل پتھر کا بت لایا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ متحرک اور جامد کا اشاریہ ہے اور نظم میں مذکور صورت حال اساطیری تلمیح ہے۔ بعد کی نظموں میں مخمور نے اسطور کی جگہ انفرادیت اور تلمیح کی جگہ استعارے کو راہ دی ہے۔ ہر چند تلمیح بھی استعارے کی ہی ایک کیفیت ہے، لیکن تلمیح ایک مستعار استعارہ ہے، جبکہ مخمور نے ,,بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا،، اور دوسرے مجموعوں میں استعارہ سازی کے اپنے انفرادی پہلو کو دریافت کر لیا ہے۔ ثبوت کے لئے ,,آواز کا جسم،، مجموعے میں شامل ان کی نظم ,,سفرِ رائیگاں،، کے یہ مصرعے دیکھے جا سکتے ہیں:

خون آلود پہیئے رواں
خون کے دائروں میں لپکتا ہوا گردشوں کا جہاں

گردشیں بے کراں رے اماں رگردشوں کا جہاں
قت کا تیز رو کارواں رک سکا ہے کہاں رخون آلود پہیئے رواں
آہنی پٹریاں راپنے محور پہ چکر لگاتی ہوئی ریل کی پٹریاں
جن پہ کچلے گئے ان گنت جسم و جاں رزندگی کے نشاں
یہ زمیں آسماں رآہنی پٹریاں رپٹریوں سے الجھتی کسی لاش پر
خونی پہیوں کی رفتار کو روک کر رکون ڈالے نظر
حادثہ ناگہاں ربند سب کھڑکیاں
بند ڈبوں سے باہر دھواں ہی دھواں
از کراں تا کراں رے حسی کا دھواں
یہ خود غرضیاں
کہہ رہی ہیں سنو! یہ سفر رائیگاں

ان مصرعوں میں جہاں ایک طرف ترقی پسند نقطۂ نظر کی جھلک ملتی ہے وہیں دوسری طرف سفر کی رائیگانی اسے جدید فکر سے بھی ہم آہنگ کرتی ہے، اور سفر کے تلازمے، خاص طور سے ریل کے بند ڈبے کا سفر اسے عصری معنویت سے ہمکنار کرتا ہے۔ لیکن موضوع سے قطع نظر، سفر کی جو کیفیتیں جمع کی گئی ہیں ان سے نظم قاری کو ایک مخصوص استعاراتی کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ مخمور کو کسی استعارے کے مختلف جہات کے بیان اور ان کے مجموعی تاثر کو سلیقے سے برتنے کا ہنر آتا تھا۔ ان کی ایک نظم ,,سفر بہت طویل ہے،، ایک چھوٹی سی نظم ہے جس میں ,سفر، اور اس کے عناصر پوری طرح استعارہ بن گئے ہیں۔ نظم کا آخری حصہ اس طرح ہے:

قدم قدم پہ تیرگی قدم قدم پہ روشنی
ہزار عکس: ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے
خلا کو پاٹتے ہوئے رخلا کا سلسلہ مگر رکا کہاں
وہ فاصلہ جو اس کے میرے درمیاں سفر میں تھا، مٹا کہاں
اکائی سے اکائی تک سفر بہت طویل ہے
اگرچہ میرے اس کے درمیاں جو فاصلہ ہے وہ قلیل ہے

ہم نے اب تک جو مثالیں دیکھیں ان میں استعارہ سازی کا عمل خاصہ دھیما اور غیر واضح ہے،

لیکن بقول فاروقی صاحب زیرِ لب خود کلامی اور دروں بینی میں تفکر کا رنگ گہرا ہوتا چلا گیا ہے۔ استعارہ سازی کے عمل کے ارتقا کی ایک مثال ان کی نظم ''راستے روشن'' (آتے جاتے لمحوں کی صدا سے) ہے جس میں استعارے کی چمک پہلے سے زیادہ واضح اور روشن ہے۔ اسی طرح ''ایک پل کا واقعہ'' (آتے جاتے لمحوں کی صدا سے) نظم میں پورا متن ہی سفر کی رائیگانی کا استعارہ ہے۔

ان کے آخری دور کے مجموعے ''دیوار و در کے درمیاں'' میں سفر، راستے اور اس کے استعاراتی نظام کا ایک نیا ہی پہلو سامنے آیا ہے۔ ایک نظم کا عنوان ہے ''چوراہے کا سپاہی'' اس نظم میں موضوع اور مضمون اپنی جگہ، لیکن چوراہے کے سپاہی کو شاعر نے جس طرح ایک روشن استعارہ بنا دیا ہے اس کو نظم کے ساختیاتی نظام میں بلاغت کی بنیاد کہا جا سکتا ہے:

چوراہے کا سپاہی
جو رستے بانٹتا ہے/کہہ رہا ہے:
ادھر تم جاؤ.....ٹھہرو، تم نہ جاؤ
میں میری ہے اور میرے خدا کی/سپاہی کو یہ حق کس نے دیا ہے؟
زمیں پر نت نئے رستے بنائے/گزرتے راہ گیروں کو بتائے
ادھر تم جاؤ.....
ٹھہرو، تم نہ جاؤ
زمیں میری ہے اور میرے خدا کی/مجھے میرے خدا نے
بتایا ہے کہ: جتنے راستے ہیں/یہ سب میری طرف ہی آ رہے ہیں
سپاہی کو یہ حق کس نے دیا ہے؟
کہ وہ ان راستوں پر/مرے احکام کی وردی پہن کر
مری سمت آنے والوں کو ستائے
اور ان کو یہ بتائے:
ادھر تم جاؤ، ٹھہرو، تم نہ جاؤ/سپاہی کو یہ حق کس نے دیا ہے

میں نے ابتدا میں یہ کہا تھا کہ پیکر نگاری مخمور سعیدی کے بلاغتی نظام کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان کی پیکر نگاری ان کی استعارہ سازی سے بھی زیادہ جاذبِ نظر اور توجہ طلب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ استعارہ کلام کو گہرائی اور گیرائی عطا کرتا ہے، لیکن پیکر حسیات کو جمالیاتی سطح پر فعال کر دیتا ہے۔ غیر مرئی اشیا کے لئے مرئی

کیفیات کو وضع کرنا ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جو کسی بھی طرح استعارہ سازی سے کم درجے کا نہیں ہے۔ مخمور نے اپنی غزلوں میں تو پیکر نگاری کے جوہر دکھائے ہی ہیں، لیکن نظموں میں بھی وہ پیکر نگاری کو عروج تک لے گئے ہیں۔ نظموں میں ان کی پیکر نگاری فن اور فکر دونوں کو ساتھ میں سمیٹتے ہوئے ایک جمالیاتی اکائی کی تشکیل کرتی ہے۔ ان کی نظموں سے پیکر نگاری کے مختلف نمونے جمع کئے جائیں تو اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ لیکن بعض پیکروں کا ذکر کیا جائے تو آواز، روشنی، وقت اور سفر سے متعلق پیکر بہت نمایاں ہیں۔ مخمور سعیدی کو پیکر نگاری کتنی مرغوب تھی اس کی مثال یہ ہے کہ ان کے ایک مجموعے کا نام ہی ''آواز کا جسم'' ہے۔ ان کی نظموں کی کلیات میں ''اونگھتے ویرانے، اداس مسہری، درد کی وادیاں، امید کے فرشتے، حوادث کی چٹانیں، خوابیدہ فضائیں، کرنوں کی سیڑھی، سرحدِ حال، باغِ انسانیت کی بلبل، اداسی کے پھریرے، نظر کی شمعیں، فکر کا آئینہ، شکستگی کا سانپ، کشمکش کا اکھاڑا، شگفتہ لمحوں کی تتلیاں'' اور متعدد ایسے پیکر ہیں جو ان کی قوتِ متخیلہ کی روشن مثال ہیں۔ ان کی نظم ''سونا آنگن'' کا ایک بند ان کی پیکر نگاری کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ کہتے ہیں:

کرسیاں حزن در آغوش، مسہری بھی اداس/سب پہ طاری مری کیفیتِ دل ہو جیسے
زندگی کی وہ حرارت نہ وہ گرمی نہ وہ کیف/گھر کی ہر چیز کوئی برف کی سِل ہو جیسے
ریڈیو مہر بہ لب ہے کہ اسی شوق کے ساتھ/دوپہر اس کی رفاقت میں گزارے کوئی
مضطرب میز کا شیشہ کہ مقابل آ کر/حسنِ دلدار کی سج دھج کو سنوارے کوئی
لمس، اس دستِ حسیں کا کئی چیزیں ڈھونڈیں/جو سلیقے سے سجا دے انھیں الماری میں
سرد چولھے کا بھی دل بجھ سا گیا ہو جیسے/منہمک وہ جو نہیں چائے کی تیاری میں
دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ گھڑی کی ٹک ٹک/دمبدم کرتی ہے روز و شبِ ہجراں کا شمار
کتنی کجلائی ہوئی صبحوں کا ڈھیر آنگن میں/کتنی جلتی ہوئی شاموں کی منڈیروں پہ قطار

یہ بات اکثر محسوس کی گئی ہے کہ مخمور سعیدی کی شاعری علامت سازی تک نہیں پہنچتی، لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ وہ علامت سے یکسر خالی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ مخصوص سیاسی یا معاشرتی حالات کے زیرِ اثر شاعر کی افتادِ طبع، فکری طریقہ کار اور تخلیقی رجحان وغیرہ عناصر مل کر علامت سازی کا سبب بنتے ہیں، لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ علامت سازی ہی شاعری کا واحد مقصد بن کر رہ جائے۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ علامت سازی ایک مستحسن عمل ہے، اور علامت کے استعمال سے کلام بلیغ سے بلیغ تر ہو جاتا ہے۔ مخمور سعیدی کے کلام میں تشبیہ اور استعارے کے علامت بننے کی سب سے روشن مثال ''سفر'' اور اسکے تلازموں کا استعمال ہے۔ جہاں تک علامت کا سوال ہے تو استعارے اور علامت کی جو مختلف تعریفیں بیان کی

گئی ہیں، اور اپنے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے جو دلائل دی گئی ہیں، یہاں ان کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں اتنا ہی کہنا چاہونگا کہ استعارہ اور علامت میں فرق یہ ہے کہ استعارہ بار بار استعمال ہونے پر پرانا پڑ جاتا ہے، کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے معنی سب کی سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ جبکہ علامت اپنے اندر نئے نئے معانی و مفاہیم کے اتنے پہلو یا اتنی جہات رکھتی ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے معانی میں اضافہ ہی ہوتا ہے، اور مزید اضافے کا امکان باقی رہتا ہے۔ اسے بآسانی سمجھنے کے لئے اقبالؔ کے شاہین کی مثال لی جاسکتی ہے۔ کلامِ اقبالؔ میں شاہین کہیں بلند پروازی، کہیں تیز رفتاری، کہیں درویشی اور کہیں حرکت اور عمل کا مظہر ہے، اور یہ تمام خوبیاں مجموعی طور سے اسے علامت بناتی ہیں۔

مخمورؔ سعیدی کے یہاں بھی ,,سفر،، کے حوالے سے مختلف نظموں میں مختلف خصوصیات اور کیفیات کا بیان ہوا ہے۔ مثال کے لئے ,ماضی، ,ہوا کو نہ روکو، ,ایک نئی پرانی یاد، اور ,تفاوت، نظموں میں ,,سفر،، تسلسل کی علامت ہے، جبکہ ,تاریک جزیرہ، ,رات کا سفر، ,مراجعت، اور ,تھکن، وغیرہ نظموں میں سفر کا انجام مستقبل سے ناامیدی پر منطبق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ,,دیوار و در کے درمیاں،، کی ایک نظم جس کا عنوان ہی ,سفر، ہے، اس میں وقت کے اپنی رفتار سے چلنے اور ناقابلِ تسخیر ہونے کا مفہوم سامنے آتا ہے۔ اس نظم میں وقت کو ,,ریل،، کی علامت سے واضح کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ریل کی کھڑکی سے نظر آنے والے مختلف مناظر کو موضوع کے پس منظر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، اور آخری بند میں وقت کے جبر کی وضاحت ان الفاظ میں ہوئی ہے:

ریل کی کھڑکیوں میں ماضی و حال/ریل کی پٹریاں مگر پیہم
شہرِ فردا کی سمت بڑھتی ہیں/ریل کی پٹریوں کے بوجھ تلے
سانس امروز کی اکھڑتی ہے

مخمورؔ سعیدی کی نظموں میں Nostalgia، یا ماضی کی سمت مراجعت بھی سفر ہی کا ایک پہلو ہے۔ مختلف قسم کی یادیں اور اُن یادوں کا ذکر بھی اسی مُراجعت کے تحت آتا ہے۔ ,,سیہ بر سفید،، کی ایک نظم ,,نوید،، بدلتے موسم کے اولیں خوش نوا مغنی، یعنی ایک ننھے منے سے پرندے کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے، اور موسموں کی تبدیلی کو نشان زد کرتے ہوئے اپنے گھر کی جانب مُراجعت کی دعوت پر ختم ہوتی ہے۔ اس نظم کے آخری چار مصرعے اس طرح ہیں:

نمو کی دنیا لئے نظر میں/پلٹ کے آجاؤ اپنے گھر میں
خزاں کا عفریت مر چکا ہے/تمہاری خانہ بدوشیوں کا اجاڑ موسم گزر چکا ہے

اسی طرح مخمورؔ سعیدی یادوں کو اپنا بہترین ہمسفر مانتے ہیں۔ یہ یادیں کبھی اُنہیں اپنے وطن کی طرف لے جاتی ہیں، تو کبھی ماضی کے اچھے دنوں کی طرف۔ کبھی انسان کی اخلاقی بلندی کو یاد کرتی ہیں تو کبھی رشتوں کی پائیداری اور لوگوں کی رواداری اُن کا موضوع بنتی ہے۔ لیکن جہاں کہیں وہ ان یادوں کا رشتہ حال کے مسائل سے وابستہ کرتے ہیں تو کچھ اور ہی صورت ابھرتی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں لکھی گئی اُن کی ایک نظم ,,یادوں کا وطن،، میں یہ تمام صورتیں یکجا ہو کر بھی ایک نئے انجام کو پہنچتی ہیں۔ اس نظم کے آخری چار مصرعے اس طرح ہیں:

حال جب رشتۂ ماضی کو سراسر جھٹلائے/ماضی و حال کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ جائے
ختم اک رات میں ورنہ تو یہ افسانا ہے/آج آیا ہوں تو کل مجھ کو چلا جانا ہے

سفر، کے حوالے سے مخمورؔ سعیدی کی نظموں میں مزید موضوعات اور کیفیات تلاش کی جاسکتی ہیں، لیکن اوپر جن معانی اور کیفیات کا ذکر آیا ہے، اُن سے بھی یہ بخوبی واضح ہے کہ مخمورؔ کی نظموں میں ,سفر، استعارے سے آگے بڑھ کر علامت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

کلامِ مخمورؔ کی دیگر فنی اور فکری خصوصیات اس قدر ہیں کہ اُن کو ذہن میں رکھے بغیر مخمورؔ سعیدی کی مجموعی تخلیقی شناخت کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ اُن کے بلاغتی طریقۂ کار کے تجزیے کے بغیر بھی اُن کے فن کی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوسکتا۔

ماٰخذ:

۱۔ عمرِ گزشتہ کا حساب، حصہ نظم (مخمور سعیدی) ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا گنج مارکیٹ، نئی دہلی
۲۔ مخمور سعیدی، ہمہ جہت فنکار مرتبہ پریم گوپال متل اور ارشد علی خاں ناشر ایضاً
۳۔ بھیڑ میں اکیلا، مرتب شین کاف نظام، ناشر راجستھان اردو اکادمی، جے پور
۴۔ فرہنگ اصطلاحات بلاغت، ڈاکٹر ارشد عبدالحمید، تحقیقی مقالہ (زیرِ طبع)
۵۔ علامت سے امیج تک، مصنف ڈاکٹر رفعت اختر خان، ناشر خود مصنف

◀◀ ● ▶▶

166، Ward No. 29 Inside Qafla Gate,
TONK (Rajasthan) 304 001
Email: sabirtonk@yahoo.co.in
Mobile: +91 9799088060

● شاذیہ مجید ملک

مولانا محمد حسین آزاد کا نثری اسلوب

Abstract:

Moulana M. Azad is a great name. He was the founder of modern nzam. He is a stylistic essay writer & researcher also. His writing style is very delicate. He wrote many Urdu & Persian books. But the major achievement is Aab-e-Hayat which is its historical literary book. It is also start of criticism. He is master of similies & metaphors. No one can copy his style yet. His language is very simple & authentic. He is very unique in his work. There is no example of him.

اسلوب اور اسلوبیات:

اسلوب کی اِصطلاح پُرانی نہیں ہے۔کسی احساس کا جنم لینا، تجربے، مشاہدے یا مطالعے کے نتیجے میں نئے اثرات کے تحت احساس کا پیدا ہونا، اور اس احساس کو اپنے لفظوں کے قالب میں ڈھالنا اُسلوب ہے۔کوئی بھی فن پوری طرح کسی کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ بیان کا پیرایہ اُسلوب ہے۔

پرانا تصوّرِ اُسلوب فن پارے میں اضافی شے (خارجی حوالے سے) جبکہ نیا تصوّرِ اسلوب محض زبان کی سجاوٹ نہیں۔ بلکہ ادبی اظہار کے وجود میں پوشیدہ امکانات ہیں۔اسلوبِ اظہار کا وہ طرزِ بیان ہے۔جو کسی فنکار کی شناخت ہے۔شناخت بنے گی تو اسلوب بنے گا۔

اسلوب دراصل فکر و معانی، اور ہیئت وصورت یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے لیکن انتقادی تصانیف میں اکثر و بیشتر کلمات مستعملہ کے معنی متعین نہیں ہوتے اور اسلوب کو محض اندازِ نگارش، طرزِ بیان کہہ کر اس کلمے کی تمام دلالتیں ظاہر نہیں کی جاسکتیں۔جن کا اظہار مطلوب ہے۔(۱)

اسلوب لسانیات کی شاخ ہے۔جس سے ادبی اظہار کی ماہیت وخصائص کا علم ہوتا ہے۔یعنی کوئی خیال، جذبہ، تصوّر احساس کس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ اسلوبیات میں لسانیات، سماجیات اور نفسیات کے نئے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ جیسے ہاتھ کی لکیریں ہوتی ہیں۔اسی طرح اسلوبیات کا دائرہ کار وسیع ہوتا ہے۔

اسلوبیات تنقید کا درجہ رکھتی بلکہ وہ اس کی مدد کرتی ہے۔اسے نئی روشنی، نیا ذہن، نئی سوچ عطا کرتی ہے۔ چونکہ اسلوب سے متعلق تمام علم اسلوبیات ہے۔

اسلوب درحقیقت معانی اور ہیئت یا مافیہ اور پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔کوئی شک نہیں کہ بعض نقاد ایسے ہیں جو اسلوب کو معانی یا مافیہ سے کم از کم نظریاتی طور پر بالکل جدا کر دیتے ہیں۔

سید عابد علی عابد نے اُسلوب کی صفات کو الگ الگ درجوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ان کی نزدیک اسلوب کی فکری صفات درج ذیل ہیں:

سادگی، قطعیت، اختلالِ حواس، اختصار

اور اسلوب کی جذباتی صفات درج ذیل ہیں:

زورِ بیان، گداز، مزاح، بذلہ سنجی

ان کے نزدیک اسلوب کی تخیلی صفاف درج ذیل ہیں:

تجسیم، شاعری اور عرفان، فریبِ چشمِ ساقی، شاعری اور جنون، تخیل، مجاز اور تشبیہ استعارہ، نثر اور استعارہ، خیال افروزی، تصویریت

ادب کے مطالعہ اور تخلیق کی تحسین میں اسلوب کو ہمیشہ سے ہی اہمیت دی جاتی ہے۔اسلوب کے لیے انگریزی اصطلاح (Style) لاطینی کے لفظ (Stilus) سے ماخوذ ہے۔جس سے مراد تیز دھار والا وہ ''قلم'' ہے۔جس سے لاکھ کی تختیوں پر تحریر کے نشانات کھودے یا بنائے جاتے تھے۔اس کام میں مہارت رکھنے والا (Stylist) کہلاتا تھا اور آج بھی اسلوب سے وابستہ تصوّرات کا تنوّع اس کے اساسی مفہوم سے بیگانہ نہیں ہے۔اسلوب کی سادہ ترین تعریف یہی کی جاسکتی ہے۔

اسلوب اندازِ نگارش ہے اور ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است کے مصداق، تخلیق کاروں کے

لسانی شعور کی مناسبت سے اس میں تنوّع اور بوقلمونی ملتی ہے۔ اسلوب ٹھوس، جامد، قطعی، غیر متحرک اور تغیر نا آشنا نہیں ہوتا۔(۲)

اسلوبیات کے بارے میں اُردو زبان کے سب سے بڑے اسلوب گر شاعر اقبال سے دریافت کیا تو جواب ملا:

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غواص کی مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے(۳)

اور ہمارے اُردو ادب کے ارکانِ خمسہ اپنے اپنے اسلوب کی بنا پر الگ الگ مراتب پر فائز ہیں اور آج کی بحث مولانا محمد حسین کے اسلوب کی ہے:

''مہدی افادی نے لکھا ہے کہ آزاد اُردوئے معلّٰی کا ہیرو ہے۔ جس طرح تاریخ میں فلسفے کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا اسی طرح اُردو کو انشاء پردازی کے اعلیٰ درجے پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں۔ سرسیّد سے معقولات الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد مذہب کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو کورے رہ جاتے ہیں۔ حالی بھی سوانح نگاری کے سہارے چلتے ہیں لیکن صرف آزاد ایسے انشاء پرداز ہیں۔ جن کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔''

محمد حسین آزاد کا شمار اُردو کے عناصرِ خمسہ میں ہوتا ہے۔ ان کا نام نہ صرف یہ کہ جدید اُردو شاعری کے سلسلے میں لیا جاتا ہے بلکہ تاریخ نویسی، ادبی تاریخ اور تذکرہ نگاری کے علاوہ کتاب شناسی بھی ان کا میدان تھی۔ زبانوں کی اصل، ان کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ خاص طور پر اُردو اور فارسی الفاظ کے ایسے سچے پارکھ تھے کہ اُردو نے ایسا جوہری شاید ہی دیکھا ہو۔(۴)

محمد حسین آزاد جدید اُردو نظم کے بانی بھی تھے اور ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز مؤرخ اور محقق بھی۔ آزاد کا اندازِ تحریر بہت دلکش ہے۔ الفاظ کا صحیح انتخاب، محاورات کی صحت، تشبیہات اور استعارات کا موزوں استعمال آزاد کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔ انشاء پردازی کا جو طرز انہوں نے شروع کیا وہ انہیں پر ختم ہو گیا۔ فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ اور اُردو از کار تشبیہات، ضائع اور بدائع ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

آزاد کے اُسلوب میں سادگی و شیرینی گھل مل گئی ہے۔ وہ محاکمات کے بادشاہ ہیں۔ جس چیز کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں ایسا جادو ہے کہ صاف دل میں اُتر جاتی ہے۔ ان کی طرزِ تحریر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ آج تک کوئی بھی کامیابی کے ساتھ اس کی نقل نہ کر سکا۔

آزاد کے مختصر حالاتِ زندگی:

شمس العلماء خطاب، محمد حسین نام اور آزاد تخلص، دلی میں مولوی محمد باقر کے ہاں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی محمد باقر اپنے وقت کے معروف صحافی، ادیب اور عالم تھے۔ شمالی ہند میں سب سے پہلا اخبار ۱۹۳۶ء میں انہوں نے نکالا۔ جس کا نام ''اُردو اخبار'' تھا۔ آزاد نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اور بعد ازاں اپنے والد کے دوست شیخ محمد ابراہیم ذوق سے پائی اور شاعری کا ذوق بھی پختہ کیا۔ دلی کالج میں مولوی نذیر احمد، پیارے لال آشوب اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ ان کے ہم جماعت تھے۔(۵)

غدر کے ہنگامے میں آزاد پر وہ مصیبتیں پڑیں کہ دنیا نظروں میں سیاہ ہو گئی۔ مولوی محمد باقر شہید ہوئے۔ گھر بار لٹ گیا۔ کچھ دنوں تک آزاد کسمپرسی کی حالت میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرے لے۔ آخر میں لاہور پہنچے اور سررشتۂ تعلیم میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ مگر قابلیت کے زور سے رفتہ رفتہ وہ شہرت حاصل کی کہ پنجاب گورنمنٹ نے ان سے قصصِ ہند اور مختلف ریڈریں لکھوائیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ ایک مرتبہ علمی خدمات کے لیے کابل اور بخارا بھی گورنمنٹ کی طرف سے بھیجے گئے۔(۶)

آزاد عرصے تک لاہور کے گورنمنٹ کالج میں فارسی اور عربی کے اُستاد بھی رہے اور تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ علمی و ادبی خدمات کے صلے میں ملکۂ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر ۱۹۷۷ء انہیں ''شمس العلماء'' کا خطاب بھی دیا۔ ۱۸۹۹ء میں خلل دماغ کے آثار پیدا ہوئے اپنی اکلوتی بیٹی کی جوانمرگی نے ایسا صدمہ پہنچایا کہ عمر کے بقیہ بیس سال اسی جنون اور دیوانگی کے عالم میں گزر گئے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو وفات پائی اور لاہور میں دفن ہوئے۔

آزاد کی تصانیف:

ابتدائی اور درسی کتابوں کے علاوہ آزاد کی تمام کتابیں اعلیٰ پیمانے کی ہیں، جو کہ درج ذیل ہیں:

آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری، قصص الہند، قندِ پارس، سخندانِ فارس، نگارستانِ فارسی، نظمِ آزاد، مکتوباتِ آزاد، جمکدۂ آزاد

آزاد کا اُسلوبِ نگارش:

مولانا محمد حسین آزاد اور نثر میں میر انیس کا مقام و مرتبہ رکھتے ہیں کیونکہ ان دونوں کی بے ساختگی شعوری کوشش کا ثمرہ ہے۔ دونوں کو اپنی اپنی زبان پر حیرت انگیز حد تک قدرت کمال حاصل ہے۔ ہر دو

حضرات ڈرامائی شعور کے حامل ہیں اور ان دونوں کے ادراک پر ہر تخیل نے قبضہ جما رکھا ہے۔ ان کی مصوّری ہر عیب سے پاک ہے۔ یہ دونوں الفاظ کی مناسبت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں تشبیہ اور استعاروں کے استعمال میں کمال مہارت حاصل ہے۔ محمد حسین آزاد نثر کے بادشاہ ہیں اور نثر میں ہی شاعری کر جاتے ہیں۔ اِسی وجہ سے ان کی نثر اُردو کا انمول تہذیبی خزانہ ہے اور خود آزاد اردوئے معلیٰ کے ہیرو اور آقائے اُردو ہیں۔

آزاد اُردو زبان و ادب کے صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں۔ ان کا اسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش سب سے الگ ممتاز اور منفرد ہے۔ آزاد کی شانِ تخیل اور قدرتِ زبان کا کمال ہی تو ہے کہ کوئی بھی ان کا ہم پلہ اور شریک نہیں ہے۔ ان کا دور پُرتکلف نثر کا دور تھا کیونکہ اس دور میں ایک طرف میر امن کی باغ و بہار کا ہر بہار اُسلوب تھا۔ تو دوسری جانب ظہوری بیدل کی نازک خیالی کا چرچا تھا۔ آزاد نے ان دونوں سے الگ اور جداگانہ راستہ ڈھونڈ نکالا۔ جو بہت مقبول ہوا۔ نیز فارسی ادب سے مخصوص لگاؤ ہونے کی وجہ سے ''عجم کا حسن طبیعت'' ان کے رگ وریشہ میں حرکت کر رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے قدیم و جدید ہر دو انداز میں مفاہمت پیدا کر کے دونوں کے حسن کو یکجا کیا۔

''مولانا محمد حسین آزاد کو اُردو ادب میں کئی حیثیتیں حاصل ہیں۔ تحقیق، تنقید، لسانیات، تاریخ ادب، تاریخ ہند..... ہر میدان میں اُنہوں نے سکہ جمایا شعر کہے تو اس انداز کے کہ جدید شاعری کے موجد کہلائے مگر وہ شے جس نے اُردو ادب میں انہیں حیاتِ جاوداں عطا کی۔ ان کا اسلوبِ نگارش ہے۔ اُسلوب کا کمال یہ ہے کہ ہم چند سطریں پڑھیں اور بے ساختہ بول اُٹھیں کہ یہ فلاں انشاء پرداز کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ آزاد کو نثر نگاری میں یہی کمال حاصل ہے۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر سطر لفظوں کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ سچے موتیوں کی لڑی ہوتی ہے۔(۷)

آزاد اپنی تحریروں میں ہمیں چلتے پھرتے سانس لیتے اور باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک آزاد خیال اور جذبات کے پتلے تھے۔ جدید طرز کے داعی ہونے کے باوجود وہ ذہنی طور پر ماضی گم رہتے تھے کیونکہ انہیں ماضی سے فطری لگاؤ اور عشق تھا۔ اکثر و بیشتر اپنی خیالی جنت میں کھوئے رہتے تھے۔ گو ان کی طبیعت میں نرمی، دھیما پن، اور ایک خاص وقار تھا۔ ان کی تحریروں میں بھی یہی اسلوب پایا جاتا ہے کیونکہ ان کا اسلوب بھی جذباتی اور خیالی تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد کی فطرت میں رندانہ جرأت نام کو نہ تھی اور ان کی اس خاصیت کو ہم ان کے اُسلوب میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یعنی ان کے اُسلوب میں جرأت اندانہ قطعاً نہ تھی آزاد کھل کر طنز و تعریض کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔ ان کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ ایسا پیرایہ تلاش کریں۔ جو

لطیف ہو۔ ان کا اُسلوب گو کہ صناعی اور کاوشِ پیہم کا تھا لیکن اِس کے باوجود وہ ان کی شخصیت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور اس کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''اُردو ادب میں جدت کی نئی رُوح پھونکنے میں آزاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سرسیّد کی تحریک نے جو ماحول پیدا کیا تھا۔ اس کے زیرِ اثر اُنہوں نے یہ محسوس کیا کہ ادب کو نئی راہوں پر چلانا ضروری ہے اور اس کے لیے مروّجہ معیاروں اور مروّجہ اقدار کو بدلنا ہوگا۔''(۸)

آزاد اُردو اور فارسی کے استاد تھے اور ہندی ان کے لاشعور میں رچی ہوئی تھی۔ اس لیے زبان اور زبان دانی ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ نثر میں شاعری لکھتے تھے اور ان کا تخیل آمیز تشبیہات و استعارات سے مملو اندازِ بیان اور ان کی مخصوص نحو انہیں دوسرے انشاء پردازوں سے ممتاز بناتی ہے۔ اُن کے ہاں تحقیق کی کمی ہے۔ وہ نقاد بھی بننا چاہتے تھے لیکن یہ وہ محقق ہیں اور نہ نقاد کیونکہ ان کے تخیل کا منہ زور گھوڑا انہیں خیالی دنیا میں سرپٹ بھگائے لیے جاتا ہے۔ آزاد ایک رنگین بیان، صاحبِ طرز پرداز تھے۔ اس لیے وہ محقق نہ بن سکے اور نہ نقاد، وہ تاریخ کی کتابوں میں تخیل کی بلند پروازی سے باز نہیں رہ سکتے۔

آبِ حیات:

آزاد کے اُردو اور فارسی کی بہت سی کتابیں لکھیں ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''آبِ حیات'' ہے۔ جو اُردو ادب کی پہلی باقاعدہ تاریخ ہے۔ اس کتاب میں اُردو ادب کی تاریخ کی صحیح راہ متعین کی گئی ہے۔ اسی سے اُردو میں فنِ تنقید کا آغاز ہوا۔ اُردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ہمیشہ مشعل راہ کا کام کرتی رہے گی۔

ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' شعرائے اُردو کے تذکروں کی تنقیدی روایت کی آخری کڑی بھی ہے اور ادبی تاریخ کے ساتھ ادبی تنقید کی شیرازہ بندی کی ابتدائی کوشش بھی محمد حسین آزاد کی تنقید تذکروں کی طرح انشاء پردازی اور شاعرانہ طرزِ بیان کی مثال بھی پیش کرتی ہے۔ مگر ساتھ ہی شاعروں کے زبان و بیان اور موضوع و مافیہ کو سامنے رکھ کر محاکمہ کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔''(۹)

آبِ حیات شعرائے اُردو کا تذکرہ بھی ہے۔ ادب کی تاریخ بھی اور سب سے بڑھ کر اُردو شاعروں کے منہ بولتے مرقعوں کی تیاری بہت پہلے شروع ہوگئی تھی۔ یہ کتاب مصنف کی برسوں کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اس کی تیاری کا سلسلہ تقریباً پندرہ سال جاری رہا۔ اس دوران آزاد مواد جمع کرتے رہے۔ مواد کی فراہمی کے تین ذریعے تھے۔ مطبوعہ اور قلمی کتابوں سے جو کچھ مل سکا۔ اُنہوں نے وہ سب جمع کیا لیکن یہ ناکافی تھا۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے آزاد نے پرانے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اُنہوں نے جو کچھ بتایا۔ اسے قلم بند کیا۔ اس کے بعد جہاں جہاں خلا نظر آیا۔ اسے پر کرنے کے لیے اہلِ علم سے خط و کتابت کے ذریعے حالات دریافت کیے۔ بعض لوگوں نے مختلف شاعروں پر مضامین لکھ کر آزاد کو بھیجے۔ ان تینوں ذریعوں سے معلومات کا جو ذخیرہ فراہم ہوا۔ آزاد نے اسے اپنے جادو نگار قلم سے اپنی زبان میں لکھا اور آبِ حیات، کے نام سے ایک ایسی کتاب تیار کردی۔ جسے اُردو ادب میں حیاتِ جاوداں حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر سنبل نگار لکھتی ہے:

> ''آبِ حیات'' کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک ایسی آرٹ گیلری ہے۔ جس میں ہمارے شاعروں کی جیتی جاگتی بے شمار تصویریں نظر آتی ہیں۔ آزاد نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اُنہوں نے اُردو شعرا کی بولتی چالتی اور چلتی پھرتی تصویریں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کردیں۔ حاتم، سودا، میر، مصحفی، انشاء، آتش، ہدہد کی تصویریں بے حد پرکشش ہیں۔ شخصیات کے علاوہ آبِ حیات میں ماحول کی مرقع کشی بھی بہت کامیاب ہے۔ مصنف نے شاعری کی تاریخ کو ادوار میں تقسیم کیا ہے اور شعرا کے ذکر سے پہلے اس دور کی خصوصیات بیان کی ہے۔''(۱۰)

آبِ حیات نہ تاریخ ہے، نہ تذکرہ۔ اس میں شعراء اُردو کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ یا۔ یوں کہیے آزاد اپنے زورِ تخیل سے اور مرقع نگاری سے اُردو کے بلند پایہ شعراء کو زندہ کردیا۔ وہ خود آبِ حیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''جہاں ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی تصویریں آن کھڑی ہوں اور انہیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔''

''آبِ حیات'' یہ اُردو شاعروں کا ایک تذکرہ ہے۔ تذکرہ کیا ہے۔ تذکرہ کیا ہے اسے اردو شاعری کی ایک تاریخ سمجھنا چاہیے۔ تذکرے پہلے بھی لکھے گئے تھے لیکن اِن میں شعراء کے شخصی حالات بہت کم تھے اور نہ زبان کے عہد بہ عہد ارتقاء کا حال لکھا گیا تھا۔ اگرچہ آبِ حیات میں بہت سی سنی سنائی باتیں بھی

شامل کرلی گئی ہیں۔ جو بعد کی تحقیق سے غلط ثابت ہوئی ہیں لیکن آج تک آبِ حیات اُردو شاعری کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے۔ آزاد نے کہیں کہیں جانب داری سے بھی کام لیا ہے۔ خاص کر اپنے اُستاد ذوق کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس میں جوشِ عقیدت میں خلافِ واقعہ بہت سی باتیں لکھ گئے ہیں۔ کہیں محض عبارت کے زور میں بہہ گئے ہیں اور مطلب کہیں کا کہیں جا پڑا ہے۔ دراصل یہ ان کے طرزِ خاص کی بڑی خامی ہے کہ علمی اور تحقیقی مباحث کے لیے جس نظم وضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ان کے زوردار اسلوبِ نگارش میں گم ہوجاتے ہیں۔(۱۱)

آزاد کی آبِ حیات کا اُردو ادب میں بہت نمایاں مقام ہے۔ اُردو ادب میں جدت کی نئی روح پھونکنے میں آزاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آزاد کو تحقیق اور چھان بین کا بڑا شوق ہے اور اسی شوق نے ان کی تنقیدی شعور کی نشوونما بھی کی ہے۔

نیرنگِ خیال:

نیرنگِ خیال کی اشاعت سے بقول ڈاکٹر اسلم فرخی اُردو انشاء پردازی میں ایک نئے اور خوش گوار باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آزاد اگر ''نیرنگِ خیال'' کے علاوہ اور کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی ان کا شمار اُردو کے غیر فانی انشاء پردازوں میں ہوتا۔ یہاں آزاد نے رنگین و دل نشین اسلوبِ اختیار کیا ہے اور شعری وسائل سے بہت کام لیا ہے۔ تجسیم کی طرف ان کا رجحان بہت زیادہ ہے اور پھر اسی کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔(۱۲)

نیرنگِ خیال کے مضامین میں تخیل کی نیرنگیاں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے آزاد کی یہ تصنیف رنگا رنگ خیال آرائی اور بوقلموں تصوّرات کی کارفرمائی سے مملو ہے۔

مولانا آزاد خود فرماتے ہیں کہ:

> ''جہاں اُنہوں نے ہوا میں گلزار کھلائے ہیں اور مضمون کو بوقلموں، رنگا رنگ اور پھر سرتا پا عالمِ نیرنگ بنانے کا عمل کیا۔ وہاں خیالی مرقعوں میں محاکات کا ایسا فطری انداز شامل کیا کہ مرقع خیالی اور تصوّراتی ہونے کے باوجود حقیقت سے زیادہ نہیں رہتا ہے اور ان میں ایک وارفع مرقع نگاری کی مخصوص شان موجود رہتی ہے۔ جو قاری کو اتنا متفرق اور منمک کردیتی ہے کہ وہ خیال اور واقعہ کے فرق کو یکسر بھول کر صرف مرقع کی منظر آرائی میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔''

''مضامینِ نیرنگِ خیال'' یہ مضامین دو حصوں میں ہیں اور تمثیلی انداز میں ہیں۔ جنہیں (Allegorical) کہتے ہیں۔ دیباچہ میں آزاد اُردو نثر کے مضامین میں اضافے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور تجویز پیش کی ہے کہ مغربی زبانوں کے خیالات میں منتقل کرنا چاہیں اور اُنہوں نے اسی پر عمل کیا ہے۔ اس مجموعہ کے بعض مضامین مثلاً سیرِ زندگی، شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار اور جنت الحمقاء نہایت دلچسپ ہیں اور آزاد کے مخصوص طرزِ تحریر کے بہترین نمائندہ ہیں۔(۱۳)

نیرنگِ خیال کی اشاعت نے انشاء پردازوں کے خزانہ میں بے بہا اضافہ کیا اور ایک انوکھے اور دلچسپ باب کا اضافہ ہوا ہے ہمارے ادبی ماہرین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر پروفیسر آزاد اور کچھ بھی نہ لکھتے تو بھی نیرنگِ خیال ان کے نام کو تا ابد زندہ جاوید رکھنے کے لیے کافی تھی اور ان کا شمار غیر فانی انشاء پردازی میں شمار ہوتا رہتا۔

خود نیرنگِ خیال اپنے موہ لینے والے اسلوب اور رمزیت کی بناء اُردو ادب میں تا قیامت زندہ و تابندہ رہے گی۔ مولانا آزاد کی شہرت کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ اس کی مثال اُردو اور صرف انشائیت ہی ہے۔

نیرنگِ خیال مولانا آزاد نے کسی خاص موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب نہیں کیا۔ بلکہ اس میں ان کے تمثیلی مضامین شامل ہیں۔ یہ آج تک فیصلہ نہیں ہوسکا کہ یہ مضامین آزاد کے اوریجنل ہیں یا کہ کسی انگریز کے مضامین کا ترجمہ..... ڈاکٹر صادق جو ایک محقق ہیں کہتے ہیں کہ آزاد نے یہ مضامین دو انگریز مصنّفین ایڈیسن اور جانسن کے مضامین سے ماخوذ کیے ہیں اور ان کے ترجموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر آزاد کے طرزِ بیان کی تعریف رام بابو سکسینہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نیرنگِ خیال میں نفسِ مضمون سے زیادہ طرزِ بیان دلچسپ ہے۔''

ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُردو نثر میں مولانا محمد حسین آزاد کا اہم ترین کارنامہ نیرنگِ خیال ہے۔ جو اپنے طرزِ نگارش کے لحاظ سے بے مثال ہے۔

دربارِ اکبری:

شہنشاہِ اکبر کے زمانے کی تاریخ ہے۔ مگر ایسی عمدہ عبارت میں لکھی ہے کہ کہانی یا ناول کا مزہ آتا ہے۔ اس میں عہدِ اکبری کی ایجادات، اختراعات، ان کے دور کی علمی ترقی سب کا حال بیان کیا ہے۔

آزاد کے اسلوب کے سلسلے میں ایک اور قابلِ ذکر چیز ان کی حکایات ہیں۔ ہو کسی بیان کو مؤثر اور واضح بنانے کے لیے حکایت کا سہارا لیتے ہیں۔ حکایت بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ اس چھوٹی کہانی کو کہتے

ہیں۔ جس میں حکمت و دانش کی بات کرداروں کے عمل اور زبان سے ظاہر کی جائے۔ اس میں ایک مختصر سا پلاٹ بھی ہوتا ہے۔ جو صرف اشاروں کا درجہ رکھتا ہے۔ اختصار حکایت کا سب سے بڑا وصف ہے جب قصہ حکایت سے بھی مختصر ہو تو اسے نکتہ یا لطیفہ کا نام دیا جاتا ہے اور آزاد اس حکایت اور لطیفہ کے بادشاہ ہیں۔ موضوع تاریخ جیسا خشک مضمون ہی کیوں نہ ہو۔ آزاد حکایت اور لطیفہ کے زور سے اسے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ ''دربارِ اکبری'' اس کی روشن مثال ہے۔

سخندانِ فارس:

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں فارسی زبان کی اصل نسل بیان کرنے کے لیے زبان کی اصل، زبانوں میں تبدیلی کے اصول اور اسی قسم کے لسانیاتی مسائل بیان کیے ہیں۔ سنسکرت اور فارسی قدیم کے تعلق پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں، ایران کی آب و ہوا و ہاں کی تہذیب و معاشرت نے فارسی زبان، شاعری اور نثر پر جو اثرات ڈالے ہیں۔ ان کی تفصیل بیان کی ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''سخندانِ فارس کے ایک حصے میں آزاد نے لسانیاتی بحث کی ہے لیکن یہ بحث ایک لحاظ سے لفظوں کے علم اور مفاہیم کے علم (Semantics) سے۔ جس پر رچرڈ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ متعلق ہو جاتی ہے۔ اس لیے تنقید کے نقطۂ نظر سے خاصی کارآمد ہے۔''(۱۵)

ڈاکٹر رؤف پاریکھ بیان کرتے ہیں:

> ''آزاد کی لسانیات، لغات اور لفظیات سے دلچسپی بلکہ اس پر ان کے عبور کا صحیح اندازہ ان کی ایک اور کتاب سے ہوتا ہے۔ اسی کا نام ''سخن دانِ فارس'' اس کتاب کا شمار لسانیات کے موضوع پر اُردو میں لکھی گئی ابتدائی میں ہوتا ہے۔''(۱۶)

مجموعۂ نظم آزاد:

مجموعۂ نظم آزاد اخلاقی اور قومی نظموں کا مجموعہ ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی بعض تصانیف مثلاً آبِ حیات اور نظم آزاد کے دیباچہ اور علمی لیکچروں میں ایسی باتیں کہی ہیں۔ جن کی بناء پر انہیں اُردو تنقید میں بھی اوّلیت کا شرف حاصل ہے لیکن ان کے اُچھوتے اندازِ نگارش، دلکش اسلوب اور طرزِ بیان سے نقادانِ فن اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آزاد ایک صاحبِ طرز ادیب زیادہ اور نقاد کم ہیں۔

''نظم آزاد'' میں کچھ غزلیں آپ کی موجود ہیں۔ جن میں زیادہ تر علالت کی حالت میں لکھی گئی تھیں۔ عالمِ جنون میں آپ کا شغل الٰہیات تھا۔ اسی کا ذکر اذکار آپ کی زبان پر رہتا تھا۔ چنانچہ ان غزلوں میں بھی تصوّف وحقیقت کی چاشنی پائی جاتی ہے لیکن شاعری میں آزادی کی اہمیت ان غزلوں کی بناء پر ہے۔

ان کے علاوہ بعض تصانیف اور ہیں۔ جو ان کی وفات کے بعد ان کے مسودات سے شائع کی گئیں۔ ان میں بعض اس زمانہ کی تصنیف ہیں۔ جب جنون کا زور تھا۔

دیوانہ بکار خویش ہوشیار کے مصداق آزاد نے عالمِ جنون میں بھی قلم سے شعل جاری رکھا چنانچہ ''جانورستان'' اور ''سپاک ونماک'' وغیرہ لکھیں۔ اسی طرح کی ایک اور کتاب ''فلسفۂ الٰہیات'' ہے۔ ۹۶ صفحات کی یہ کتاب آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد کے دیباچہ کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ مگر کتاب کی اختتامی سطور کے مطابق یکم جنوری ۱۸۹۶ء کو مکمل ہوئی۔(۱۷)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد اپنی ذات میں ایک انجمن تھے وہ شاعر تھے۔ ''نظم آزاد'' اس کا ثبوت ہے۔ وہ نقاد تھے..... ''سخندانِ فارس'' اور ''آبِ حیات'' اس بات کے شاہد ہیں۔ وہ تاریخ نویس تھے..... ''قصصِ ہند'' اور ''دربارِ اکبری'' اس کے گواہ ہیں۔ انہیں کوئی شاعر، نقاد، تاریخ نویس نہ بھی مانے تو بھی ان کی ابدی اور لازوال شہرت اور حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اُردو زبان کے متوالوں کے نزدیک وہ صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے۔ اپنی طرز کے آپ موجد اور آپ خاتم.....

آزاد کے تنقیدی نظریات:

آزاد کو کچھ لوگ اُردو کا پہلا نقاد بھی کہتے ہیں لیکن آزاد کے نقاد ہونے میں مختلف آراء موجود ہیں چونکہ کچھ سرے سے آزاد کو نقاد تسلیم ہی نہیں کرتے۔

آزاد نے تنقیدی نظریات پر کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی ہے۔ صرف ایک وہی لیکچر ہے۔ جو انہوں نے نظم اور کلامِ موزوں کے بارے میں تنقیدی نظریات پر دیا ہے۔ یا پھر مختلف تنقیدی تحریروں میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے چند خیالات مل جاتے ہیں۔

ان لیکچرز کے علاوہ نگارستانِ فارس اور سخندانِ فارس میں بھی کہیں کہیں تنقیدی خیالات مل جاتے ہیں۔ دیوانِ ذوق کے مقدمے میں بھی کچھ تنقیدی ملتی ہے لیکن آبِ حیات بھی دراصل ایک تذکرہ ہے۔ جس میں مصنف نے تذکرہ نگاری کے دائرے سے نکل کر تنقید نگاری کے میدان میں داخل ہونے کی کوشش کی ہے۔ جو تقریباً ناکام ہے۔

کلیم الدین احمد کی رائے ہے کہ:

''آزاد میں نقد کا مادہ مطلق نہ تھا۔ نظر مشرقی حدود میں پابند تھی۔ وہ لکیر کے فقیر تھے۔ باریک بینی اور آزادیٔ خیال سے مبرا۔ انگریزی لالٹینوں کی روشنی ان کے دماغ تک نہیں پہنچتی تھی۔ ان کی رائے اکثر گول ہوتی تھی۔''

اور محمد احسن فاروقی نے لکھا ہے:

''مولانا تنقید کے دائرے میں آنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ ان کا دائرہ نکتہ چینی ہے۔۔۔ کسی شاعر کے سلسلے میں کوئی ناقدانہ رائے نظر نہیں آتی۔ ہر دور کے سلسلے میں اگر خاص ذکر ہے تو ان الفاظ کا جو متروک ہو گئے یا رائج ہو گئے۔ میر اور سودا کے کمال کا اعتراف تو کیا جاتا ہے۔ مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس باکمال کی مخصوص شاعرانہ صفت کیا ہے۔''

یہ بات درست ہے کہ آزاد کی تحریروں میں جانبداری زورِ بیان، لفاظی اور الفاظ کی جادوگری نظر آتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے بارے میں کسی قسم کی رائے کا اظہار کیا جائے جیسا کہ کلیم الدین احمد یا دوسرے چند نقادوں نے کیا ہے۔ یعنی انہیں اقلیمِ تنقید سے ہی بے دخل کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے تاریخ وتنقید کو جدید طریقے سے لکھنے کی اوّلین کوشش کی ہے۔ اور اس طرح اُردو میں تنقید کی اہمیت کا احساس کیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے بڑی پتے کی بات کہی ہے:

''آبِ حیات چونکہ ایک تذکرہ یا شاعری کی تاریخ ہے۔ اس لیے قدرتی طور سے، اس سے باضابطہ تنقیدی کتاب ہونے کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ پھر بھی اس کے وہ حصے کارآمد ہیں۔ جن میں فارسی اور اُردو، پھر اُردو اور بھاشا، اس کے بعد انگریزی اور اُردو شاعروں کے طرزِ احساس اور تخلیقی طریقوں کی بحث اُٹھائی ہے اور اس سلسلے میں اُردو (فارسی) شاعری کی کچھ خوبیاں اور بہت سی کمزوریاں بیان کی ہیں۔''(۱۹)

مغربی ادبیات کے اثرات نے بھی آزاد کے تنقیدی شعور کی نشو ونما میں اچھا خاصا حصہ لیا۔ میجر فلر اور کرنل ہالرائیڈ کی صحبتوں نے بھی مغربی ادبیات سے ان کی دلچسپی بڑھا دی۔ اُنہوں نے ان کا تھوڑا بہت مطالعہ بھی کیا۔ اس مطالعے سے ان کی نظر میں وسعت تخیل میں بلند پروازی اور سوچ میں گہرائی کے عناصر پیدا ہو گئے اور ان سب سے ان کے تنقیدی شعور پر جلا کی۔ انہیں مغرب کی بڑائی کا احساس ہے۔

چنانچہ وہ اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے انداز کے موجد رہے۔ مگر انداز کے خلعت وزیور جو آج کے مناسبِ حال ہیں۔ وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔'' (۲۰)

بہرحال آزاد کو مغربی ادبیات کے دلچسپی تھی۔ وہ اس کی اہمیت سے واقف تھے۔ انہوں نے ان کے اثرات کو قبول کیا اور ان اثرات نے ان کے تنقیدی شعور کی نشو ونما میں حصہ لیا۔

اُردو نثر نگاروں میں آزاد کی شخصیت بیان سے باہر ہے۔ وہ ایک بلند مرتبہ اور اعلیٰ درجہ کے انشاء پرداز تھے۔ ان کی نثر نگاری ناقابلِ تقلید ہے۔ آج تک آزاد کی کوئی صحیح صحیح پیروی نہ کر سکا۔ بہتوں نے ان کی تقلید کی اور ناکام رہے۔ آزاد کی نثری نگاری میں بھاشا کی سادگی، انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کی شیرینی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ مولانا کی طرزِ تحریر ایک مخصوص رنگ پایا جاتا ہے اور لطیف استعارے اور دلکش تشبیہیں ان کے رنگ کو اور بھی نکھار دیتی ہے۔ آزاد کی جادو بیانی کے معترضین بھی قائل ہیں۔ ان کی عبادت کا ایک ایک فقرہ رنگینی کی دنیا کا شاہد رعنا معلوم پڑتا ہے۔ ان کی کتاب ''آبِ حیات'' کی نثر پر شاعروں کے سینکڑوں دیوان نثار کیے جاسکتے ہیں۔

آزاد اُردو کے بہت بڑے انشاء پرداز ہیں۔ اُردو کے ایک مشہور نقاد نے تو یہ حیثیت انشاء پرداز آزاد کو جملہ معاصرین پر فوقیت دی ہے۔ اگر انشاء پردازی سے مراد رنگین بیانی، زورِ ادا، تخیل کی پرواز اور نثر میں شاعری ہو تو بلاشبہ آزاد اُردو کے بہت ہی بڑے انشاء پرداز ہیں۔ اگر انشاء پردازی کا مقصد اظہارِ مطلب ہو تو آزاد کو سرسیّد، نذیر احمد، حالی یا شبلی پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ البتہ انفرادیت اور اسٹائل ہر ایک میں اپنا اپنا رنگ دکھاتے ہیں اور یہی بات آزاد کے یہاں ہے۔ ان کے یہاں عربی، فارسی کے الفاظ و تراکیب کی بھی بہتات ہوتی ہے۔ کہیں کہیں قافیہ پیمائی بھی کرنے لگتے ہیں لیکن زور کہیں نہیں ٹوٹتا یہ طرزِ تحریر خیالی مضامین اور قصے کہانیوں میں تو مزہ دے سکتا ہے۔ علمی تحریروں کا ساتھ مشکل سے دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید میں اس کی تقلید ممکن نہیں ہے۔ (۲۱)

آزاد کا قلم بڑا سحر نگار ہے۔ ان کی ہر تحریر منہ سے بولتی ہے اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ الفاظ مولانا محمد حسین آزاد کے ہیں۔ اسی لیے علامہ شبلی نے فرمایا تھا:

''آزاد گپ بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔''

آزاد جو کچھ لکھتے ہیں۔ محسوس کر کے لکھتے ہیں:

شدتِ احساس محمد حسین آزاد کی تحریروں کا خاص وصف ہے۔ اس کے علاوہ بے ساختگی، شگفتگی اور ہلکی ہلکی ظرافت وہ خوبیاں ہیں۔ جو آزاد کی تحریروں میں جان ڈال دیتی ہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیے آزاد کی تحریروں کے چند نمونے:

☆ اللہ تقدیر نے کہا ہوگا کہ دل میلا نہ کیجیو۔ اس بچے کی شمیم اقبال مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلے گی۔

☆ اس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لیے سر پر بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ دعا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری کی تلوار، بائیں میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی ہے۔

ان چند اقتباسات سے نثر آزاد کی تمام خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں تشبیہ و استعارے کا استعمال، پیکر تراشی کا رجحان، سادگی میں بناؤ اور بناؤ میں سادگی، بول چال کا انداز، لفظوں کے انتخاب و ترتیب کا سلیقہ..... یہ وہ خوبیاں ہیں۔ جو نثرِ آزاد کی اصل شناخت ہیں۔

مولانا آزاد کی اُردو نثر سے سچی محبت تھی اور وہ ہمیشہ نثر اُردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ محمد حسین آزاد کی تنقید و تحقیق سے اختلافات کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی بے مثل انشاء پردازی سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ انگریزی نثر نگاروں میں ان کا مقابلہ ڈکوینسی لیمپ اور اسٹوینس سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریروں میں گلستان کی فارسی کا مزہ ملتا ہے۔ ان کے قلم میں وہ زور ہے کہ انفرادیت قائم رہتی ہے۔ غرض آزاد ایک حقیقی نثر نگار اور انشاء پرداز تھے اور ان کو کسی سہارے کی ضرورت نہ تھی۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ عابد علی عابد، سیّد، اسلوب، لاہور مجلسِ ترقی ادب لاہور، دسمبر ۱۹۷۱ء، ص: ۶۷

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص: ۲۱۲

۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص: ۲۲۲

۴۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، عصری ادب اور سماجی رجحانات، اکادمی بازیافت، نومبر ۲۰۰۳ء، ص: ۵۱

۵۔ حفیظ الرحمان خان، عبدالعزیز بلوچ، تعارف مشاہیرِ نظم و نثر ملتان، کاروانِ ادب بار دوم، ۱۹۷۸ء، ص: ۳۲

۶۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخِ ادب اُردو، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۷۱ء، ص: ۱۵۸
۷۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، لاہور، دارالنوادر، ۲۰۱۳ء، ص: ۲۹۹
۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اُردو تنقید کا ارتقا، کراچی، انجمنِ ترقیٔ اُردو پاکستان، اشاعت سوم، ۸۵۔۱۹۷۹ء، ص: ۲۰۱
۹۔ ابوالکلام قاسمی، مشرقی شعریات اور اُردو تنقید کی روایت، لاہور، مغربی پاکستان، اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۹۵
۱۰۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، لاہور، دارالنوادر، ۲۰۱۳ء، ص: ۲۹۸
۱۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، حیدرآباد، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، سندھ س ن، ص: ۵۲۔۵۳
۱۲۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، لاہور، دارالنوادر، ص: ۲۹۸۔۲۹۹
۱۳۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، لاہور، دارالنوادر، ص: ۵۳
۱۴۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، تعارف مشاہیرِ نظم، لاہور، دارالنوادر، ص: ۳۶
۱۵۔ سیّد عبداللہ ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص: ۱۴۹
۱۶۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، عصری ادب اور سماجی رجحانات، لاہور، دارالنوادر، ص: ۵۱
۱۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، تیرھواں ایڈیشن، ۱۹۸۷ء، ص: ۳۴۸
۱۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو تنقید کا ارتقا، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص: ۲۰۳
۱۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۵۱
۲۰۔ آزاد، آزاد لیکچر، مندرجہ ''نظم آزاد، نظم اور کلامِ موزوں کے بارے میں خیالات، ص: ۱۶
۲۱۔ آزاد، آزاد لیکچر، اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، ص: ۵۴
۲۲۔ آزاد، آزاد لیکچر، اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، ص: ۳۰۱

☆☆☆

Ph. D Scholar (Urdu)
Lecturer Urdu
Sandal College, Millat Road Faisal Abad (Pakistan)
Tel: - 0335-6402151
Email: smm6585@gmail.com

● شاھد الرحمٰن

زبان کی تخلیقی اور تشکیلی جمالیات

دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں الگ الگ زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ اس کا اندازہ اور تجربہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم ایک علاقے سے دوسرے علاقے یا ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرتے ہیں۔ مقام کی تبدیلی سے ہمیں نہ صرف آب و ہوا، انسانوں کے رہن سہن، طریقہ سلیقہ، تہذیب و تمدن، کھان پان وغیرہ میں تبدیلی نظر آتی ہے بلکہ ان کی بول چال کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مختلف علاقوں کی بول چال کا یہ فرق ثابت کرتا ہے کہ مختلف علاقوں میں مختلف زبان اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ پوری دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں کا بالکل صحیح اندازہ لگانا نہ صرف یہ کہ مشکل ہے بلکہ بہت حد تک ناممکن بھی ہے، تاہم ماہرین لسانیات کے ایک محتاط اندازے کے مطابق اولاد آدم پانچ ہزار تا سات ہزار زبانوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض زبانیں ایک دوسرے کے بالکل مختلف ہیں لیکن بعض باہم مماثلت رکھتی ہیں اور اسی بنا پر زبانوں کا خاندان طے پاتا ہے۔

روز اول سے ہی انسان کو خدا کی تلاش رہی ہے اور علم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو انسان کی ملاقات خدا سے کراتا ہے۔ علم داخلی ہو یا خارجی، اس کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار 'لفظ' نے ادا کیا۔ پھر لفظ کے برتنے کے انداز کو ہم نے زبان کا نام دیا اور اس کے لکھے ہوئے ذخیرے کو 'کتاب' کے نام سے موسوم کیا۔ یعنی علم کی نسل در نسل منتقلی کے لئے لفظ سب سے مؤثر وسیلہ ثابت ہوا۔ علم کو محفوظ رکھنے کی انسانی خواہش نے لکھنے کے عمل کو جنم دیا، وہیں انسانی جذبات و احساسات اور ضروریات کے بیان کی خاطر زبانیں وجود میں آئیں۔ اس چھوٹی سی بحث سے ہم یہ نتیجہ ضرور اخذ کر سکتے ہیں کہ نبی آدم عقل و فہم کی منازل طے کرتے ہوئے 'انسان' بنا۔ انسان بننے کے عمل نے ہی اسے 'سماج' جیسی کسی چیز کا موجد بنایا۔ پھر جب سماج بنے گا تو اس میں منظّم ہونے کا شعور بھی لازمی ہوگا، اس کی تاریخ بھی ہوگی، سماجی ضروریات بھی ہوں گی۔ کل ملا کر کہا جا سکتا ہے کہ زبان کو تاریخ اور سماجی

ضروریات نے جنم دیا ہے، اس کے نشوونما کے لئے ماحول پیدا کرتا ہے جس میں آہستہ آہستہ تہذیبی خیالات اور ادبی تخلیقات کے لیے جگہ بنتی ہے۔ یعنی زبان کوئی ایسی شے نہیں جو کسی سائنسی تجربہ گاہ میں بنائی جا سکے جس طرح کہ ہائڈروجن اور آکسیجن کو مخصوص تناسب میں مرکب کرنے سے پانی بنتا ہے یا اس طرح کی دوسری بہت ساری چیزیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں زبان کے سائنٹفک ہونے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ زبان سے محبت کا دم بھرنے والے، بہت سارے زبان دانی کے شدت پسند دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ تو انسانوں کے باہمی خلط ملط، میل جول، ضروریات، جذبات واحساسات کی پیدائش ہے۔ یہ تھی زبان کی مختصر ترین تعریف۔ لیکن ہمارا مقصد زبان پر بحث کرنا نہیں بلکہ اردو زبان کے متعلق کچھ باتیں کرنا ہے۔

ہر زبان کی طرح اردو کو بھی سماجی ضرورت اور تاریخ نے جنم دیا۔ اس کی پیدائش کے تعلق سے بہت سارے نظریات اور مفروضے سامنے آچکے ہیں۔ کچھ کو یکسر رد کر دیا گیا، کچھ سے سند کے مطابق کچھ ضروری اور مستند باتیں رکھ لی گئیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ زبان کسی تجربہ گاہ میں تیار نہیں کی جا سکتی، اس کی پیدائش کے متعلق کوئی سائنٹفک تھیوری بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ محض اشاروں کی بنیاد پر تاریخ کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر، شواہد جن کی سب سے زیادہ پشت بناہی کرتے ہیں، ان حقائق کو ثبوت مان کر، اردو کے متعلق بھی ایک رائے قائم کر سکتے ہیں جیسا کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے متعلق ہم رائے رکھتے ہیں۔

اردو جو کہ ہند آریائی زبانوں کے خاندان کا حصہ ہے، کی پیدائش کے متعلق قیاس آرائیوں، نظریات بازی، پروپیگنڈہ بازی کا دور ختم ہو چکا ہے اور یہ بحث تقریباً طے پا چکی ہے کہ اردو کھڑی بولی سے پیدا ہوئی یعنی کھڑی بولی اس کی ماں ٹھہری اور اس کی چاشنی کی ذمہ دار برج بھاشا ہے۔ یعنی وہ اس کی خالا ہے اور جس طرح خالائیں ہماری زندگی میں جو رول ادا کرتی ہیں، وہی برج نے اردو کے ساتھ کیا اور بہت خوب کیا!! جس نتیجے کا اعلان اس قدر دھوم دھام سے کیا گیا وہاں تک پہنچنے میں کتنے ہی جید عالموں، ماہر لسانیات اور اردو کے بزرگوں نے جان فرسائی کی، اپنا خون جگر صرف کیا، زندگی لگادی ان کا ذکر کیے بغیر اس بات کا اعلان نہیں کیا جا سکتا، یہ ظلم ہوگا نا انصافی ہوگی!! اس سلسلے میں گذشتہ دو سو برسوں میں متعدد علما، محققین اور ماہر لسانیات اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ بعض نے محض قیاس آرائی کی لیکن بعض ایسے بھی گذرے ہیں جنہوں نے جدید تحقیق کی روشنی میں اپنا نظریہ پیش کیا، ثبوتوں کے مدنظر اپنی بات

رکھی۔ یہ سلسلہ میر امن سے شروع ہوتا ہے جنہوں نے 'باغ و بہار' (1803) کے دیباچے میں اردو کی ابتدا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مولانا حسین آزاد نے 'آب حیات' (1880) میں اس سلسلے سے اپنی رائے قائم کی۔ سید سلیمان ندوی نے 'نقوش سلیمانی' (1939) میں اپنی آرا سے واقفیت کرائی۔ سر سید احمد خاں نے بھی اردو کی ابتدا کے متعلق اظہار خیال کیا۔ لیکن اس سلسلے میں محققانہ کارنامے سب سے پہلے حافظ محمود خاں شیروانی نے اپنی تصنیف 'پنجاب میں اردو' (1928) پھر محی الدین قادری زور کا علمی و تحقیقی کارنامہ 'ہندوستانی لسانیات' (1932) اس سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے مستند اور قابل قبول نظریہ پروفیسر مسعود حسین خان نے 'مقدمہ تاریخ زبان اردو' (1948) میں پیش کیا۔ ان علما کے علاوہ شوکت سبزواری، مولوی عبدالحق، گیان چند جین، مرزا خلیل احمد بیگ اور سہیل بخاری جیسے محققین نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی۔ انگریزی زبان میں گراہم بیل، جارج گریرسن، ژول بلوک، میکس مولر، سنیتی کمار چٹرجی وغیرہ نے اردو کی ابتدا کے مسئلے پر اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔

ماہرین لسانیات کا اس بات پر کامل اتفاق ہے کہ اردو خالص ہند آریائی زبان ہے اور خاص ہندستان کی پیداوار نیز اس کی بنیاد یہیں کی بولیوں پر ہے۔ اس کی کچھ لفظیات اور بعض لسانی عناصر کا تعلق عربی و فارسی سے ضرور ہے جنہیں مسلمان فاتح اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ انہیں بیرونی عناصر اور مقامی بولیوں کی خمیر سے اردو کی تشکیل عمل پذیر ہوئی۔ اردو ہندستان کی دونوں قومیں یعنی ہندو اور مسلمان کی لسانی، تہذیبی اور معاشرتی اتحاد کا نتیجہ ہے، گنگا جمنی تہذیب کی یادگار ہے۔ یہ جھگڑا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی، ان دونوں قوموں کے آپسی تعصب اور فرقہ واریت کا نتیجہ ہیں جس کی ہوا پچھلے ڈیڑھ دو سو سالوں سے چل رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے اردو 'اردو' بننے سے پہلے ہندی یا ہندوی ہی کہلاتا تھا۔ وقت کے ساتھ مذہبی رنجش کا زور اس قدر گہرا ہوا، تشدد میں اس قدر شدت آئی کہ اس نے زبان جیسی سیکولر حصولیابی کو بھی نہیں بخشا۔ اس نے جسم کو جان سے الگ کر دیا اور یہ کھائی اب اتنی بڑی ہو چکی ہے کہ اسے پاٹنا تقریباً ناممکن سا ہو گیا ہے۔ یہ ایک گناہ عظیم اور ناقابل تلافی غلطی ہے۔ اس کے دوررس مضر اثرات ہمارے سامنے ہیں، اس نے علم کے دائرے کو سکوڑ دیا ہے۔

عصرِ حاضر میں شدید اخلاق پسندی اور شدید خالص پسندی کا زور بہت چل نکلا ہے، خواہ وہ مذہبی

خالص پسند ہوں یا لسانی، آب و ہوا کے ہوں یا علم کے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر چیز میں 'خالص پن' کے متلاشی ہیں، دوسری کسی چیز کے عمل دخل کو، خواہ وہ کتنا ہی سودمند کیوں نہ ہو، برداشت نہیں کرتے حالاں کہ جب کوئی شے توضیح اور تفسیر کے مراحل طے کرتی ہے تو اس کے مختلف زاویے کھلتے ہیں، جہان معنی آباد ہوتے ہیں، وہ باتیں سامنے آتی ہیں جن کا تصور وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ کچھ معاملات میں خالص پسندی کو تو ہم عقل مندی تصور بھی کر سکتے ہیں مثلاً اگر کوئی صاف پانی، صاف ہوا کے نظریے کا حامی ہے تو اچھی بات ہے لیکن بہت خالص دودھ پیٹ بھی خراب کر سکتا ہے، موٹاپا لا سکتا ہے یا پھر علم کا ہی معاملہ زیر غور رکھیں تو جناب یہ بین المضامینی اور بین الاقوامیت کا عہد ہے، اس میں خالص پن سے کام نہیں چلے گا۔ ایک پگڈنڈی پکڑ کر چلیں گے اور آس پاس نظر نہیں رکھیں گے تو کھائی میں بھی گر سکتے ہیں۔ یہ معاملہ اردو زبان کو بھی درپیش آیا ہے۔

اردو زبان و ادب کے کچھ دانش وراور طلبا کا ماننا ہے کہ آج متعدد ادیب و شاعر حضرات اپنے ادب اور شاعری میں اردو کے خالص پن کا خیال نہیں رکھتے۔ انہیں خاص شکایت ہندی الفاظ کے استعمال سے ہے۔ باقی انگریزی الفاظ سے تو وہ اس قدر مرعوب ہیں کہ فوراً نت مستک ہو جاتے ہیں، عربی فارسی کے الفاظ انہیں 'اپنا' سا لگتے ہیں، دوسری یوروپی زبانوں کے الفاظ سے وہ واقفیت ہی نہیں رکھتے، انہیں سرے سے پہچانتے ہی نہیں ہیں تو اعتراض کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے؟ ان کا ماننا ہے کہ اس سے اردو کی 'پاکی' پر حرف آتا ہے، زبان خالص ہی ہونی چاہیے۔ یہ کسی تنگ نظری اور تعصب کا ہی نتیجہ ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق غیر زبانوں سے جو الفاظ براہ راست اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں شامل ہو گئے ہیں ان میں عربی (7584)، فارسی (6041)، ترکی (105)، عبرانی (11)، سریانی (7)، انگریزی (500) اور دیگر یوروپین زبانوں مثلاً یونانی، لاطینی، فرانسیسی، پرتگالی، ہسپانی وغیرہ سے (153) مستعار لیے گئے ہیں۔ (حوالہ: اردو زبان اور سماجی سیاق و سباق، پروفیسر عبدالستار دلوی، بمبئی، اقلیم پبلی کیشنز، 1992، ص: 45)

جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ دنیا کی کوئی بھی زبان کسی تجربہ گاہ کی پیداوار یا حصولیابی نہیں ہوتی، ہو بھی نہیں سکتی، ایسی حالت میں زبان کے پاک اور خالص ہونے کا مفروضہ مکمل طور پر قابل گردن زدنی ہے، اسی سلوک کا حق دار ہے۔ زبانیں بنتے بنتے بنتی ہیں۔ دنیا کی کسی بھی زبان کی تاریخ کا مطالعہ اس

امر کی واقفیت کا ذریعہ ہیں۔ یوں بھی یہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ہم زبانوں کی تاریخ، پرورش و پرداخت، عروج و زوال جیسے حقائق سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی بھی زبان جس علاقے میں پیدا ہوتی ہے، پلتی بڑھتی ہے، اس گردونواح سے اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ یہی وہ طریقہ بھی ہوتا ہے جس سے اس کا وجود پھلتا پھولتا ہے، عروج حاصل کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی زبان ایسی ممکن نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس میں مستعمل تمام تر الفاظ خالص اسی کے ہیں، کسی اور زبان سے مستعار نہیں۔ اس بات کو مثالوں کے ذریعہ اور بھی قاعدے سے سمجھا جا سکتا ہے، مفروضے کو تقویت پہنچائی جا سکتی ہے۔ تمام اہم یوروپیائی زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، پرتگالی، ہسپانوی، جرمن وغیرہ کی تو اسکرپٹ ہی رومن ہے!! کیا انگریزی سے فرانسیسی کا اخراج، فرانسیسی سے جرمن کا اخراج، اطالوی سے انگریزی کا اخراج یا اس کے قسم کے جو بھی تسویے بنتے ہیں، کے بعد ان اہم ترین زبانوں کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ قطعاً نہیں!! یہی وجہ ہے کہ ان زبانوں کی رسائی اس حد تک عظیم ہے، لغط بھاری بھرکم، ضخیم اور فصیح!! یوروپ کے اکثر باشندے زندگی بھر زبان کی معرفت کے عمل میں رہتے ہیں۔ فرانسیسی جرمن سیکھتا ہے تو ہسپانوی انگلش، پرتگالی فرانسیسی سیکھتا ہے تو فرانسیسی اطالوی۔ یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا عمل ہے۔ اس سے نہ صرف علم کے خزانے میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس کی عظمت، متعلقات اور صداقت بھی قبولیت عام حاصل کرتی ہے۔

لسانیات کے بہت سے علما نے ہندستان کو زبانوں کا 'عجائب گھر' کہا ہے۔ گریرسن کے خیال میں یہاں 179 زبانیں اور 544 بولیاں بولی جاتی ہیں۔ آپ صرف ایک سیاحت کے عالم کی خدمات حاصل کر کے تقریباً مکمل یوروپ اور امریکہ کی سیر بخش سیر کر سکتے ہیں، لیکن صرف راجستھان کے سفر پر ہی کئی زبانوں کے بولنے والوں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہی بات دوسرے صوبوں کے لئے بھی حقیقت ہے۔ یہی اس ملک کی طاقت ہے، اس کی انفرادیت بھی، حسن بھی اور اختلاف میں اتحاد کے تصور کو عملی جامہ میں پرونا بھی ہے۔ زبانیں بننے کا جو قانون دنیا کی تمام تر زبانوں پر نافذ ہوتا ہے، اس سے اردو کو کیسے فراغت حاصل ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے اس نے بھی اپنے گردونواح کے اثرات، ان کے الفاظ، لہجہ، قواعد کا اثر لیا ہے۔ اب ایسی حالت میں جب کہ اردو زبان کے ابتدائی حضرات عربی فارسی داں تھے تو انہوں نے اردو کو ان زبانوں کے الفاظ و قواعد سے مالا مال کیا، لیکن علاقہ جب ہندستان کا تھا تو یہاں کی

زبانوں سے اردو کیسے اچھوتی رہ سکتی ہے؟ معلوم یہ ہوا کہ ہندستان کی دوسری زبانوں نے اردو کے بنیادی خمیر کی تخلیق میں دوسری کسی بھی زبان سے زیادہ کارکردگی انجام دیا جس نے اردو کے ذائقے میں نمک کا رول ادا کیا اور آج بھی کر رہا ہے۔ بعد کے حالات ایسے ہوے کہ زبانوں کے تعلق سے لوگوں کے درمیان نفرت پیدا کر دی گئی جس نے دوررس منفی اثرات مرتب کیے۔

اس سلسلے میں ہندی اور سنسکرت سب سے اہم کڑی ہیں۔ یاد رہے کہ اردو کے مختلف ناموں میں ایک نام ہندی یا ہندوی بھی ہے اور دراصل یہی اردو کا شدھ دیسی رومانس بھی ہے۔ جس طرح محبت کی، دنیا ہمیشہ سے ہی دشمن رہی ہے اسی طرح دونوں خیمے اس رومانس کے بھی مخالف ہیں۔ لیکن فتح ہمیشہ محبت کی ہوئی ہے، نفرت ہار سے ہی دوچار ہوا ہے۔ ایک خیمے کا تو سمجھ میں آتا بھی ہے لیکن اردو سے نام نہاد محبت کرنے والوں سے، اس کی پاکی اور خالص پن کے دم بھرنے والوں سے یہ دریافت کرنا ضروری ہے کہ اردو سے اگر مختلف زبانوں کے الفاظ کا اخراج ممکن کر دیا جائے، عربی، فارسی، انگریزی، لاطینی، یونانی، ہندی، سنسکرت وغیرہ کے الفاظ کو چن چن کر باہر کر دیا جائے تو اردو والوں کے پاس بچ کیا جائے گا، باباجی کا ٹھلو؟ اگر خالص پن کا راستہ ادھر سے ہی گذرتا ہے تو سب سے پہلے ترکی الفاظ کو نکالتے ہیں، پھر یہ زبان ہی ختم ہو جائے گی کیوں کہ لفظ 'اردو' ہی ترکی ہے پھر بجاتے رہیں باجا!!!

دوسرے زبانوں سے ادھار لیے گئے الفاظ ہماری زبان کو زرخیز اور آسودہ بناتے ہیں، اس کے متعلقات کو وسیع کرتے ہیں، اس سے رابطے قائم ہوتے ہیں، سلسلے آگے بڑھتے ہیں، متنوع جذبات و احساسات کو ترسیل کا وسیلہ حاصل ہوتا ہے اور یہ تمام چیزیں کسی بھی زبان کے لئے سودمند ہیں۔ ہندی کا لفظ 'آ کاش وانی' کا ترجمہ اردو میں کیا کریں گے؟ 'سماعی صدا' یا 'آسمانی آواز'، لیکن کیا اس عمل میں 'آ کاش وانی' قتل نہیں ہو جائے گا، اس کا حسن ضائع نہیں ہو جائے گا؟ فلاح اسی میں ہے، حقیقت یہی ہے کہ آ کاش وانی ہمارا لفظ ہے، جیسا موقفھی واحد راستہ ہے۔ آج یوں بھی جب اردو پر چہار طرفہ حملہ ہو رہا ہے، اس کی شناخت اور انفرادیتکو ہی ختم کرنے کی سازش ہو رہی ہے، اس کا رسم الخط تک تبدیل کرنے کی بات ہو رہی ہے، عوام میں مکمل طور پر رائج اس کے عام فہم، دلکش اور سہل الفاظ کو بھی دوسری زبانوں کے بھاری بھرکم، مشکل اور کم موزوں الفاظ کے بار ہا استعمال سے قابل قبول بنایا جا چکا ہے، ایسی فحش سوچ اردو کے خیر خواہوں کی تو قطعاً

نہیں ہو سکتی۔ کیا حاکم، جلادھیکاری نہیں بن گیا اور افسر ادھیکاری، قاضی، نیای دھیش نہیں ہو گئے اور آفتاب، سورج، صوبہ، راجیہ نہیں ہو گیا اور بیت الخلا شوچالے؟ لوگ پہلے غسل کرتے تھے اور آج اسنان کرتے ہیں، پہلے تناول فرماتے تھے اور آج بھوجن کرتے ہیں، پہلے دہریہ ہوتے تھے اور آج ناستک، پہلے ٹہلتے تھے اور آج واکپر جاتے ہیں، پہلے شب بخیر ہوتا تھا اور آج گڈ نائٹ!! ایسی مثالوں کی ایک لمبی فہرست بنائی جا سکتی ہے لیکن عقلمندوں کے لئے اشارہ ہی کافی ہونا چاہیے۔

اردو صرف ایک زبان کا نام ہوتا تو کوئی بات ہی نہیں تھی، یہ تو تہذیب بھی ہے، ثقافت کی ضامن بھی ہے۔ اس کی مثال ایک گلدستے کی بھی ہے۔ جس طرح کوئی زیبائش کار یا گل کار مختلف اقسام، رنگ و بو، شکل و شباہت، زاویے اور خاندان کے پھولوں کو یکجا کر کے، سجا کر ایک گلدستہ تیار کرتا ہے جو کسی بھی طرح ایک پھول سے زیادہ دلکش اور دلاویز ہوتا ہے، بعینہ مختلف اقوام، تہذیب و ثقافت، مذہب و ملت، بول چال کے افراد نے باہمی کاوشوں اور جدوجہد سے اس پرشکوہ زبان کی تخلیق کو ممکن بنایا، عملی طور پر متشکل کیا۔ کوئی بے ذوق اور بے ادب آدمی ہی اس حسین گلدستے سے ایک بھی پھول توڑ کر اسے بدنما کرنے کا خیال بھی اپنے ذہن میں لا سکتا ہے۔ ایسے افراد اس گلدستے کے خیر خواہ کہلانے کا حق تو کسی بھی قیمت میں نہیں رکھتے بلکہ وہ یہ حق کھو دیتے ہیں۔ صاحب حق تو وہ افراد و اشخاص ہیں جو اس گلدستے میں نت نئے پھول جوڑنے کی جگت میں لگے رہتے ہیں تاکہ روز بروز اس کے حسن کے خزانے میں اضافہ ہو نہ یہ کہ وہ بدنما ہو۔ اردو کی بنیادی تاریخ سے جو ذرا بھی واقفیت رکھتا ہو اسے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا اور وہ سمجھ سکتا ہے کہ 'لشکر' کا بنیادی اصول اور حسن کیا ہے، کیا چیزیں اس کو تقویت پہنچاتی ہیں اور کیا اس کو کمزور کر سکتی ہیں یا اس کے وجود کو ہی خطرے میں ڈال سکتی ہے!!!! سیاسی اور فوج کاری کی سطح پر حصولیابیوں کے مدنظر اگر تجزیہ کریں تو NATO آج دنیا کا سب سے کامیاب اور خطرناک عسکری نظام اور جماعت ہے اور اس کی فتح یابی کا راز جماعت ہونے میں ہے نہ کہ فرد!!

جناب! اردو کو شدھ دیسی رومانس کرنے دیجئے۔ یہی اس کی بقا، وجود، ترویج و اشاعت، حسن کی ضامن ہے۔ اسے اپنانے دیجئے وہ تمام تر الفاظ جو کسی بھی صورت اس کے رَبطمیں آتے ہیں، اسی سے وہ پھلے پھولے گا۔ لے جایئے اپنی پاکی اور خالص پن کہیں اور، ان کا استعمال کیجئے اپنی روحوں کے لئے، اردو کا گلا مٹ

گھونٹیے، اسے کھل کر سانس لینے دیجئے۔ اس کی غذا یعنی الفاظ، جہاں سے بھی آتے ہیں آنے دیجئے تا کہ انہیں اپنے اندر جذب کر کے، اپنے قالب میں ڈھال کر وہ اور صحت منداور تندرست ہو سکے! یہی اردو کے لئے آپ کی محبت کا ثبوت بھی ہوگا اور احسان بھی ورنہ جس بھلاوے میں بھی، آپ کی محبت کا یہ بے جا اور احمقانہ انداز، آپ کی معشوقہ کو خودکشی کے لیے مجبور کر دے گا!! تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!!

مراجع ومصادر:

1. آب حیات، محمد حسین آزاد، کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، 2008 (پہلا ایڈیشن: 1880، لاہور)
2. مقدمہ تاریخ زبان اردو، مسعود حسین خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، بارہویں اشاعت، 2008
3. اردو کی لسانی تشکیل، مرزا خلیل احمد بیگ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، چوتھا ایڈیشن 2008
4. اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، پہلا ایڈیشن، 1983
5. Urdu Grammar: History and Structure، مرزا خلیل احمد بیگ، باہری پبلیکیشنز، نئی دہلی، 1988
6. A Grammar of the Hindustani or Urdu Language, John T Platts, Delhi 1967
7. انتخاب مضامین سرسید، انور صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2011

◀◀ ● ▶▶

E 92/1, 4th Floor (Opposite Garden Public School),
Street No. 6, Shaheen Bagh, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi-110025
Mob. No: +919953078646
E-mail: shahidafza@gmail.com

نام کتاب	:	آخری وقفے کا کھیل (شمس ندیم کے افسانے)
مرتب	:	محمد عمران قریشی
سن اشاعت	:	۲۰۱۵ء
قیمت	:	۳۵۰/روپے
ملنے کا پتہ	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی

● اعتراف
● رضاء الحق صدیقی

افکارِ جدید کی شاعری

یہ کیوں اندر کا موسم اور ہے باہر کے موسم سے
کہ جب رونق ہے ہر جانب تو ہم بیزار ملتے ہیں

صبیحہ صبا کا یہ شعر اعلان ہے کہ شاعری کی واحد اساس دکھ ہے۔ دکھ ہی وہ مظہر ہے جو انسانوں کے مابین قابل عمل رشتوں کی بنیاد بن سکتا ہے۔ یہ رشتے ذات کے دکھ کے حوالے سے سماجی دکھ کی تفہیم میں معاون بنتے ہیں۔

شاعری کا موسم لکھنے والے کے اندر کا موسم ہے۔ جب کبھی انسان کے اندر کا موسم معروضی حالات کے تحت جسم و جاں میں شورش بپا کرتا ہے تو یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب شاعری جنم لیتی ہے اور یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب انسان کے اندر سے ایک چیخ برآمد ہوتی ہے اور یہ لمحات ہوتے ہیں دکھ کے، اداسی کے:

چہرے کا ہر کرب دکھائی دیتا ہے خاموشی کا شور سنائی دیتا ہے

چہرے پر ابھرنے والی درد و کرب کی لکیروں کا اظہا تو کلاسک فارسی اور اردو شاعری میں کئی انداز میں پہلے بھی استعمال ہوا ہے لیکن اس شعر کے مصرعِ ثانی میں بالکل تازہ اور نئی بات آئی اور بہت سلیقے اور جمال کے ساتھ آئی، خاموشی کا شور معنویت کے اعتبار سے وارداتِ نو ہے، ایسا شعر کہنے والا اردو غزل کی پہلی صف میں بڑی قامت کا شاعر ہونے کا حق رکھتا ہے۔

میں نے صبیحہ صبا کے گذشتہ شائع شدہ مجموعوں کی غزلیں بہت شوق سے پڑھی ہیں۔ اپنے بولتا کالم کے سلسلہ میں ڈیڑھ دو سو کے قریب شعرا ۴۱ کا کلام میری نظر سے گذرا ہے۔ ان میں اچھے اشعار بھی تھے لیکن ایسے افکارِ تازہ اور ضرب المثل بن جانے والے اشعار نظر نہیں آئے۔

خاموشی کا شور سننے کی کیفیت کا سچا باطنی تجربہ ایک پوری محسوس کیفیت بن کر سامنے آتا ہے اس میں جذب اور احساس کی صداقت بھی ہے اور بیان کی تازہ کاری بھی۔

وہی میری وجہِ عروج تھا وہی میری وجہِ زوال تھا وہی وجہِ رنگِ طرب رہا، وہی وجہِ حزن و ملال تھا

چلے جب بھی درد کے قافلے میرے چارہ گر میرے دیدہ ور — وہ جو درد سہنا محال تھا وہ جو سہہ گئے تو کمال تھا
کوئی بے حسی کے جہان میں کوئی دردِ دل کی اٹھان میں — کوئی اپنی دھن میں مگن رہا کوئی اپنے غم سے نڈھال تھا
کسی سانحے سے گذر ہوا سبھی وحشتوں کا اثر ہوا — ذرا نسلِ نو کا خیال کر، دلِ غم زدہ کا سوال تھا

صبیحہ صبا کی شاعری کا ایک رنگ تو یہ ہے جس کا ذکر میں نے کیا لیکن ان کی شاعری کا دوسرا رخ اس حزن و یاس کے برعکس ہے جہاں وہ انقلابی فضا کی عکاس نظر آتی ہیں، یہ وہی فضا ہے جسے فیض احمد فیض کی شاعری نے نمایاں تبدیل شدہ ادبی رجحان دیا جس کی تقلید اس وقت کے نوجوان شعراء نے کی تھی لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس رجحان کی تقلید میں خواتین شعراء نظر نہیں آتیں ان کے ہاں رومانی شاعری کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ صبیحہ صبا جب یہ کہتی ہیں کہ

میرے لفظوں کی وہ گرفت میں ہے — اس کو اندر غزل کے دیکھ لیا
میرا چہرہ ہے آئینہ میرا — میں نے خود سے نکل کے دیکھ لیا

جب وہ خود سے نکل کر دیکھتی ہیں تو معاشرے کے دکھ درد اور آلام انہیں بغاوت پر مجبور کر دیتے ہیں اور یہ وہی رجحان ہے جو فیض احمد فیض، احسان اور حبیب جالب کے ہاں پایا جاتا ہے:

صرف ریشم نہیں تلوار بھی ہو سکتے ہیں — یہ جو مظلوم ہیں خونخوار بھی ہو سکتے ہیں
میرے شہروں میں قیامت سی مچانے والے — ہاتھ باندھے پسِ دیوار بھی ہو سکتے ہیں
آج بے وقعت و بے در ہیں پریشان سے لوگ — کل یہی وقت کے سردار بھی ہو سکتے ہیں
سفاکی کا زہر انڈیلا جاتا ہے — انسانوں کے خون سے کھیلا جاتا ہے
اپنی سوچ سے کام نہ لینے والوں کو — پستی میں کچھ اور دھکیلا جاتا ہے

شاعری کے لیے بہت ہی متنوع خیالات اور معتدل نظریات کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعری خاص طور پر غزل ایک انتہائی لطیف صنفِ سخن ہے۔ تجربات و مشاہدات کے لئے ایک بہت پیارے اور غیر معمولی حد تک معتدل لسانی عمل کی ضرورت ہے۔ زندگی کی رعنائیوں، رنگینیوں اور شادمانیوں کو اپنے من میں ڈوب کر ان کو حقیقت کا سراغ پانے کی حد تک تلاش کرنا پڑتا ہے۔

شاعری پر کسی قوم یا علاقے کے اجتماعی مزاج کے اثرات چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی مرتب ہوتے ہیں۔ تقسیمِ ہند سے پہلے کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ساری شاعری کا آہنگ ایک جیسا نظر آتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ ہر قوم اور ہر علاقے کے اجتماعی مزاج کا پرَتو اس علاقے کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی شاعری گیت کی مدھرتا کی لے پر رقص کرتی نظر آتی ہے جبکہ پاکستان میں شامل

علاقوں میں عجز و انکسار، پیار اور محبت کی کھلی فضا کا رنگ ہے کشمیر اور سرحد کے پہاڑوں کا ترفع، پنجاب اور سندھ کے ریگستانوں کی وسعت کا عکس بھی ہے۔ دریاؤں کا ٹھاٹھیں مارتا جوش بھی ہے اور میدانی علاقوں میں ان کا سست روٹھہراؤ بھی۔ پاکستان کی اردو شاعری مشاہدے، احساسات، تجربات اور کیفیات کو زبان کی ترتیب و تنظیم ایک جمالیاتی نظام کی ترکیب کا عنصر بنی دکھائی دیتی ہے۔

صبیحہ صبا کی شاعری کی اٹھان پنجاب کے شہر ساہیوال سے ہوئی۔ پنجاب کا خاص کلچر اور گھر کے ادب دوست اردو ماحول نے ان کی شاعری کو جہاں لطیف نازکی بخشی وہیں تجربات و مشاہدات کے معتدلانہ عمل نے پنجاب کے اجتماعی مزاج کی خوشبو کے رنگ ان کی شاعری میں بکھیر دیئے۔ ان کے شریک حیات سید صغیر احمد جعفری کی ادب دوستی نے بھی ان کی شاعری کو جلا بخشی۔ صبیحہ صبا آج کے دور کی حساس شاعرہ ہیں ان کی یہ حساسیت ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں جھلکتی ہے۔ ان کی شاعری کے پس منظر میں ان کے ذہنی رویوں کا عکس نمایاں ہے:

چپ چاپ فضا ہے کوئی ہلچل بھی نہیں ہے — کیا کوئی یہاں درد سے بے کل بھی نہیں ہے
بے حس ہیں یا ظالم کی حمایت میں کھڑے ہیں — پیشانی پہ حیرت ہے کہ اک بل بھی نہیں ہے
سانسوں کو بھی چلنے کی اجازت نہیں دیتے — کیا جبرِ مسلسل کا کوئی حل بھی نہیں ہے

صبیحہ صبا بات کرنے کا ہنر جانتی ہیں لیکن کبھی کبھی ان کا لب و لہجہ ان کے اندرونی کرب کی غمازی کرتا ہے:

سفاکی کا زہر انڈیلا جاتا ہے — انسانوں کے خون سے کھیلا جاتا ہے
اپنی سوچ سے کام نہ لینے والوں کو — پستی میں کچھ اور دھکیلا جاتا ہے
لوگ ذرا سی ہمدردی کر جاتے ہیں — کرب کو اپنے خود ہی جھیلا جاتا ہے
اڑان خوب تر ہوئی جو پنچھیوں کی ڈار کی — تو گھیر گھار کر کسی نے زیرِ دام کر دیا

صبیحہ صبا کی شاعری میں ایک ایسی جاذبیت اور کشش ہے کہ پڑھنے والا اپنے من میں جہاں ایک کسک محسوس کرتا ہے وہیں اس دھرتی کی مٹی سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو کو بھی محسوس کرتا ہے۔ صبیحہ صبا نے اپنے اسلوبِ شعر کی تشکیل میں اپنے عہد کے مزاج کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

صبیحہ صبا کی شاعری کا ایک موضوع وطن سے اظہارِ محبت بھی ہے جس کا اظہار وہ شاعرانہ حسن سے کرتی ہیں اور کہیں وہ محبت کے جذبات میں ڈوب جاتی ہیں:

وطن سے مہر و وفا جسم و جاں کا رشتہ ہے — وطن ہے باغ تو پھر باغباں کا رشتہ ہے

وطن سے دور رہیں یا وطن میں بس جائیں　　یہ مہرباں سے کسی مہرباں کا رشتہ ہے

صبیحہ صبا کا سب سے اہم موضوع ہماری سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی، اس کے مسائل و مصائب کے حوالے سے ہے یہاں بھی ان کا انداز ایک دردمند دل رکھنے والے ذی روح کا سا ہے:

یقین رکھ سبھی منظر بدلنے والے ہیں　　قدم ملا کے سبھی ساتھ چلنے والے ہیں
ستم کو سہہ کے کہاں تک رہے گی خاموشی　　یہی وہ لوگ جو طوفاں میں ڈھلنے والے ہیں
انہیں تو دھوپ بھی پگھلا نہیں سکتی　　کسی کی یاد کے صحرا میں جلنے والے ہیں
ذرا سی ہمت و جرأت سے کام لینا ہے　　ہمارے سر سے یہ طوفان ٹلنے والے ہیں

صبیحہ صبا الفاظ سے تصویر کشی کرتی ہیں اور جس ماحول میں سانس لے رہی ہیں اور معاشرے کی جو تصویر دیکھتی ہیں اسے اپنے داخلی جذبات اور احساسات کی روشنی میں جلا دے کر قرطاس پر بکھیر دیتی ہیں۔

کسی بھی شاعر کا مطالعہ کیجئے اس کے ہاں ذات ہے یا کائنات، ہر شاعر نے اپنا کینوس خود بنایا ہے جو کہیں چھوٹا ہے کہیں بڑا۔ اس قدر و قیمت کا انحصار شاعر کی فکر اور اس کے علم پر ہے۔ صبیحہ صبا کو شروع سے ایک استوار فکر ملی۔ مرد شاعری کرتے ہیں تو ان کو بھی اپنی ذات میں جھانکنا پڑتا ہے۔ صبیحہ صبا نے بھی من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پایا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

99/J-1,WAPDA.TOWN,LAHORE
PAKISTAN
03334254489

نام کتاب: جب موت ذبح کر دی گئی
صنف : ناول
مصنف : نقشبند قمر نقوی بخاری
سن اشاعت: ۲۰۱۵ء
قیمت : تین سو پچاس روپے
رابطہ : ۶۴۴۶ ایس۔انڈین اپولیز بلیس تولسا، او کے ۷۴۱۳۶۔یو۔ایس اے

نام کتاب :مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار
صنف : تنقید
مصنف : ارشاد آفاقی
سن اشاعت :۲۰۱۵ء
قیمت : تین سو نوے روپے
رابطہ : ارشاد آفاقی
رام پورہ، بانڈی پورہ کشمیر

- **اعتراف**
- **شہناز رحمٰن**

مابعد جدید افسانہ اور محمد حامد سراج

ابتدا سے لے کر اب تک اردو افسانے کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو مختصر افسانے نے بے شمار رنگ بدلے۔ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری کی رومانیت پسندی کے بعد پریم چند کے ذریعہ قائم ہونے والی روایت نے اردو افسانے کو ارتقا کے منازل سے گزارا اور اردو افسانے کے منظر نامے پر کرشن چند، منٹو، بیدی، عصمت اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ جیسے فنکاروں کا ظہور ہوا جن کی تحریروں کے فیض سے اردو افسانے کو عروج حاصل ہوا۔ جب تقسیم ہند کے المیہ نے دونوں ملکوں کے ادیبوں کو منتشر کر دیا تو اسی کشمکش اور افراتفری نے کچھ عرصے کے بعد جدیدیت کو ایک غالب رجحان کی شکل میں فروغ دیا۔ لیکن جلد ہی جدید افسانوں کے ابہام اور خشک بیانیے سے قاری اکتانے لگا اور ایک قسم کا خلا پیدا ہو گیا۔

۱۹۸۰ کے بعد جو نسل سامنے آئی اس نے ترقی پسندی اور جدیدیت کے مثبت پہلوؤں سے استفادہ کر کے افسانہ نگاری کی ایک صحت مند روایت قائم کی اور جدید دور کے مسائل کو زیادہ سے زیادہ جذب کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سائنس اور ٹکنالوجی کی پیدا کی ہوئی سہولیات کے مضر اثرات، انٹرنیٹ کی پھیلائی ہوئی افراتفری، دہشت گردی، فرقہ پرستی، مذہبی انتہا پسندی جیسے عام موضوعات کو افسانے کے قالب میں ڈھال کر موثر پیرائے میں پیش کیا۔ جس میں افسانہ نگار کے غم و غصہ کے اظہار کے بجائے سچویشن کی زیریں لہریں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں، جس میں کہانی پن، کردار، اور قابل فہم زبان و بیان کے ساتھ ساتھ نقطہ نظر بھی موجود ہے۔ اردو افسانے کی تنقید میں ''مابعد جدید افسانہ'' کا ذکر بڑی شدت سے کیا جا رہا ہے، اس سلسلے میں ''ادب کا بدلتا منظر نامہ'' (مرتبہ: گوپی چند نارنگ) میں شامل سید محمد اشرف، شوکت حیات، طارق چھتاری کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ یہ مضامین خود تخلیق کاروں کے بیان پر مشتمل ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے مابعد جدید افسانے کی بحث کو سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ:۔

کیا جو افسانے جدیدیت کے بعد لکھے گئے وہی دراصل مابعد جدید ہیں؟

یا پھر مابعد جدید افسانے کے کچھ فنی اور لسانی خصوصیات ہیں؟

جدیدت کے بعد لکھنے والوں میں با عتبار موضوع اور مواد وہ افسانہ نگار کون کون ہیں جن کی تحریریں مابعد جدید اصطلاح پر پوری اترتی ہیں؟

مابعد جدید افسانوں پر گفتگو کرتے ہوئے سب سے پہلے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی کہ جدیدیت کے بعد لکھا جانے والا ہر افسانہ مابعد جدید ہے، بلکہ جن افسانوں میں اسلوبیاتی سطح پر زبان سلجھی ہوئی ہو، قاری اور متن کے مابین افہام وتفہیم کا سلسلہ ہو، نہ کہ محض مہملیت کا احساس، افسانہ میں کہانی پن کے عنصر کی بازیافت پر اصرار اور افسانہ کی اپنی فکری بساط ہو، کسی بھی نظریہ کی پابندی اور جبر سے آزاد ہو۔ اور جہاں تک مواد کی بات ہے تو افسانہ میں موجودہ مسائل اور پیچیدگیوں، مقامی رسوم واقدار کو زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہو۔ شوکت حیات کے لفظوں میں مابعد جدید افسانہ کی تعریف ملاحظہ ہو۔

> ''مابعد جدید افسانہ وہ تخلیقی صنف ہے جس میں بیک وقت فکر، استدلال، لاشعور، تحت الشعور، شعور، ڈلبریشن، واردات، تکنیک، ہیئت، اسلوب، ادراک، وژن رچے بسے اور گھلے ملے ہوتے ہیں۔ غالباً اسی لیے تمام تخلیقی اصناف میں اس صنف کا آج کی زندگی اور لازوال زندگی کے تناظر میں بیش قیمت رول اور اہمیت تسلیم کرنا پڑتی ہے۔'' (مابعد جدید افسانہ، شوکت حیات، مشمولہ ادب کا بدلتا منظر نامہ مرتبہ: گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی دہلی ۲۰۱۱، ص ۱۲۳)

مابعد جدید افسانہ کی خصوصیات پر یوں تو بہت سی تحریریں موجود ہیں مگر تجزیاتی انداز میں افسانوں پر پورے اصولوں کے ساتھ اس طرز کی تحریریں بمشکل ہی ملتی ہیں جس طرح جدید افسانوں کے علٰحیدہ علٰحیدہ تجزیے ''نیا اردو افسانہ: انتخاب، تجزیے اور مباحث (مرتب: گوپی چند نارنگ) میں جمع کیے گئے تھے۔ طارق چھتاری نے اپنے مضمون میں بڑی حد تک اس کمی کو پر کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے ترقی پسند اور جدید افسانے کا تجزیہ کر کے ان کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے مابعد جدید افسانہ کی داخلی صورت کو سمجھنے اور اس کی شناخت متعین کرنے کی کوشش کی ہے اس ضمن میں وہ ساجد رشید کے افسانہ ''ملزم'' سے اقتباس نقل کر کے چند لفظوں کے ذریعے پیش کی گئی مکمل جزئیات نگاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مابعد جدید افسانے کے تفہیم کی ایک صورت یہ بتائی کہ:

> ''مابعد جدید افسانے میں موجودگی سے زیادہ غیاب کی اہمیت ہے کیوں کہ غیاب ہی وہ خلا ہے جسے پر کرتے وقت قاری فتح کا احساس کرتا ہے اور کہانی میں پوری طرح involve ہو جاتا ہے۔'' (ص، ۹۲۳۔ ایضاً)

مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں ہم عصر افسانے کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مابعد جدید افسانے کی نکھری ہوئی صورت ساجد رشید، انور خاں، علی امام نقوی، نیر مسعود، سلام بن رزاق، شموئل احمد، شوکت حیات، طارق چھتاری، عبدالصمد، مظہر الزماں خاں، وغیرہ کے یہاں موجود ہیں۔ مذکورہ بالا ناموں میں اور بھی اضافے کیے جا سکتے ہیں جن کے افسانوں کے تعبیر وتجزیہ کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن بعض افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جو افسانے کی ہیئت میں سنجیدگی سے تجربے کر رہے ہیں اور گراں قدر تخلیقات سے ادب کے ذخیرے میں اضافہ کر رہے ہیں لیکن ابھی تک نقادوں کی توجہ ان کی طرف نہیں گئی کیوں کہ صارفیت کے اس دور میں تنقید بھی ذاتی تعلق کا شکار ہونے لگی ہے اور نقاد جذباتی لگاؤ کی خاطر غیر واجب قرض چکانے کی طرف گامزن ہے۔ بہر حال محمد حامد سراج اردو فکشن کا ایک ایسا نام ہے جن کے تین افسانوی مجموعے (وقت کی فصیل، برائے فروخت، چوب دار) شائع ہو کر قارئین میں مقبول ہو چکے ہیں۔ محمد حامد سراج نے ۹۰ کی دہائی سے لکھنا شروع کیا ان کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سارے واقعات اور کردار ارد گرد کی زندگیوں سے مستعار لے کر اپنے تخلیقی ذہن سے انھیں افسانے کی زبان دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں سماجی عوامل سے آنکھیں چار کرنے کے ساتھ فرد کی تنہائی اور اس کے درد کا بیان بھی موجود ہے جو مابعد جدید افسانہ کی بنیادی شناختوں میں سے ایک ہے۔ ان کے افسانہ کے موضوعات میں عالمی سطح پر پھیلی ہوئی بدامنی، بے چینی، انتشار، جارحیت، الیکٹرانک میڈیا کا یلغار، گلوبلائزیشن اور سائنسی معلومات وغیرہ غالب پہلو ہیں۔ خالد قیوم تنولی نے اپنے مضمون ''محمد حامد سراج: درد کا ہمدرد قصہ گو'' میں ان کے موضوعات کے دائرے کا چند سطروں میں اختصار و جامعیت کے ساتھ احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''محمد حامد سراج کے فنی محاسن ان کی تصنیفات میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں اور ہر ایک پر جدا جدا مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ یہ خوبیاں ہیں: ذو لسانیت کی مدد سے تخلیقی اثر آفرینی، کرداروں کی خانگی اور سماجی زیست کا پر اثر نقشہ، دیہی اور شہری معاشرت کے تضادات، ذہنی اور کرداری حرکیات کا اظہار، چرند پرند، نباتات، جمادات اور حیوانوں کی بے زبانی کو زبان دینا، تصوف روحانیت اور سائنسی موضوعات کے درمیان سے نہایت مشاقی سے گزرنے کا وطیرہ، داستانوی تحیر، عالم سیاسات پر موثر طنز، لطیف جنسی نفسیات کی گتھیوں کو سلجھانا، اسلوبیاتی ارتقا سے واقفیت اور ساتھ ساتھ اردو افسانے کو رومانویت کے جمال سے مالا مال کرنا، دیانت دارانہ دلچسپی سے کیے گئے مطالعے کے بعد قاری ان محاسن سے لاعلم نہیں رہ سکتا۔'' (مجموعہ حامد سراج، ص: ۱۰)

افسانہ ''زمین زاد'' مصنف کے سائنسی اور مذہبی شعور کا نادر نمونہ پیش کرتا ہے۔اس افسانہ میں میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سائنسدانوں نے اگر چہ سیاروں تک کو مسخر کر لیا مگر زمین کے علاوہ کہیں سکون رنگا رنگی اور زندگی کی رمق موجود نہیں ہے۔اسے مندرجہ ذیل اقتباس کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے جب افسانے کے کردار باہم گفتگو کے دوران زمین کی مختلف خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''وہی کرہ ارض اچھا تھا.....ہوا ، پانی ، بادل ،انسان ، جانور ،محبتیں ،نفرتیں ،جھگڑے ،خوشیاں ،رونقیں میلے بہاریں.....یہ جو اس بسیط و عریض کائنات میں اربوں کہکشائیں بکھری ہیں ہم ان کو اپنی مختصر عمر کے ساٹھ ستر سال کے پیمانے میں نہیں کھوج سکتے.....ناممکن.....ہمیں بس زمین پر ہی رہنا چاہیے۔(مجموعہ حامد سراج ،سنگ میل پبلیکیشنز لاہور،۲۰۱۳،ص:۸۸)

اسی طرح افسانہ ''گلوبل ویلج'' جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے غلط استعمال پر ایک لطیف طنز ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو خیر کے کاموں کے لیے بروئے کار لانے کے بجائے تباہی و بربادی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔اس مسئلہ کو افسانہ نگار نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے بم سے پیدا ہونے والی افراتفری کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ایک ماں اپنے بچے کی بہتر پرورش و پرداخت اس امید پر کرتی ہے کہ وہ بڑا ہو کر قوت بینائی کی نعمت سے محروم افراد کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔مگر سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد جب وہ دنیا کو شعور کی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو پوری دنیا ویران نظر آتی ہے لہٰذا وہ گرم سلائیاں آنکھوں میں پھیر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔افسانے کا اختتام مایوس کن صورت حال پر ہوتا ہے۔چند سطریں ملاحظہ ہوں:۔

''زمین پر بڑے بڑے ہولناک گڈھے اس بات کا ثبوت تھے کہ پورا کرہ ارض ایٹمی جنگ کی لپیٹ میں رہا ہے۔اسے کہیں کسی آبادی کا نشان نہ ملا۔ہولناک سناٹا تھا۔وہ سوچتا رہا یہ کیا ہے.....؟ خوف کے رتھ پر سوار جب اس نے پورے کرہ ارض کا چکر مکمل کر لیا تو سوچنے لگا.....

یہ سب وہ ہے جو ہمارے آباواجداد نے ہمارے لیے کاشت کیا۔

اسے بس ایک جگہ ایسی مخلوق نظر آئی جسے انسان نہیں کہا جا سکتا تھا وہ تھور اور کانٹے دار جھاڑیاں کھا رہے تھے۔

وہ ان کے پاس پہنچا اور پوچھا۔

''تم کون لوگ ہو.....؟''

''ہم اس کرہ ارض پر بسنے والی انسانی مخلوق کی آخری باقیات میں سے ہیں اور وہ کاٹ اور کھا رہے ہیں جو ہمارے آباواجداد نے کاشت کیا۔''

وہ الٹے پاوں ہانپتا کانپتا سفر کی صعوبتیں جھیلتا بستی میں پہنچا۔بستی کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔

''کوئی خبر.....؟'' ان کے بے نور چہروں پر سوال تنے تھے۔

''خبر ہے.....!

کیا.....؟''

''میں نے اپنی آنکھوں میں گرم سلائی پھیر لی.....!'' (ص:۴۶۔ایضاً)

حامد سراج کے افسانے تجریدیت اور ابہام کی فیشن زدگی سے پاک ہیں اس لیے ادب کے سنجیدہ قارئین نے ان کی تحریروں کا پر تپاک خیر مقدم کرتے ہوئے مثبت رائیں دی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ''صریر''،''فنون''،''تسطیر''،''حریم ادب''،''جدید ادب''،''ادبیات''،''بادبان''،''آئندہ''، ''سمبل''،''تجدید نو''،''روشنائی'' اور دیگر متعدد جرائد میں شائع ہوئے۔اس کے علاوہ ہندوستان سے شائع ہونے والے ادبی رسائل ''شعر و حکمت'' (مدیر۔ڈاکٹر مغنی تبسم)،''شاعر'' (مدیر۔افتخار امام صدیقی) اور ''ثالث'' (مدیر اعزازی۔اقبال حسن آزاد) وغیرہ میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔

حامد سراج کے افسانوں میں کردار نگاری سے زیادہ سچویشن کی طرف توجہ ملتی ہے۔اگر عمیق نظری سے مابعد جدید افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر افسانے ایسے ملیں گے جن میں کرداروں کے اعمال سے زیادہ گرد و پیش کے احوال کا تجزیہ ملتا ہے،لیکن اس عہد کے دوسرے افسانہ نگاروں اور حامد سراج کے افسانوں کی اس یکسانیت کو تقلید یا بھیڑ چال کا نام نہیں دے سکتے بلکہ وقت اور حالات کے تقاضوں نے اس طرح کی ادب پاروں کو فروغ دیا ہے۔لیکن ایسا نہیں کہ ان تقاضوں کے سامنے افسانہ مکالمہ سے عاری ہو کر قاری کے لیے چیستاں بن جائے۔جیسا کہ حامد سراج کے افسانے ''گھڑی ،سمت اور سوئیاں'' کے مطالعے اور تجزیے سے سمجھا جا سکتا ہے۔اس افسانے میں وقت کے نشیب و فراز اور سرعت کو واضح کرنے کے لیے افسانہ نگار نے چیزوں (گھڑی کی سوئیاں،سائیکل اور گاڑی کے پہیے ،سونے اور جاگنے کے اوقات متعینہ) کو الٹا چلتے ہوئے دکھایا ہے۔اس سچویشن کو گرفت میں لینے کے لیے آزاد تلازمہ کا سہارا لیا ہے اور افسانے کا راوی واحد حاضر ہے جس کے نمونے اردو افسانے میں بہت کم ملتے ہیں کیوں کہ واحد غائب اور متکلم کے مقابلے حاضر کے صیغہ میں لکھنا اور اس کو بخوبی نبھا لینا مشکل امر ہے۔حامد سراج ترقی پسندوں اور جدیدیوں کی طرح موضوع و مواد یا فارم و تکنیک میں سے کسی ایک کی برتری قبول نہیں کرتے بلکہ بقدر ضرورت دونوں کے اتحاد سے افسانے کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔جس کی بہترین مثال ''گھڑی ،سمت اور سوئیاں'' میں پیش کردہ موضوع اور برتی گئی تکنیک سے ملتی ہے۔ایک فرد کے ذاتی مشاہدہ کے ذریعہ موجودہ معاشرے کی لامرکزیت کی تصویر قاری کے سامنے پیش کی گئی ہے جس میں اشکال کی گنجائش نہیں،چیزوں کا الٹا چلنا اگر چہ سامنے کا استعارہ ہے کہ ہر چیز کا بنا بنایا تصور بے معنی ہو رہا ہے۔مگر اس استعارہ میں سطحی عمومیت نہیں ہے بلکہ

موقع محل کی مناسبت نے استعارہ اور واقعہ کو ہم آہنگ کر کے بامعنی بنا دیا ہے۔

حامد سراج چونکہ کرداروں کی تعمیر پر اتنی توجہ صرف نہیں کرتے اسی لیے بعض افسانوں میں کچھ لغزشیں سرزد ہو گئیں ہیں، کرداروں کی شخصیت، ان کے علم و فضل، سماجی و خاندانی پس منظر کے مطابق مکالمے ادا کرانا کردار نگاری کی بنیادی شرط ہے۔ لیکن بعض جگہوں پر حامد سراج وفور جذبات میں اس اصول سے تجاوز کر گئے ہیں مثال کے طور پر افسانہ ''عادت ہی بنالی ہے'' کا واحد متکلم راوی پاکستان کا شہری ہے اور تلاش معاش کے لیے کویت کی گلیوں میں در بدر پھر رہا ہے۔ کسی دوکان سے پاکستانی موسیقی کی آواز راوی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، چنانچہ کیسیٹ کی خرید و فروخت کے دوران لبنانی لڑکی فاطمہ کے جاذب نظر چہرے اور شہد آمیز باتوں سے راوی اس کا اسیر ہو جاتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والے مکالمے میں راوی کا فصیح اللسان ہونا عقل کی منطق پر پورا اترتا ہے کیوں کہ اس کا تعلق اہل زبان کی سرزمین پاکستان سے ہے۔ لیکن فاطمہ کے بیان پر مصنف کے اسلوب کی پرچھائیں صاف نظر آتی ہے کیوں کہ چند سطر پہلے راوی نے اس بات سے باخبر کیا تھا کہ فاطمہ اردو ٹھیک طرح نہیں بول سکتی تھی۔ اور کچھ دیر بعد اس انداز گفتگو کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے:۔

> ''یہ ہمیشہ تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا۔ یہ میں نے بڑی محنت اور محبت سے تمہارے لیے ریکارڈ کی ہیں۔ مجھے خبر نہیں محبت کیا ہوتی ہے لیکن اجنبی تمہیں میں نے اپنے دل کے قریب محسوس کیا ہے۔ اگر رات گئے اچانک آنکھ کھلنے پر کسی کی یاد بے ساختہ کا نام محبت ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اگر روشنیوں کے شہر میں انسانوں کے درمیان گزرتے ہوئے اچانک چونک چونک جانے کا نام محبت ہے تو مجھے تم سے محبت ہے۔ اجنبی کسی کی یاد میں آنکھیں موتی پرونے لگیں اور ہتھیلیاں سلگنے لگیں تو اسے کیا کہتے ہیں۔ میں نے تمہیں ہر لمحہ محسوس کیا ہے۔ شاید اجنبی تم اپنے پاکستان جا کر مجھے بھول جاو.....وہ شدت جذبات میں سب کچھ کہہ گئی.....'' (مجموعہ برائے فروخت، محمد حامد سراج، ص:۲۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے ایسی صاف و شفاف زبان ایک اہل زبان ہی ادا کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس افسانے میں تکذیب بیان کا عنصر موجود ہے۔ لیکن صورت حال کی نزاکت سے راوی کی سحر بیانی قاری کو اس طرح گرفت میں لی لیتی ہے کہ اس خامی کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ اس کے علاوہ دوسرے افسانوں میں بھی زبان اور سچویشن پر حامد سراج کی مضبوط گرفت کو دیکھا جا سکتا ہے، جو قاری کی توجہ کشید کرنے کے ساتھ ساتھ تاثر کو بھی دوبالا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ وارث علوی نے اپنے ایک مضمون میں افسانے میں صورت حال کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

''تاثر زبان کے زور پر نہیں بلکہ صورت حال کے بیان کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے اور زبان صورت حال کے المیہ اور طربیہ طنزیہ اور مزاحیہ، ہولناک اور مضحکہ خیز پہلوؤں کی جب گرفت کرتی ہے تو بڑے نشیب و فراز سے گزرتی ہے آہنگ کا زیر و بم پیدا ہوتا ہے اور حقیقت نگاری کی صلابت، Irony کی کاٹ افسردہ نغمگی اور المناک ظرافت کا فشار زبان کو ایک تخیلی تجربہ میں بدل دیتا ہے۔'' (بت خانہ چین۔ وارث علوی، ص:۹۳۵)

بیانیہ اور description پر حامد سراج کی مضبوط گرفت کا اندازہ ان کے افسانے ''لرزیدہ لمحوں کا تاوان''، ''برائے فروخت''، ''شور بہت کرتا تھا'' کے مطالعہ سے سامنے آتا ہے۔ برائے فروخت میں موجودہ دور میں ادبی تخلیقات کی بے وقعتی اور ذاتی مفاد کے مضمرات پر گہرا طنز کیا گیا ہے۔ ان افسانوں میں صورت حال اور واقعہ ایک دوسرے کے لازم ملزوم معلوم ہوتے ہیں، مابعد جدید افسانے میں کہانی پن کی واپسی کے بڑے چرچے ہوئے مگر اس کا انداز ابتدائی دور کے افسانوں کی طرح کہانی کے آغاز، نقطہ عروج اور اختتام والی تکنیک کو نہیں برتا گیا ہے بلکہ سابقہ مفروضات سے گریز کر کے قاری کے ذوق مطالعہ اور توقعات کے مطابق کہانی پن کو دوبارہ واپس لایا گیا۔ لہٰذا نئی نسل کے جدت طبع کا ہی نتیجہ ہے کہ حامد سراج کے ہر افسانے میں سچویشن کی تبدیلی سے ایک نئی کہانی وجود میں آجاتی ہے جیسا کہ ''عادت ہی بنالی ہے'' میں افسانے کا بنیادی محرک بے روزگاری ہے لیکن چند سطروں کے بعد دوسرا مسئلہ سامنے آجاتا ہے، قاری کے ذہن میں بنیادی نقطے کے ساتھ فاطمہ کا واحد متکلم راوی سے جدا ہو جانا افسانے کے غالب پہلو کی صورت میں نقش ہو جاتا ہے۔

اسی لیے شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانے کے فنی خدوخال میں تبدیلی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

> ''آج کا فن کار جدیدیوں کے مقابلے بعض چیزوں پر زیادہ زور دیتا ہے بعض چیزوں پر کم.....جن چیزوں میں آج کا فن کار جدیدیوں سے ذرا مختلف معلوم ہوتا ہے ان میں ایک تو یہ ہے کہ جدیدیوں کو تجربے کا شوق زیادہ تھا اور اسی اعتبار سے ابہام کو وہ لوگ بالارادہ بھی اختیار کر لیتے تھے۔ آج کا فن کار تجربے کی طرف اتنا راغب نہیں ہے اور ابہام کو وہ ارادی طور پر اختیار نہیں کرتا۔ اگر چہ ترقی پسندوں جیسی وضاحت اور دو اور چار والی منطق کو بھی مسترد کرتا ہے۔'' (جدیدیت آج کے تناظر میں، شمس الرحمٰن فاروقی، شب خون، ص ۱۷۶)

حامد سراج کے افسانوں میں زبان و بیان کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ان کے افسانے کا راوی داخلی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے اپنی مدعا کو استعاروں کے اوٹ میں رکھتا ہے جس سے قاری کے اندر ارتعاش جنبش اور زندگی جینے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ اور زندگی سے دردمندی کا رویہ صاف واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ

انسانی ہمدردی ان کے افسانے کا خاصہ ہیں۔ان کے اسلوب کی دوسری خصوصیت جگہ جگہ ضرب الامثال یا مشہور جملوں کا استعمال، کرداروں کی زبان سے کسی شاعر کی نظم یا کسی شعر کا کوئی ٹکڑا، بعض جگہوں پر آیات قرانی اور مذہبی قصوں کے حوالے وغیرہ ملتے ہیں۔اس ضمن میں ''گلوبل ویلج''، ''نقش گر''، ''زمین زاد''، ''مرصع آئینے'' ''لوٹایا ہوا سوال'' قابل ذکر ہیں۔افسانہ نگار کی ایک خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگاری کی روایت کو جذب کرنے اور ہر نسل کے بہترین تجربوں سے کسب فیض اٹھانے کی کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ڈنگ، اوریگان، وغیرہ کے کردار اپنے زمینی، تہذیبی اور ثقافتی جڑوں سے ذہنی اور جذباتی طور پر وابستہ نظر آتے ہیں۔

مابعد جدید افسانہ نگار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے وہ افسانے کی تاریخ، روایت و تسلسل سے شعوری یا لاشعوری طور پر وابستہ رہنا چاہتا ہے چنانچہ حامد سراج کے یہاں بھی یہ کوشش موجود ہے۔لیکن اس سفر میں ان کا قلم لغزش کا شکار نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کا کوئی افسانہ کسی مخصوص نظریہ کا تابع ہوتا ہے بلکہ نہایت ہی فنکاری سے وہ افسانے کی رومان انگیز فضا کو اپنے قابو میں کر لیتے ہیں جس کے ڈانڈے عہد حاضر کے اتفاقات سے آملتے ہیں۔''اکتوبر کے آخری دن''، ''نصف مکمل'' وغیرہ قابل ذکر افسانے ہیں۔

خلاصہ بحث یہ کہ موجودہ عہد کے افسانوں کا مطالعہ و تجزیہ کرتے ہوئے کچھ خامیوں کے باوجود مثبت نتائج سامنے آتے ہیں جس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ افسانہ نگار تمام نظریاتی بندشوں کو توڑ کر کھلی فضا میں طبع آزمائی کر رہا ہے۔جس میں حامد سراج ایک اہم نام ہے جن کے افسانے احساس کی شدت، بیان کی سادگی و ندرت اور تجربات و مشاہدات کی گہرائی و گیرائی کے منفرد نمونے ہیں۔اور کائنات کے اس وسیع و عریض طلسم کدے کی ہر معمولی و حیرت افزا سچائی کو افسانہ کی ہیئت میں ڈھال کر شاہکار بنانے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے۔''میا'' (اگر چہ یہ خاکہ ہے مگر انداز افسانوی ہے) اس کی بہترین مثال ہے۔ان کا تخلیقی عمل سماجی، سیاسی، نفسیاتی اور سائنسی غرض کہ ہر سطح پر روشن ہے مگر وہ کسی بھی پہلو کو اپنا ازم نہیں بناتے اور یہ کشادگی افسانے کے لیے یقیناً خوشگوار ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Room No. 14 Abrar Hostal
S.N. Hall AMU Aligadh 202002
Mob: 9458537513 shahnaz58330@gmail.com

نام کتاب	:	نئی صدی کے افسانے		
مرتب	:	پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ	سال اشاعت :	۲۰۱۵ء
قیمت	:	پاکستان چار سو اسی روپے بیرون ملک آٹھ ڈالر		
رابطہ	:	پروگیسو اردو رائٹرز گلڈ لاہور پاکستان ای میل۔puwguild@gmail.com		

● یاد رفتگاں

● منیر احمد فردوس

کرچی کرچی خواب

ایک ایسے دیوانے ادیب کا احوال جو قاری کے اندر کو آنکھیں عطا کر دے گا

شہر سے امن کی تمام فاختاؤں کو یرغمال بنا کر چاروں طرف دہشت کی فصیل کھڑی کر دی گئی تھی اور خوف کا دیو ہیکل عفریت اپنے پنجے شہر بھر میں گاڑھ چکا تھا۔لوگ ڈر کے مارے سہم گئے تھے اور کاروبارِ زندگی مفلوج ہو چکا تھا۔دہشت کے لشکر گلی کوچوں میں دندناتے پھر رہے تھے اور زندگی سانسوں کی بقا کے لئے چھپتی پھر رہی تھی۔دہشت گردی نے شہر کو یوں لپیٹے میں لیا کہ زندگی کے ہر شعبے کی طرح شہر کے اہلِ قلم بھی خوف کے مارے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔شہر سرِ شام ہی شہرِ خاموشاں کا نظارہ پیش کرنے لگتا تھا۔شاید تمام لوگ اس دہشتناک منظر میں اسیری کا سمجھوتہ کر چکے تھے مگر بھرے شہر میں ایک جواں ہمت نوجوان ایسا بھی تھا جو اس خوفناک منظر میں سانس نہیں لینا چاہتا تھا۔قلم قبیلے کا وہ تازہ فکر شاعر شہر اور لوگوں کے دلوں پر لفظ کی حکمرانی کا خواہشمند تھا۔شہر کی اس وحشتناک صورتِ حال نے اس کے اندر شدید بے چینی بھر دی تھی اور وہ ہر صورت شہر پر چھائی دہشت کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا تھا۔اُس کے خیال میں ادیب حالات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے قلم سے حالات کو متاثر کرتا ہے۔یہی منشور لے کر وہ میرے پاس آیا تھا۔اس نے کہا تھا کہ ''میں ہر اتوار کو ایک مقامی اخبار کے دفتر میں جاتا ہوں جہاں شہر کے کچھ اور شاعر بھی آتے ہیں اور ایک چھوٹی سی نشست ہوتی ہے، تم بھی آیا کرو۔'' پہلے تو میں نے خراب حالات کے پیشِ نظر ٹال مٹول سے کام لیا مگر اس کی تڑپ اور فکر نے مجھے آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔آنے والی اتوار کو میں بھی اس محفل کا حصہ تھا۔جہاں کچھ سینئر شعرا موجود تھے۔پھر اس نوجوان کی کوششوں سے وہاں ہر اتوار کو شعرا کی تعداد بڑھنے لگی۔جب تقریباً شہر بھر کی ادیب برادری اس چھوٹی سی جگہ میں پوری طرح سما گئی ہے تو اس نوجوان کی تجویز پر ہی اس اکٹھ کو ڈیرہ رائٹرز گلڈ کا نام دے کر ایک ادبی پہچان دے دی گئی تھی۔میں اس کے جذبے اور کوششوں پر دم بخود تھا کہ کس طرح سے اس نے جنگل میں منگل کر دکھایا تھا۔ڈیرہ اسماعیل خان کے اس

باکمال نوجوان کا نام نور احمد ناز تھا۔ جس پر صرف ناز ہی کیا جا سکتا ہے۔ گردن تک غربت کی دلدل میں دھنسا ہوا وہ ایک سچا اور کھرا تخلیق کار تھا۔ جس کا اوڑھنا بچھونا صرف ادب تھا۔ وہ ہر وقت ادبی تحرک چاہتا تھا۔ جمود اس کی نظر میں تخلیق اور تخلیق کار کی موت تھی۔ وہ ایسا دلیر انسان تھا کہ ایک ہی وقت میں دو دو محاذوں پر لڑ رہا تھا۔ یعنی ادبی اور غریبی کا محاذ۔ اور دونوں محاذوں کا وہ ایک فاتح انسان تھا۔

میری اس سے پہلی ملاقات شاید 1999 میں ہوئی تھی اور اس ملاقات کا سہرا ڈیرہ کے ادبی منظر نامے میں ہلچل مچا دینے والا میرا ایک مزاحیہ شخصی خاکہ تھا، جو کہ مرحوم پروفیسر نذیر اشک صاحب پر لکھا گیا تھا۔ جب وہ مجھ سے ملا تو میرے اس شخصی خاکے کے قصیدے بھی گاتا جاتا اور مسکراتا بھی جاتا تھا۔ اس وقت محلّہ ٹوئیاں والا میں اس کی ٹافیوں کی چھوٹی سی دکان تھی، جہاں بیٹھ کر وہ سانسوں کی بقا کی جنگ لڑنے میں مصروف رہتا تھا۔ میں جب بھی اس کی دکان پر جاتا تو وہ ہمیشہ ایک مخصوص مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا کرتا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر کچھ نہ کچھ پڑھتا اور لکھتا بھی رہتا تھا اور اکثر وہ اپنا تازہ کلام بھی سنا دیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ نور احمد ناز کے مالی حالات ایسے ہیں کہ وہ بیچارہ روز کنواں کھودتا ہے اور روز پانی پیتا ہے۔ مگر اس کے چہرے کا اطمینان اور خود اعتمادی دیکھنے والے کو مغالطے میں ڈال دیتی تھی کہ اتنا اچھا لکھنے والا تازہ فکر شاعر غربت ایسی دلدل میں بھی دھنسا ہوا ہو سکتا ہے۔ پھر اکثر اس سے ملاقاتیں رہنے لگیں۔ زیادہ تر شام کے بعد شہر کے معروف جمیل ہوٹل پر خوب محفلیں جمنا شروع ہو گئی تھیں، جہاں کچھ نوجوان ادیب جمع ہو جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نور احمد ناز اپنی ذات میں بہت متین، سنجیدہ اور کم گو انسان تھا، جس کے مزاج میں بھی کافی سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ بس ہوٹل پر ہونے والی خوش گپیوں سے وہ خوب محظوظ ہوتا رہتا اور ہنستا رہتا تھا۔ شاید یہ 2000 کی بات ہے جب جمیل ہوٹل پر ہی نور ناز اور نظم گو شاعر خوشحال ناظر نے مل کر قاصر ادبی فورم کا خواب دیکھا تھا اور جب سینئرز سے صلاح مشورہ کیا تو اس کے قیام کے عمل میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے قاصر ادبی فورم جیسی ملک گیر ادبی تنظیم کا کامیاب اجرا ہو گیا، جس کا وہ جنرل سیکریٹری بھی رہا۔ اس فورم کے قیام کے بعد ڈیرہ میں ایک ایسا خوبصورت ادبی کارواں ترتیب پا گیا، جس سے شہاب صفدر، طاہر شیرازی، سعید اختر سیال، کرنل خالد اور خورشید ربانی جیسے شعرا نے ملکی سطح پر اپنی پہچان بنائی کی۔ اور اس شہرت کی جڑیں نور ناز کے دل کی زمین میں ہی کہیں پیوست تھیں، جہاں سے قاصر ادبی فورم کا خمیر اٹھا تھا۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے قاصر ادبی فورم نے اوپر تلے کئی بڑے بڑے ادبی معرکے سر کیے۔

اتنا سنہرا اور خوبصورت دور دیکھنے کے بعد یک لخت ہی منظر بدل گیا تھا۔ قاصر ادبی فورم کو کسی کی

نظر لگ گئی تھی۔ کچھ اندرونی خلفشار اور ملکی سطح پر ہونے والی ایک سازش سے قاصر ادبی فورم ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، جس کے غم نے نور ناز کو بہت غمزدہ کر دیا تھا اور ہوٹل پر جمنے والی محفلوں کی بساط لپیٹ دی گئی تھی۔ پھر کبھی کبھار وہ اور میں چہل قدمی کرتے کرتے چھوٹے بازار میں واقع ایک ہوٹل پر چائے پینے جایا کرتے تھے، جہاں بیٹھ کر خوب باتیں ہوتی تھیں۔ قاصر ادبی فورم کے ٹوٹنے کا اسے بہت دکھ تھا، جس کا وہ اکثر ذکر کیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور دکھ بھی اس کے اندر تک اتر چکا تھا جب کل پاکستان مشاعرہ میں اسے پڑھنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا اور اس دکھ نے اس کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ ٹوٹ کے بکھرنے والا انسان نہیں تھا۔ میں اس کے حوصلے اور جذبے کی جوانمردی پر حیران تھا۔ میں نے اس میں یہ خوبی دیکھی کہ وہ مشکل حالات میں اور بھی ڈٹ کر کام کرنے کا عادی تھا۔ تمام دکھوں کو بھلا کر وہ ادب کی خدمت کے کچھ اور ہی راستے کھوجنے میں لگا ہوا تھا۔ اس دوران OCS جیسی عام سی ایک کوریئر سروس میں اس کی نوکری لگ گئی تھی۔ مشکلات میں گھر کر حالات سے لڑائی لڑنے والا نور ناز جب اس کوریئر میں داخل ہوا تو اس وقت اس سروس کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ شاید وقت نے بھی یہ فیصلہ لکھ دیا تھا کہ عام سی اس کوریئر سروس کی شہرت کی جنگ صرف نور ناز ہی لڑ سکتا تھا۔ اسے شکست دینے آسمانوں سے گرم موسموں کے لشکر اترے مگر وہ بھی اس کی ہمت کے گواہ بن گئے جب نور ناز شدید گرمی کے دنوں میں بھی پسینے میں شرابور کالا بیگ لٹکائے سائیکل چلاتا شہر کے مختلف کونوں میں دکھائی دینے لگا۔ میرا اور اس کا کبھی کبھار ٹکراؤ ہو جاتا تو وہ عجلت میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ میری طرف اچھالتا ہوا آگے نکل جایا کرتا تھا۔ وہ بلا کا محنتی انسان تھا اور شہر بھر کی سڑکیں وہ فضول میں نہیں ماپ رہا تھا، حقیقت میں وہ OCS کی کامیابی کا نقشہ ترتیب دینے میں لگا ہوا تھا اور پھر سب نے دیکھا کہ اس کی انتھک محنت رنگ لائی اور OCS جیسی معمولی کوریئر کے لئے اس نے ایسا کامیاب نقشہ ترتیب دے ڈالا کہ TCS اور لیپرڈ کوریئر جیسی کامیاب سروسز کے ساتھ OCS کا نام بھی لیا جانے لگا۔ اس دوران اس کی ادبی پیاس اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ ایک ادبی رسالہ نکالنے کا سوچ رہا تھا، اور وہ یہ خواہش لے کر میرے پاس آیا تھا۔ میں اس کی بات سن کر حیران سا اسے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا کہ نور یار! یہ سب کس طرح کرو گے؟ اس پر تو بہت خرچہ آتا ہے، کیا تمہارے حالات اس کی اجازت دیتے ہیں؟ اس نے کہا ''منیر! تم اس کی فکر مت کرو۔ بس تم میرا ساتھ دو'' اس کے جذبے اور ارادوں پر سوائے حیران ہونے کے میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ جیسا سوچ لیتا تھا، کر گزرتا تھا، چاہے کوئی اس کا ساتھ دیتا یا نہ دیتا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کوشش اور لگن سے برگِ نو جیسے ادبی جریدے کا کامیاب اجرا ہو گیا تھا اور وہ شاعر کے ساتھ ساتھ اب مدیر بھی بن چکا تھا۔ برگِ نو کے غالباً وہ تین شمارے

کامیابی کے ساتھ لے آیا تھا۔

اس کا معاملہ بھی بہت عجیب تھا۔ وہ جوں جوں کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا جاتا تھا، کٹھنائیاں اور دشواریاں اسے ڈھونڈنے لگتی تھیں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ شاید تیسرے شمارے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ وہ ایک بڑے حادثے سے دوچار ہو گیا۔ اس کا بزرگ علیل باپ اپنی ذمہ داریوں کی گٹھڑی اس کے مضبوط کاندھوں پر ڈال کر خود اس دنیا سے چپ چاپ رخصت ہو گیا تھا۔ اِس حادثے نے نورناز کو اندر سے ہلا کر پھر سے زیرو پوائنٹ پر لا کے ضرور کھڑا کر دیا تھا مگر وہ ٹوٹا نہیں تھا۔ ایسا مضبوط انسان میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ٹھوکر کھا کر مسکرا دیا کرتا تھا۔ اپنے چہرے سے، باتوں سے، اپنی چال ڈھال سے اس نے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ کیسی کیسی مشکلات میں ہر وقت پھنسا رہتا ہے۔ اس نے اف نہ کرتے ہوئے قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ اپنے باپ کی ذمہ داریوں کی گٹھڑی اٹھائی اور زندگی کی ڈگر پر پھر سے خوشیوں کی تلاش میں چل پڑا۔ اس کی زندگی بھی عجیب تر تھی، جو پتہ نہیں کہاں کہاں سے اس کے لئے نت نئے امتحان ڈھونڈ کر لے آتی تھی اور نورناز کا حوصلہ بھی کمال کا تھا کہ جس نے زندگی سے کبھی بھی کوئی شکوہ شکایت نہیں کی تھی، وہ اسے اپنی خودداری اور مسکراہٹ سے شکست دینے کا ہنر جانتا تھا۔ باپ کا سایہ چھننے کے بعد ایک اور کڑا امتحان اس کا منتظر تھا۔ OCS میں اس کے کچھ مخالفین اس کے خلاف ایک منظّم سازش ترتیب دے چکے تھے، جس کے نتیجے میں اسے نوکری سے ہاتھ دھونے پڑ گئے تھے۔ ایک بار پھر وہ بیروزگاری کے ہاتھوں یرغمال ہو چکا تھا۔ یہ دور اس کی زندگی کا مشکل ترین دور تھا جس نے اس کے ہاتھ سے قلم چھین کر گارہ اور اینٹیں تھما دی تھیں۔ وہ محنت مزدوری کرنے لگا تھا۔ زندگی نے اسے جس منظر میں کھڑا کیا، اس نے سرِ تسلیم خم کیا۔ وہ ایسا شاکر اور تابعدار انسان تھا کہ اس نے زندگی کے دیئے ہوئے کسی بھی منظر سے انکار نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی تین چھوٹی بہنوں اور بوڑھی ماں کا اب واحد سہارا ہے۔ اس کی بہنوں نے اپنی آنکھوں میں امیدوں کے کچھ جہان بنا رکھے تھے، جنہیں نورناز بھانپ چکا تھا۔ اس لئے وہ چپ چاپ زندگی کی انگلی تھامے بس چلا جا رہا تھا، وہ جہاں جہاں اسے لیے جا رہی تھی۔ اپنے گھر والوں پر وہ خود کو قربان کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ پھر ایک بار سرِ راہ ملاقات کے دوران مجھے اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس نے اپنا ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ باہر سے سامان لا کر بیچا کرتا تھا۔ کبھی کبھار آتے جاتے راستے میں ہی نورناز سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اس دوران میری نثری نظموں کی کتاب چھپی تو میں اسے بطورِ خاص اپنی کتاب دینے گیا۔ وہ چھٹی ڈال کر بہت پرتپاک انداز میں ملا اور میری کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بار بار انگنت مبارکیں دیں۔ ایک بند دکان کے تھڑے پر کافی دیر تک بیٹھ کر ہم نے گپ شپ

لگائی۔ باتوں باتوں میں اس نے اپنی کتاب چھپوانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا، جس پر میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اس دوران دو تین بار وہ میرے دفتر بھی آیا تھا اور ایک بار عورت کے موضوع پر لکھی ہوئی نظم بھی مجھ سے کمپوز کروانے آیا تھا، جو آج بھی میرے کمپیوٹر میں محفوظ ہے۔

پھر نظم گو شاعر خوشحال ناظر اور نورناز کی ہی کوششوں سے ستارۂ ادب فورم کا قیام عمل میں آ گیا تھا اور نورناز کو فورم کا نائب صدر نامزد کیا گیا تھا، مگر کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر آنا جانا اسے ادبی سرگرمیوں سے دور لے گیا۔ مشاعروں میں اس کی شرکت بہت کم ہو گئی تھی اور میں اس کی کمی شدت سے محسوس کرتا تھا، جس کا اظہار میں اکثر خوشحال ناظر سے کیا کرتا تھا۔ اور پھر اچانک اس کے گردوں کی بیماری کی خبر بجلی بن کر گری۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی بیماری خطرناک حد تک بڑھ گئی اور اسے اسلام آباد جیسے مہنگے ترین شہر میں علاج کے لئے جانا پڑا۔ جب میں نے نورناز کو فون کیا تو اس کی بہن نے فون اٹھایا مگر وہ بات کہاں کر رہی تھی، وہ تو رو رہی تھی اور بس روتی جا رہی تھی، اس کی بیماری کی وجہ سے وہ غم سے اتنی نڈھال تھی کہ اس سے بات تک نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے صرف اتنا کہا کہ بھائی منیر..... میرے شہزادے بھائی کے لئے دعا کرو، اس کی حالت بہت خراب ہے۔ میں نے فوراً اس کی بیماری کی خبر فیس بک پر لگائی اور دوستوں سے دعا کی گذارش کی۔ ساتھ ہی اسلام آباد میں مقیم اپنے دوستوں حمزہ حسن شیخ اور خورشید ربانی سے گذارش کی کہ وہ جا کر نورناز کی خبر گیری کریں۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ اس کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ کچھ دنوں بعد میں نے نورناز کو فون کیا تو اس نے خود بات کی۔ اس کی آواز سن کر مجھے بہت تسلی ہوئی۔ میں نے اسے کہا کہ نور یار، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، مالی امداد یا کچھ بھی تو بلا جھجک مجھے کہنا، مجھ سے جو بن سکے گا، ضرور کروں گا۔ مگر میں اس کی خودداری اور اس کے مضبوط اعصاب پر حیران ہوا جا رہا تھا۔ وہ اپنے لہجے سے کہیں سے بھی شکستہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بس اس نے بار بار یہی کہا کہ منیر بھائی، بس مجھے صرف دعا چاہئے، پلیز میرے لئے دعائیں کرتے رہنا۔ اس کے بعد بھی ایک دو بار اس سے فون پر بات ہوئی، اس نے بدستور دعاؤں کی درخواست کی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ستارۂ ادب فورم کے پروگراموں میں اس کے لئے خصوصی دعائیں کی گئیں۔ پھر پتہ چلا کہ نورناز اسلام آباد سے علاج کروا کے گھر لوٹ آیا ہے۔

وہ جاڑے کی ایک سرد شام تھی، جب میں اس سے ملنے اس کے گھر گیا۔ وہ رضائی اوڑھے ہوئے تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ اس کی قمیض کی ایک دو جگہوں پر خون کے معمولی دھبے دکھائی دے رہے تھے اور کمزوری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ نقاہت کی وجہ سے کبھی کبھی ٹوٹ جاتا تھا۔ مگر میں اس باہمت اور حوصلہ مند

انسان کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی باتوں سے، لہجے سے اور حرکات وسکنات سے شائبہ تک نہیں ہوا کہ وہ آپریشن جیسے مراحل سے گزر کر آیا ہے اور ایک جان لیوا بیماری سے زندگی موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بلکہ اس کا موضوع وہی ادب ہی تھا۔ مجھ سے بار بار معذرت کرتا رہا کہ میں نائب صدر ہونے کے باوجود فورم کے پروگراموں میں شرکت نہیں کر پا رہا ہوں۔ کہتا تھا منیر یار! میں ایک بار ٹھیک ہو جاؤں پھر دیکھنا کہ ستارۂ ادب کا ستارہ کہاں کہاں چمکتا دکھائی دے گا۔ میں اس کی باتیں سن کر اور اس کے ارادے دیکھ کر حیران تھا۔ پھر کچھ ہفتوں بعد ایک دن میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ مجھے سعید اختر سیال کی طرف سے ایک ایس ایم ایس ملا کہ نور ناز کو ڈائیلائسز کے لئے دو بوتل +AB خون کی اشد ضرورت ہے۔ میں نے فوری طور پر خون کے عطیہ کے لئے ایک میسج بنا کے فورم کے سب ارکان کو بھیج دیا اور دوستوں کے جواب کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ مگر انتظار طول پکڑتا چلا گیا اور چاروں طرف دل دکھا دینے والی خاموشی چھائی رہی۔ کسی دوست کی طرف سے کوئی بھی جواب نہ آیا۔ شاید کسی نے بھی کوئی مثبت یا منفی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا تھا، سوائے ایک ممبر کے کہ جس نے معذرت کے ساتھ لکھا تھا کہ اس کا خون مطلوبہ گروپ سے میل نہیں کھاتا۔ اس مایوسی نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا اور میں فوراً دفتر بھاگا۔ دفتر پہنچ کر سب سے پہلے میں نے نور ناز کو فون کر کے پوچھا کہ خون کا بندوبست ہوا کہ نہیں؟ تو اس کی نحیف اور نہایت مایوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی کہ ابھی کوئی بندوبست نہیں ہوا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ نور گھبراؤ مت، خون کا بندوبست ابھی ہو جائے گا۔ میں نے اپنے دفتر میں کوششیں شروع کر دیں تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے میرے دفتر میں تین دوست مل گئے جن کا مطلوبہ گروپ تھا اور وہ خون دینے کے لئے بھی تیار تھے۔ میں نے فوراً نور ناز کو فون کی تو اس وقت وہ گھر سے ہسپتال کے لئے نکل رہا تھا۔ اس نے کہا کہ صرف ایک بوتل خون کا بندوبست ہوا ہے اور ایک کی اب بھی ضرورت ہے۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا نور! پریشان نہ ہو، تمام بندوبست ہو گیا ہے۔ اس کے بعد میں نے فوراً اپنے ایک دوست کو خون کے لئے ہسپتال بھیج دیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو نور ناز خود اس سے ملا اور کہا کہ بھائی دو بوتل خون کا انتظام ہو گیا ہے اور میری طرف سے منیر کا شکریہ ادا کر دینا۔

ڈائیلائسس کے ایک دن بعد میں نے نور ناز کو میسج کر کے طبیعت پوچھی تو اس نے کہا کہ میں اب کافی بہتر ہوں۔ مجھے بڑی تسلی ہوئی۔ اس دوران نادک سائنس کالج میں ہونے والے مشاعرے میں اس کی صحت یابی کے لئے خصوصی دعا کی گئی۔ اس کی بیمار پرسی کے لئے میں کسی مناسب وقت کی تلاش میں تھا۔ 14 جنوری 2013 کو میں اپنے دفتر میں کام میں مصروف تھا۔ صبح 10 بجے سعید اختر سیال کی طرف

سے ایک میسج موصول ہوا۔ میں نے معمول کا میسج سمجھ کر جب موبائل پر نظر ڈالی تو یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا اور میری آنکھوں میں اندھیرے بھر گئے۔ مجھے اس میسج پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میسج ایک بار پھر پڑھا، پھر پڑھا، پھر پڑھا، مگر اس کا ایک ہی متن تھا کہ نور احمد ناز اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ میرے اندر ہلچل سی مچ گئی اور میں نم آنکھوں کے ساتھ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اچانک میرا موبائل بج اٹھا۔ نمناک آنکھوں سے دیکھا تو نور ناز کا نمبر جھلملا رہا تھا۔ میں نے حیران ہو کر فوراً فون اٹینڈ کیا مگر خدا کی پناہ...اس کے گھر جو کہرام مچا ہوا تھا، وہ میرے اندر کے کہرام سے کہیں زیادہ تھا۔ اس کی چھوٹی بہن فون پر دھاڑیں مار مار کے روتی جا رہی تھی۔ میں نے کئی بار ہیلو ہیلو کہا مگر وہ تو اپنے ہوش کھو چکی تھی۔ میرے حواس بھی جواب دینے لگے۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں غم سے نڈھال اس روتی دھوتی اپنی معصوم بہن سے کیا بات کروں؟ کیسے اسے تسلی دوں؟ اس نے روتے ہوئے مجھ سے صرف اتنا کہا: منیر بھائی! ہمارا شہزادہ بھائی فوت ہو گیا ہے۔'' اس کے بعد فون بند ہو گیا۔ مگر مجھے میری کوئی خبر نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں۔ میں اپنے حواس میں نہیں تھا۔ جب ہوش آیا تو میری آنکھیں بھری ہوئی تھی۔ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی ٹوٹے دل کے ساتھ نور ناز کی وفات اور جنازے کا میسج تیار کر کے سب دوستوں کو بھیج دیا۔ سائنس کالج میں رات 9 بجے نم آنکھوں کے ساتھ اس کا آخری دیدار کیا۔ اسے دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ابدی نیند سویا ہوا ہے، اس کے چہرے کا سکون اور اطمینان بتاتا تھا کہ وہ بس ابھی اٹھ بیٹھے گا۔ ڈوبتے دل کے ساتھ اس عظیم اور خوددار انسان کی نمازِ جنازہ ادا کی اور اسے زمین کے حوالے کر کے خود اداسیوں کے قافلے کے ہمراہ گھر لوٹ آیا۔

اے ناز! ہمیں آپ کی خدمات اور ادب دوستی پر ہمیشہ ناز رہے گا۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند کرے اور خاص طور سے آپ کے گھر والوں کو صبر جیسی عظیم دولت نصیب کرے جو آج بھی آپ کی جدائی کے صدمے سے باہر نہیں نکل سکے۔

آخر میں نور احمد ناز مرحوم کی وفات کے موقع پر لکھی گئی میری ایک نظم پیشِ خدمت ہے:

یادوں کا مسافر

(نور احمد ناز کی ناگہانی موت پر)

وہ چٹان صفت سا ایک شخص
جس کی آخری سانس تک
اس کے پاؤں کے نقش کے لیے
دشوار راستے اسے کھوجتے رہے

مگر کٹھنائیوں کے انگنت لشکر
اُس کے حوصلوں کی فلک بوس دیوار سے خائف
بے سود سر پٹختے رہے
اور پاش پاش ہوتے رہے
ناز کمانے کا عادی وہ دلیر شخص
خاموشیوں کی زرہ پہن کر
زندگی کے محاذ پر تنہا لڑتا رہا
وقت کے دامن پر
وہ اپنی شجاعتوں کی اتنی طویل داستان لکھ گیا
کہ جسے پڑھتے پڑھتے
زندگی کی سانسیں بھی کم پڑ گئیں
وہ ایسا فاتح بن کر اپنے اندر سے رخصت ہوا
کہ اجل بھی ہاتھ ملتے رہ گئی۔

◂◂ ● ▸▸

Noble Town Near Jamiya Eidgah Kalan
PO Sadar Bazar Dist: Dera Ismail Khan
Khair Pakhtun Khah (KPK) Pakistan
Mail ID: mafirdows@yahoo.co.in
Cell No. (0092) 3339973550

نام کتاب	:	دوائے دردِ دل
شاعر	:	معین الدین درد لکھنوی مرحوم
مؤلف	:	عبدالصمد تپشؔ
قیمت	:	ایک سو پچاس روپے
سن اشاعت	:	۲۰۱۵ء
رابطہ	:	عبدالصمد تپشؔ نیو کالونی نزد تین محلّہ بیگو سرائے۔۸۵۱۲۰۱

• تبرک

نور احمد ناز

سوچوں میں اضطراب ہے تنہائیاں بھی ہیں
اس کاروانِ شوق میں رسوائیاں بھی ہیں

ہل چل مچی ہوئی ہے مسلسل فضا میں آج
پر دل کے اس پڑاؤ میں رعنائیاں بھی ہیں

کہتے تھے وہ اہلِ خرد غم گسار شوق
اس بزمِ اضطراب میں شہنائیاں بھی ہیں

مشعل بجھا کے فیصلے کا اذن دے دیا
چاہو تو اس مقام پر پسپائیاں بھی ہیں

پتھر گرے ہیں آج بھی آنگن میں چار پانچ
بیری پہ ناز وقت کی پرچھائیاں بھی ہیں

◂◂ ● ▸▸

سات سُروں میں درد رچا ہے تیرے بن
کچھ یوں دل کا ساز بجا ہے تیرے بن

سبز رتوں کے ٹھنڈے میٹھے موسم میں
دل کتنا بے زار رہا ہے تیرے بن

تارا تارا تیری باتیں ہوتی ہیں
چاند ادھر خاموش کھڑا ہے تیرے بن

تجھ سے مل کر اکثر یہ احساس ہوا
دنیا میں کیا خاک پڑا ہے تیرے بن

◂◂ ● ▸▸

نور احمد ناز

کچھ نہ کچھ کی خواہش میں بے نوا ہوئے ہم لوگ
لا علاج موسم میں لا دوا ہوئے ہم لوگ

غم گسار لوگوں نے دل کو یوں جلا ڈالا
بے امان لمحوں میں بے ردا ہوئے ہم لوگ

مختلف ہوئے کتنے اختلاف کرنے پر
قافلے سے بچھڑے تو جا بجا ہوئے ہم لوگ

ناز بے یقینی کے بے غلاف لمحوں میں
اپنی گونج میں چھپ کر بے صدا ہوئے ہم لوگ

◂◂ ● ▸▸

دل سراپا بے بسی ہونے کو ہے
چار سو اک خامشی ہونے کو ہے

ان دیوں کو گُل بھی ہونا ہے ابھی
ہر طرف گو روشنی ہونے کو ہے

موت سے بھی بڑھ کے کہتے ہیں جسے
تیری میری زندگی ہونے کو ہے

کالے کالے گیسوؤں کے فیض سے
شام دل کی سرمئی ہونے کو ہے

سبز رُت کے آخری ہفتے میں ناؔز
پانچ سالہ دوستی ہونے کو ہے

◂◂ ● ▸▸

عرفان ستار

جو ہو خود ایک تماشا وہ بھلا کیا سمجھے
میری حالت تو کوئی دیکھنے والا سمجھے

مجھ میں آباد ہے اک شہر، ترے حُسن کا شہر
وہ جو باہر سے مجھے دیکھے وہ تنہا سمجھے

مجھ سے ممکن یہ نہیں ہے کہ میں کھل کر کہہ دوں
اس کے بس میں یہ نہیں ہے کہ اشارہ سمجھے

آہ ایسی، کہ سنے کوئی تو سمجھے نغمہ
اشک ایسا، کوئی دیکھے تو ستارا سمجھے

ٹھیک ہے دشت بھی ہوں، باغ بھی ہوں، دریا بھی
جس کو جیسا نظر آؤں مجھے ویسا سمجھے

لفظ پردہ ہیں، اسے کاش بتا دے کوئی
اس کو سمجھائے کہ سمجھے، مرا لہجہ سمجھے

بس یہی ہے جو میسّر ہے مرے قرب کے ساتھ
جو مرے دل میں بسے وہ اِسے دنیا سمجھے

سانحہ کر کے سنایا تھا اُسے رنجِ فراق
سن کے بس اتنا کہا اُس نے کہ ''اچھا سمجھے''

دل کسی حرفِ ملائم سے سنبھل بھی جاتا
میرے سینے میں اچھلتا ہے بگولا، سمجھے؟

وصل سے اِن کے نمو پاتی ہے اک کیفیت
کوئی الفاظ و معانی کا یہ رشتہ سمجھے

اتنا دشوار ہوں کیا میں جو کسی پر نہ کھلوں؟
کوئی تو ہو جو مجھے میرے علاوہ سمجھے

ابھی سمجھو تو میں کیا خوب سخن تم سے کروں
بعد میرے مجھے سمجھے بھی تو پھر کیا سمجھے

تو سمجھتا ہے اُسے، شکر بجا لا عرفاؔن
وہ جسے دیر نہ کعبہ، نہ کلیسا سمجھے

◂◂ ● ▸▸

عرفان ستار

یونہی اپنے آپ میں مبتلا، مری ساری عمر گزر گئی
مجھے جس کا ڈر تھا وہی ہوا، مری ساری عمر گزر گئی

کئی غم زدوں کے تھے قافلے، کئی دلبری کے تھے سلسلے
میں کسی کی سمت نہیں گیا، مری ساری عمر گزر گئی

کبھی سلتے سلتے اُدھڑ گیا، کبھی بنتے بنتے بگڑ گیا
کوئی مجھ کو شکل نہ دے سکا، مری ساری عمر گزر گئی

جو بڑی اٹھان کا شخص تھا، عجب آن بان کا شخص تھا
وہی شخص مجھ میں بکھر چکا، مری ساری عمر گزر گئی

کسی ماہ وش کی نگاہ میں، کسی خانقاہ کی راہ میں
یونہی در بہ در، یونہی جا بہ جا، مری ساری عمر گزر گئی

مرا اختیار نہیں میں تھا، میں تلاشِ نانِ جویں میں تھا
کوئی لمحہ اپنا نہیں جیا، مری ساری عمر گزر گئی

مری حرفِ غم کی سیاہ تھی، کبھی آہ تھی، کبھی واہ تھی
یہی شور مجھ میں رہا بپا، مری ساری عمر گزر گئی

کئی ناشنیدہ خیال تھے، مرے پاس کتنے سوال تھے
مگر اس سے قبل کہ پوچھتا، مری ساری عمر گزر گئی

میں تلاشِ شہرِ دگر میں ہوں، میں ازل سے ایک سفر میں ہوں
میں کسی بھی گھر میں نہیں رہا، مری ساری عمر گزر گئی

مرا اصل عینِ شہود تھا، کہ میں خود ورائے وجود تھا
نہ خودی ملی، نہ خدا ملا، مری ساری عمر گزر گئی

مرا اور ہی کوئی طور تھا، مرا ایک اپنا ہی دور تھا
مرا دور مجھ کو نہیں ملا، مری ساری عمر گزر گئی

مرے اپنے جوگ بجوگ تھے، نہ یہ شہر تھا، نہ یہ لوگ تھے
سو میں خود میں چھپ کے پڑا رہا، مری ساری عمر گزر گئی

مری کج نوشت عبارتیں، مری کم وفور عبادتیں
کوئی کام ٹھیک نہ کرسکا، مری ساری عمر گزر گئی

میں اسیرِ بادۂ عشق تھا، میں فقیرِ جادۂ عشق تھا
میں گزر چکا، میں گزر گیا، مری ساری عمر گزر گئی

ہر اک انجمن میں پڑھے گئے، مرے شعر خوب سنے گئے
مرا غم کسی نے نہیں سنا، مری ساری عمر گزر گئی

میں ہوں آپ اپنا شریکِ غم، مجھے اعتراف بہ چشمِ نم
مرا حق نہ مجھ سے ہوا ادا، مری ساری عمر گزر گئی

مری اُن صفات کا کیا بنا، مرے ممکنات کا کیا بنا
میں کہاں گیا، مرا کیا بنا، مری ساری عمر گزر گئی

مرا اختتام قریب ہے، تو نئی غزل کا نقیب ہے
سو تری ہوئی یہ سخن سرا، مری ساری عمر گزر گئی

کہیں ہو نہ جاؤں میں رائگاں، کہیں ہو نہ جاؤں میں رائگاں
یہی خوف دل میں رہا سدا، مری ساری عمر گزر گئی

◂◂ ● ▸▸

114- Jack Monkman Cres.
Markham, Ontario, L3S 4T5, Canada

ڈاکٹر ارمان نجمی

فضائے شب کی نہ مہتاب کی حکایت ہے
یہ گرد راہ میں گم خواب کی حکا یت ہے
بساط گل ہو کہ سرو رواں کی قا مت ہو
یہ رنگ و نور زرِ آب کی حکایت ہے
سنا رہا ہوں میں ہوش و حواس میں لیکن
یہ نیند اڑاتے ہوئے خواب کی حکایت ہے
بہا کے لے گیا کشتی کو ایک ریلے میں
یہ بند توڑتے سیلاب کی حکا یت ہے
فقیرِ خاک نشیں کی سنو کہ اس کے پاس
شکستِ خانہ و اسباب کی حکا یت ہے
خود اس نے فیصلہ لکھ کر قلم کو توڑ دیا
یہ کس کے چہرۂ زرتاب کی حکایت ہے
رقم کیا ہے جو لہجے کی تلخ کامی نے
رگوں میں جذب مئے ناب کی حکایت ہے
ڈبو کے جو مجھے ساحل پہ بے نشان ہوئی
یہ کیسی مو جۂ پایاب کی حکایت ہے
ملا ضرور مگر ہاتھ ہی نہیں آیا
یہی تو گوہر نایاب کی حکایت ہے

◂◂ ● ▸▸

وہ سیرابی کے ساحل پر ملا تھا پیاس کی حد تک
رہا اس کا تعلق شدتِ احساس کی حد تک
وطن میں لوٹ کر کب اس نے میری خیریت پوچھی
ہمارے درمیاں جو کچھ بھی تھا بن باس کی حد تک
یہ مٹی ہی کچھ ایسی ہے جہاں اگتی ہے ویرانی
نمو کا دائرہ پھیلا ہے سوکھی گھاس کی حد تک
یہاں سے کھل بھی سکتا ہے کوئی امید کا رستہ
تھکے بیٹھے ہوئے کیوں ہو ہجومِ یاس کی حد تک
امانت میں خیانت کو نہ بہکے دست و پا میرے
پہنچ جاتا میں اس کے گوہر و الماس کی حد تک
دمِ آخر بھی دروازے کو تکتی ہی رہیں آنکھیں
اکھڑتی سانس کا تھا ساتھ ٹوٹی آس کی حد تک
وہ اب اپنے گھرانے سے الگ پہچان رکھتے ہیں
وراثت کا نشاں کچھ بھی نہیں بو باس کی حد تک
یہاں انصاف اک خانہ پری کا نام ہے گویا
عدالت کے کرشمے دیکھئے اجلاس کی حد تک
کناروں پر، تو اس کے اہل ثروت کا اجارہ ہے
یہ دریا کب پہنچتا ہے عوام الناس کی حد تک

◂◂ ● ▸▸

Peeli Kothi ,Sabzi Bagh, Patna- 4
Mob.+919835401490

شمسی قریشی

وہ تخت و تاج بھی رکھ کر کسے پسند رہا
میں قتل ہو کے بھی دنیا میں سربلند رہا

امیر چشم حقارت میں اپنی بند رہا
غریب لمحہ بہ لمحہ نیاز مند رہا

ہماری ناؤ تھی منجدھار میں یہ سچ ہے مگر
ہمارا حوصلہ پہلے سے بھی دو چند رہا

یہ بات کہنے کی بس ہے سنو کچھ اور نہیں
نہ دردمند ہے کوئی نہ دردمند رہا

جہاں بھی دیکھو غزل کا ہے بس فسوں ہی فسوں
کہیں نہ بند رہا اب کہیں نہ چھند رہا

ہمیشہ ہم کو مٹانے میں شہر تھا مصروف
سدا وجود ہمارا مگر دو چند رہا

تمام لوگ وسائل میں خود کفیل رہے
رہا جو کوئی تو شمسی میں بے کمند رہا

◂◂ ● ▸▸

At: Usmanpur PO-Jalalpur
Dist - Ambedkar Nagar (U.P)

ڈاکٹر سلیم محی الدین

آئینوں سے دھول مٹانے آتے ہیں
کچھ موسم تو آگ لگانے آتے ہیں

نیند تو گویا ان آنکھوں کی دشمن ہے
مجھ کو پھر بھی خواب سہانے آتے ہیں

ان آنکھوں میں رنگ تمہارے کھلتے ہیں
یہ موسم کب پھول کھلانے آتے ہیں

رونا ہنسنا، ہنسنا رونا، عادت ہے
ہم کو بھی کچھ درد چھپانے آتے ہیں

شبنم شبنم خواب اترتے ہیں مجھ پر
سو سو سورج دھوپ اُگانے آتے ہیں

جسم دکاں ہے، ذہن بکاؤ شہروں میں
جنگل تو دو چار دوانے آتے ہیں

◄● ►

شعر کے ہجے تو کیجے پھر اثر کا سوچنا
کیا کہیں کیسے کہیں ہے عمر بھر کا سوچنا

ہر مسافت تو ہتھیلی پر لکھی ہوتی نہیں
پاؤں رکھنا گھر سے باہر تب سفر کا سوچنا

فرش ہو پیروں تلے، سر پر بھی ہو چھت کا نشاں
تب تو کچھ واجب لگے، دیوار و در کا سوچنا

ہر کہانی میں کوئی تو موڑ ہوتا ہے ضرور
کب تلک کردار کے زیر و زبر کا سوچنا

کالے پتھر پر میاں جو کالی چیونٹی دیکھ لے
اس کے آگے کیا نظیریں کیا نظر کا سوچنا

لفظ سچے، دل بھی سچا، تجربہ سچا سلیمؔ
کیا ضروری ہے میاں پھر، یہ رات بھر کا سوچنا

◄● ►

Associate Professor &
H.O.D Urdu Sri Shivaji
College.Parbhani-431401

احمد عرفان

سانس لیتی ہوئی حیات کا دکھ
بانٹ سکتا ہوں کائنات کا دکھ

تم کبھی پوچھنا پرندوں سے
زرد ہوتے شجر کے پات کا دکھ

غمِ دوراں کے سب حصار میں ہیں
کون بانٹے گا میری ذات کا دکھ

ہار بیٹھا ہوں اپنے آپ سے میں
کھائے جاتا ہے خود سے مات کا دکھ

خاکِ کرب و بلا پہ آج تلک
نقش ہے دجلہ و فرات کا دکھ

دن کا غم بھی اٹھاؤں گا احمدؔ
ابھی لاحق مجھے ہے رات کا دکھ

◄● ►

جب رات کے آنگن سے نکلتا ہوا دن ہے
پھر کس لیے غمگین یہ ڈھلتا ہوا دن ہے

پہلے تو مرے سر پہ کوئی رات کھڑی تھی
اب دھوپ کی شدت سے پگھلتا ہوا دن ہے

اک رات کہ آتی ہے کسی یاد کی صورت
اور درد کہ جیسے یہ مچلتا ہوا دن ہے

ہر سمت سے لپکے ہیں مرے آگ کی زد کی
کس جرم کی پاداش میں جلتا ہوا دن ہے

شانوں پہ کئی بوجھ اٹھائے ہوئے احمدؔ
گرتا ہوا کھائی میں سنبھلتا ہوا دن ہے

◄● ►

احمد عرفان

نزولِ عشق کی وحشت کا کیا کیا جائے
چلو یہ چاکِ گریباں بھی اب سِیا جائے

یہ بات بات پہ آنسو چھلک کے آتے ہیں
وفورِ چشمِ تمنا پہ دم کیا جائے

میں اپنی آنکھیں بھی اس در پہ چھوڑ آیا ہوں
خراج میں اسے اب اور کیا دیا جائے

ضرورتوں کو تو پورا میں کر نہیں سکتا
ضرورتوں کے بنا کس طرح جیا جائے

بہت طویل مسافت تھی زندگی احمؔد
زمیں کی گود میں دم بھر کو سو لیا جائے

◂◂ ● ▸▸

6122 164st Fresh Meadows
Queens NY 11365 USA..
17186647772

ذکی طارق

خوابوں میں بھی آ کر کوئی سر کاٹ رہا ہے
بچوں کو فسادات کا ڈر کاٹ رہا ہے

گونجے تھے بزرگوں کے کبھی قہقہے جس میں
اُس اُجڑی حویلی کا کھنڈر کاٹ رہا ہے

آثارِ قدیمہ سے اُسے خوف ہے اتنا
ہر نقش بہ اندازِ دِگر کاٹ رہا ہے

یہ دل ہے کہ ہے درد کا صحرائے لق و دق
ہر لمحہ مجھے میرا ہی گھر کاٹ رہا ہے

وہ بے سروساماں تھے مگر لے گئے سبقت
کاندھوں پہ مِرا رختِ سفر کاٹ رہا ہے

جو پر ابھی پرواز کے لائق بھی نہیں تھے
سفّاک شکاری وہی پر کاٹ رہا ہے

احساس کی یہ کون سی منزل ہے خدایا
ڈستا ہے مجھے دشت تو گھر کاٹ رہا ہے

سائے کو ترس جائیں نہ جلتے ہوئے رستے
دیکھو جسے طارقؔ وہ شجر کاٹ رہا ہے

◂◂ ● ▸▸

564 -Kela Road Gaushala
Phatak, Ghaziabad-201009 (U.P)
India M.:9818860029

● صدیق عالم

جس دن شاعر کا مزار بنا

جس دن شاعر کا مزار بنا
اس دن بہت سارے لوگ پھول چڑھانے آئے
ایک کتّا بھی آیا جو خوامخواہ بیٹھا رہا
کچھ لوگ جنہوں نے شاعر کا عروج دیکھا تھا
اس کے زوال سے متاثر نظر آئے
کچھ لوگوں نے
کہ شاعر کو انہوں نے کبھی نہ سنا تھا
اس کے گیت گانے آئے
آئے کچھ لوگ کہ پڑوسی تھے
رشتے دار تھے، دکاندار تھے
کچھ لوگ ثواب کمانے آئے
وہ دین کی آڑ میں بڑے عیار تھے
ایک عورت برقعہ پوش آئی
اسے پھاٹک پر روک دیا گیا
ایک عورت بغیر برقعے کے آئی
اسے بھی پھاٹک پر روک دیا گیا
ہماری تاریخ میں عورت
ہمیشہ پھاٹک پر روک دی جاتی ہے
کچھ لوگ نماز پڑھ کر چلتے چلتے پہنچ گئے
ان کی آنکھیں سنگین تھیں

کچھ کہ انہوں نے دھوپ میں بال سفید کیا تھا
ان کی مونچھیں رنگین تھیں
کچھ کو چھوڑ چکے تھے ان کے بچے
کچھ نے بچوں کو چھوڑ دیا تھا
اور کچھ بچوں سے گھرے ہوئے پریشان تھے
کچھ سرگوشیوں کے سبب دکھائی دیئے
کچھ خاموشی کے سبب نظر آئے
ایک چیل کہ اونچی شاخ پر بیٹھی تھی
بلاوجہ چیخ پڑی
گورکن ابلا ہوا آلو کھانے گھر لوٹا
دور کہیں کوئی گھنٹی بجی
شاید کسی اسکول کی گھنٹی یا اسٹیشن کی
دونوں میں کس قدر مشابہت ہے!
یا شاید کسی مندر یا چرچ کی گھنٹی
دونوں ایک دوسرے سے کس قدر الگ ہیں!
جس دن شاعر کا مزار بنا
اس دن دنیا میں کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا
اس دن دہشت گرد خاموش رہے
فرقہ پرستوں نے منھ بند رکھا
شئیر کے بھاؤ اپنی جگہ پر رہے
اور حادثوں میں مرنے والے اور دنوں کی طرح مرے
ایسا لگ رہا تھا
ہمیشہ کی طرح یہ کائنات
خدا کے بغیر چل رہی تھی
جس دن شاعر کا مزار بنا

اس دن ایک بوڑھے نے
ایک ڈرم کے اندر بیٹھ کر اپنے غائب ہونے کا نسخہ آزمایا
مگر جب کسی نے اس کی غیر موجودگی کا نوٹس نہ لیا
تو وہ ڈرم سے باہر نکل آیا
اور لوگوں نے دیکھا اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں
یہ دیکھ کر کہ آخر کار
لوگوں نے اسے دریافت کر لیا تھا
جس دن شاعر کا مزار بنا
اس دن اس دنیا میں
مزید تین ہزار تین سو ترپن شاعر پیدا ہوئے

◂◂ ● ▸▸

کائنات کا دائمی مسخرہ

پیڈرو، وہ یوں ہی سا ایک انسان تھا
اور بلاوجہ مارا گیا
لوگوں نے جب اس کے لیے زمین کھودی
اس کے اندر
ایک دوسرے شخص کی ہڈیاں اسی ترتیب سے رکھی تھیں
جس ترتیب سے قدرت نے اسے بنایا تھا
پیڈرو، اسکولوں میں اب بچے نہیں گاتے
انھیں فصل کاٹنے کے کام پر لگا دیا گیا ہے
اب جو بچی ہے
وہ ہے ایک لق و دق بنجر کائنات
پیڈرو، تم کہا کرتے تھے چاند شروع سے ہی راستہ کھو بیٹھا ہے
مگر ایک دن اسے صحیح جگہ پہنچنا ہے

پیڈرو!
تم اپنی بیکار کی امیدوں پر زندہ رہے
تم نے بدرووں سے آنکھیں گیلی کیں
اور دیوار کے سرد دل پر گتھے ہوئے شیشوں سے زخم کھائے
پیڈرو مجھے اپنے زخم دکھاؤ
تم میرے خواب میں بلاوجہ کیوں در آتے ہو؟
اب ہم لوگ روشنی کی باتیں نہیں کرتے
یوں بھی سب کچھ پیچھے چھوٹ چکا ہے
پیڈرو بھی پیچھے چھوٹ چکا ہے
وہ جو بغض وعناد کی تصویر تھا
اور ٹکڑا ٹکڑا سب کچھ حاصل کر لیا کرتا
ہاں وہی پیڈرو
وہی، اچانک دن کی روشنی میں تلملا جانے والا پیڈرو
اپنے سے نامطمئن پیڈرو، مقدار میں ہمیشہ کم پیڈرو
ہمارے مندمل ہوتے زخموں کو کھرچنے والا پیڈرو
ہمارے دروازے پر بے وقت دستک دینے والا پیڈرو
پیڈرو!
پیڈرو!
کائنات کا دائمی مسخرہ پیڈرو!
جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا
تو وہ اپنے ہونٹ تراش رہا تھا
جب میں نے آخری بار اسے دیکھا
وہ اپنی قبر کے پاس بیٹھا
اپنے ڈھانچے کو سینے میں مصروف تھا
اور میں نے پیڈرو سے کہا

پیڈرو! پیڈرو!!
تمہیں ایسے جوتوں کی ضرورت ہے
جو تمہیں خدا کی اس مملکت سے
چپ چاپ گذر جانے میں مدد دیں

◂◂ ● ▸▸

جلاوطنی اور تاجپوشی

چتر پٹ کی داڑھی لمبی تھی
اس کے حافظے میں کئی سوراخ تھے
اس کی بیوی اس کے لیے ہمیشہ بری خبر لاتی
وہ جب پیدا ہوا
ایک سخت آسمان میں تارے بن رہے تھے
اس کے گھر میں ہر طرح کے موالیوں کے لیے جگہ تھی
لیکن ایک دن
روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے
کسی نے بندوق داغ دی
نرم ٹہنیوں پر، کور چشم پتوں پر
آسمان سے خاموشی رس رہی تھی
نیچے واتھے دریچے
جن کے اندر موت کی حکمرانی تھی
جسے ہر رات وہ نیند کا نام دیتا
مگر صبح
ایک محفوظ کائنات میں
بونوں کی حکمرانی ہوتی
بونے

جن کی زبان، ہونٹ اور کندھے
کبھی خود اپنی طرف مڑے ہوئے تھے
مگر اب چاک سے درست کر دیئے گئے تھے
وہ اپنی آوازوں کی بولی لگاتے
ایک جھگڑالو چاند کا ذکر کرتے
چیچ شوربے میں ڈبو کر
مصلحت اور فرار کے منصوبے بناتے
بونے جو ہمیشہ آسمان کے نیچے
ریزر کے تار پھیلاتے
مگر چتر پٹ، وہ کہتا
میرا سچ تسلیم کرو
یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ
یا اس سے برا ہو سکتا ہے
ہو سکتا ہے میں چاول کی قیمت بڑھا دوں
میرے پاس اتنا کچھ ہے
وہ تمہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے
چتر پٹ
اسے ہمیشہ ایسے نغموں کی تلاش رہتی
جو اس کے حافظے کی دیوار سے لٹکتے
شہد کے چھتوں کو جگا سکیں
اسے تنہائی کی عادت نہ تھی
اسے خاموشی سے چڑ تھی
وہ شکست کھانے کی عادت سے محروم ہو چکا تھا
بعد میں جب مکھیاں اس کے جسم پر بھنبنایا کیں
اس نے ایک کوئل کی کوک سننے کے لیے
اپنے کان کھڑے کر لیے

(آہ وہ دو بڑے سا قدار کان
جن پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی کٹر پلر رینگتا نظر آتا!)
اس کوئل نے گئے موسم میں
اس کے لیے کچھ اچھے گیت گائے تھے
مگر یہ ایک دوسری طرح کی کوئل تھی
جس کی آواز نے
اس کے حافظے پر ستم ڈھایا
چتر پٹ جس نے جلاوطنی کے دنوں میں بھی
اپنے وطن کو یاد نہ کیا
کون تھا وہ جس نے کہا تھا؟:
چتر پٹ، وہ ننگا اور زندہ ہی بہتر تھا
بجائے اس کے کہ اس کی تاج پوشی کی جاتی

◂◂ ● ▸▸

Flat - 5D/5F, Block Wave, Melin River View
15-Kavi Tirtha Sarani ,Kolkata-700023

'افق کی مسکراہٹ'، 'ممتا کی آوز'، 'لینڈ را' اور 'کولاژ' کی بے پناہ مقبولیت کے بعد
ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا نیا افسانوی مجموعہ

عید گاہ سے واپسی

منظر عام پر آ گیا ہے۔ پہلی بار اسلم جمشید وری نے اپنے افسانوں پر خود قلم اٹھایا ہے۔ ''میں اور میرے افسانے''

ملنے کے پتے:

۱۔ عرشیہ پبلیکیشنز، A 170، گراؤنڈ فلور-3، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی 95
arshiapublicatiospvt@gmail.com

۲۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری صدر شعبہ اردو، سی سی ایس یو۔ میرٹھ، یوپی
aslamjamshedpuri@gmail.com

● رضی شہاب

مضطرب احساس

میں ہر دم سوچتا ہوں
عجب عجلت سی رہتی ہے سدا مجھ کو
کہیں میں چوک نہ جاؤں
برہنہ صورتیں آنکھوں میں میری تیرتی ہیں جو
وہ منظر جو مری آنکھوں کی نمنا کی کا باعث ہیں
وہ سارے چہچہاتے پھول جن کو
ڈس لیا تھا وقت کی زہریلی سازش نے
وہ مردہ بے کفن لاشیں
زمیں جن کے لہو سے
سرخ جوڑے میں سجی ہے
دھوئیں کی وہ سیاہی جس کی زد میں
محلے کا وہ بوڑھا آخری منزل روانہ ہو گیا
مرے کانوں میں اس کے کھانسنے کی
دھمک وہ آخری آج بھی محسوس ہوتی ہے
تمنائیں سبھی جو
مری زندہ دلی کا راگ ہوتی تھیں
مری یہ شکستہ آرزوئیں جو
مرے اپنوں کے ارمانوں کا حصہ تھیں
جنہیں میں لحظہ لحظہ ڈھونڈتا ہوں
کھنڈر میں اور ملبوں سے پٹے آنگن کی بیلوں میں
میں ہر دم سوچتا ہوں

مجھے کھٹکا سا رہتا ہے سدا
کہیں ایسا نہ ہو
کہ میں محروم رہ جاؤں
کہیں ایسا نہ ہو
مرے احساس سے زندہ سبھی سچائیاں
مرے ہمراہ میری قبر کی خوراک بن جائیں
کہیں ایسا نہ ہو
مرے دشمن مرے ہاتھوں کی یہ تلوار بھی لے لیں
قلم اوزار ہے اپنا
اگر یہ چھن گیا ہم سے
تو پھر کون لکھے گا
حیات خونچکاں اپنی
ہماری چیختی تہذیب کے منظر
ہمارے درد کا عالم
ہمارے پیار کا بدلا
عجب عجلت سی رہتی ہے سدا مجھ کو
میں ہر دم سوچتا ہوں!!!

◂◂ ● ▸▸

Room No. 016, Narmada Hostel,JNU,
New Delhi-67
9810332595
E-mail: razishahab1@gmail.com

● نعیم بیگ

بلیکی

کئی ایک راتوں سے مسلسل جاگنے کی وجہ سے آج صبح جب میری آنکھ کھُلی تو جسم میں کسل مندی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ دفتر سے چھٹی کر لی جائے۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے کمرے میں نظر دوڑائی تو میری چارپائی کے نیچے فرش پر بلیکی سو رہی تھی۔ میرے جاگنے اور چارپائی کے چرچرانے پر وہ ذرا سی کسمسائی اور پھر پہلو بدل کر سو گئی۔ میرے سامنے رات کا پورا منظر گھوم گیا۔

فراز میرا جگری، آجکل مڈل ایسٹ سے آیا ہوا ہے۔ اسکول سے شروع ہوتی ہماری دوستی کوئی بیس ایک سال پرانی تو ہوگی۔ ہر روز اس کا کوئی نیا پروگرام بنتا اور ہم رات گئے تک گھر پہنچتے۔ جیسے کل رات اس نے موڈ بنا لیا کہ وہ بازارِ حسن ضرور جائے گا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم نوجوانی کے ابتدائی دنوں میں کبھی کبھار اس طرف نکل جایا کرتے تھے لیکن ہمیشہ مایوس ہی واپس لوٹے کیونکہ ہماری خواہشات کچھ عجیب نہیں تو مشکل ضرور ہوتیں، ہم اکثر ایک ہی بات کہتے۔ یار.....! لونڈیا کم عمر اور خوبصورت ہوگی تو بات بنے گی ورنہ واپسی۔ یوں کم عمری اور خوبصورتی کی تکرار و تلاش میں سرگرداں ہم اکثر گھوم پھر کر شہزادی تمبا کو پان چباتے ناکام و نامراد واپس لوٹ پڑتے۔ خوبصورتی کی خواہش تو اپنی جگہ، لیکن کم عمری کی کوئی خاص وجہ اس وقت ذہن میں نہ تھی البتہ اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم بازار سے شاید جسم خریدنے جاتے ہی نہیں تھے، بلکہ تلاش کچھ اور تھی۔

بعد میں فراز مڈل ایسٹ چلا گیا اور میں اچھی نوکری کی تلاش میں تھک ہار کر محکمہ ایجوکیشن میں کلرک لگ گیا تھا۔ ایک بوڑھی ماں تھی، وہ بے چاری میری شادی کی خواہش دل میں لیے چل بسی، اور یوں میں اب کرایہ کے گھر میں تنہا رہتا تھا جو ایک تنگ سی بند گلی کے آخر میں تھا۔ گمان غالب ہے کہ یہ کمرہ نما گھر کسی وقت ملحقہ گودام کے چوکیدار کا ہوگا۔ گھر کے سامنے اور دائیں جانب کپڑے کے گودام تھے جو کبھی کبھار سامان کی آمد و رفت پر ہی کھلتے۔ بائیں جانب گلی سے باہر نکلتے ہوئے تین اور گھر آمنے سامنے تھے۔ اس لحاظ سے ہماری چھوٹی سی گلی شاہراہ عام نہ ہونے کی وجہ سے دن اور رات کو ویران ہی رہتی۔

ہاں البتہ اس علاقے میں آوارہ کتوں کی ایک فوج رہتی تھی جو مجھ جیسے رات بھر سڑکیں ناپنے

والے شخص کے لئے ایک بڑا خطرہ تھا، لیکن یہ ایک محض اتفاق تھا کہ میں جب بھی ان کتوں کے پاس سے گذرتا تو وہ بجائے بھونکنے کے مجھ پر اس طرح غراتے کہ معلوم ہوتا کچھ کہہ رہے ہیں اور کبھی کبھار تو میں واقعی ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اگر انہیں ڈانٹ پلا دیتا تو وہ ہمیشہ پیچھے کی طرف دُبک جاتے۔ مجھے یوں لگتا جیسے وہ مجھے پہلے سے جانتے ہوں۔

ادھر کئی ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں ایک رات جب دیر سے گھر پہنچا تو دیکھا کہ ایک کالے رنگ کا کمزور سا لاوارث پلا گھر کے باہر بیٹھا اونگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہلکی سی آواز میں بھوں بھوں کیا۔ میں سمجھ گیا کہ بھوک کے مارے یہاں بیٹھا ہے۔ میں نے اندر سے ڈبل روٹی کے ایک دو سلائس دودھ میں ڈبو کر اس کے سامنے ڈال دیئے۔ کچھ دیر تو وہ سونگھتا رہا پھر اس نے فوراً کھانا شروع کر دیا۔ بعد میں یہ معمول ہو گیا کہ وہ سارا دن نا جانے کہاں غائب رہتا لیکن شام ہوتے ہی گلی کی نکڑ پر میرا انتظار کرتا۔ جونہی میں گلی کے اندر داخل ہوتا وہ بھوں بھوں کرتا میرے پیچھے چل پڑتا، اور جب تک میں گھر میں داخل ہو کر اسے کچھ نہ کچھ کھانے کو نہ دیتا یہ بھوں بھوں کرتا رہتا اور پھر کھا پی کر باہر گلی میں میری کھڑکی کے نیچے پڑا رہتا۔

جس دن مجھے یہ نظر نہ آتا تو میری نظریں بھی اسے ڈھونڈتی رہتیں، مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہم دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔

اب یہ پلا چھوٹا سا بچہ نہ رہا تھا بلکہ اس نے چند ہی مہینوں میں اپنا قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ میں نے پکارنے کی خاطر اس کا نام اس کے رنگ کی وجہ سے بلیکی رکھ دیا تھا۔ میں جب بھی اسے بلیکی کہہ کر پکارتا، وہ بھاگ کر آتا اور میرے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ اس کا چہرہ کچھ لمبوترا سا تھا لیکن سب سے اہم بات اس کی بڑی بڑی براؤن آنکھیں تھی جن کے گرد کالے رنگ کے دائرے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کسی حسین عورت کی آنکھیں اس کے چہرے پر لگا دی گئی ہیں.....اس کتے میں یہی ایک بات میری دلچسپی کا باعث تھی، میں جب بھی اسے دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا کہ وہ برابر میری آنکھوں میں جھانک رہا ہے۔ لیکن اب اس کی ایک بات کچھ دنوں سے مجھے مسلسل پریشان اور میری رات کی نیند خراب کر رہی تھی کہ یہ رات بھر گلی کی نکڑ سے پہلے پھولوں کی باڑھ کے پیچھے دُبکا بھونکتا رہتا۔ کئی ایک بار میں نے باہر نکل کر اسے ڈانٹا تو یہ چپ کر گیا لیکن کچھ دیر بعد پھر وہی.....بھونکنا شروع کر دیتا۔

کل رات جب میں فراز کے ساتھ بازارِ حسن سے حسبِ معمول ناکام و نامراد واپس لوٹا تو گلی میں مڑتے ہوئے دیکھا کہ چند ایک آوارہ کتے بلیکی کی طرف اچھل اچھل کر بھونک رہے ہیں اور بلیکی خوف زدہ سا ہو کر گلی میں اِسی باڑھ کی اوٹ میں چھپا ان پر بھونک رہا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کتوں کو ہاتھ

سے ڈراتے ہوئے بھگا دیا۔

اسی اثنا میں کونے والے گھر سے پاجامے میں ملبوس ایک شخص نکلا اور اس نے کہا۔

''جناب.....آپ اس کتیا کو یہاں سے بھگا دیں۔ یہ سارے کتے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔کئی ایک دنوں سے یہ سب یہاں جمع ہو جاتے ہیں اور رات بھر بھونکتے رہتے ہیں۔ ہماری تو راتوں کی نیند خراب کر رکھی ہے انہوں نے مل کر۔''

''کیا کہا.....کتیا؟

کیا یہ کتیا ہے؟'' میں نے حیرت سے مڑ کر بلیکی کی طرف دیکھا۔ میرے لیے یہ ایک انکشاف ہی تھا کہ بلیکی ایک کتیا ہے۔ یکلخت اس کی چمکدار بیضوی براؤن آنکھیں میرے ذہن میں گھوم گئیں۔

اس کی آنکھوں میں وہ سارے خواب جو ایک کتیا دیکھ سکتی ہے، مجھے نظر آنے لگے۔

میں اِن صاحب کو اچھا کہہ کر گھر کی جانب مڑ گیا۔ جب میں دروازہ کھول رہا تھا تو بلیکی میرے قدموں میں لوٹنے لگی۔

آج میں نے اسکے چہرے پر اطمینان کی وہ گہری لہر دیکھی جو شاید میرے آجانے سے اسکے جسم وجاں میں دوڑ گئی تھی۔ میں نے اسے رات کا کھانا دیا اور پھر خود بستر پر لیٹ گیا۔ خیالات کا جوار بھاٹا میرے ذہن میں ابھر رہا تھا، مجھے حیرت تھی کہ مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ یہ کتیا ہو سکتی ہے۔ کیا میں نے بلیکی کی طرف غور سے دیکھا ہی نہیں تھا؟

ابھی انہی خیالوں میں گم تھا کہ بلیکی نے باہر پھر بھونکنا شروع کر دیا۔ مجھے ساری بات سمجھ آ چکی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور بلیکی کی طرف دیکھا جو دروازے پر میری طرف پیٹھ کئے نکڑ پر جمع آوارہ کتوں پر بھونک رہی تھی، میں نے نیچے جھک کر اس کے پاس سرگوشی کی۔

''بلیکی.....! سنو! اندر آ جاؤ۔'' بلیکی نے مڑ کر مجھے دیکھا اس کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں نمی میں ڈوبے دو ٹمٹماتے ستارے دکھائی دیئے۔

وہ گلی کی نکڑ پر جمع کتوں کی طرف منہ کر کے ایک بار پھر بھونکی اور پھر لپک کر اندر آ گئی، میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھا لیا اور اپنی چارپائی پر لٹا دیا۔

◀◀ ● ▶▶

8-Nayab Homes, Near NESTOL,
Airpot Road, Lahore Cantt (Pakistan)

● امین صدرالدین بھایانی

ہم صورت گر کچھ خوابوں کے

''جانتے ہو ناصر.....، غریب آدمی کیسے خوشیوں کو تلاشتا ہے؟.....! جیسے کسی بھرے میلے میں ایک ننھا بچہ اپنی کھوئی ماں کو تلاش کر رہا ہو.....!!!۔''

''آذر.....! آذر.....! آذر.....!!!، بالکل مزا نہیں آ رہا۔ تم اپنی ڈائیلاگ ڈیلیوری میں کچھ اور جان ڈالو۔ فلم بینوں کو تمہاری آواز میں محرومی سنائی دینی چاہئے۔ اُنہیں تمہاری آواز میں وہ شکوہ سنائی دینا چاہیئے جو وہ خود اِس دنیا، اِس زمانے سے کرنا تو چاہتے ہیں لیکن چاہتے ہوئے بھی کر نہیں پاتے۔ آذر تمہارا یہ ڈائیلاگ اِس طرح سے سنیما ہال میں گونجنا چاہئے کہ اِس کی گونج اُنہیں اپنے بے آواز شکووں کا مداوا محسوس ہونے لگے۔'' میں نے آزر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انتہائی جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

آذر نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا:

''ادیب الحسن صاحب! ویسے بھی پانچ بج چکے ہیں، اگر اجازت ہو تو میں اب چلوں گا۔ ریہرسل کا سلسلہ کل یہیں سے دوبارہ شروع کریں گے۔''

یہ ستر کی دھائی کے اواخر کے اُن دنوں کی بات ہے جب پاکستانی فلمی صنعت گاہے بہ گاہے اپنے زندہ ہونے کے ثبوت فراہم کرتی رہتی تھی۔ ایسے میں ایک روز فلمی صنعت کے ایک بہت ہی بلند پایہ اور نامور ہدایت کار پرویز السلام فاضل نے مجھ سے کراچی میں فون پر رابطہ کر کے اپنی نئی فلم کا اسکرپٹ لکھنے کی استدعا کی تھی۔ پہلے تو میں نے دوٹوک لہجے میں یہ کہہ کر صاف انکار ہی کر دیا۔

''میں ٹھہرا خالص ادبی نوعیت کا ادیب۔ یہ سچ ہے کہ میرے لکھے افسانے اور ناول اِس وقت شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں لیکن میں نے آج تک فلم تو کیا کبھی ٹی وی ڈرامے کا اسکرپٹ بھی نہیں لکھا اور نہ ہی لکھنے کی کوئی خواہش ہی ہے۔'' اتنا کہہ کر میں نے فون پٹخ دیا۔

اُس وقت تک مجھے ادبی دنیا میں وارد ہوئے کچھ دس بارہ برس کا عرصہ ہی گزرا تھا اور خوش نصیبی سے میرے متعدد افسانوں کے مجموعے اور ناول شائع ہو کر فروخت کے ریکارڈ قائم کر چکے تھے۔ اب اِس کا

کچھ نا کچھ تو اثر ہونا ہی تھا۔ لہٰذا میں کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔

لیکن صاحب، پرویز السلام فاضل بھی اپنی دھن کا پکا آدمی تھا۔ مسلسل فون پر فون کرتا رہا۔ جب میں نے ہار نہ مانی تو ایک روز وہ لاہور سے پہلی فلائٹ پکڑ کر کراچی پہنچا اور سیدھا میرے گھر آن دھمکا۔ اب گھر آئے دشمن کی بھی عزت و تکریم لازم ہے اور وہ تو پرویز السلام فاضل تھا۔ اُس وقت کی پاکستانی فلمی صنعت کا سب سے کامیاب اور سنیئر ترین ہدایت کار۔ جہاں اُس کے کریڈٹ پر بیشمار کامیاب ترین فلمیں تھیں وہیں لوگ اُسے اس کے فن میں یکتا و پختہ مانتے تھے۔ اُس کا شمار فلمی صنعت کے اُن معدودے چند ہدایتکاروں میں ہوتا تھا جو کہ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ تکنیکی شعبے کی بھی کماحقہٗ سُوجھ بُوجھ رکھتے تھے۔ بعدازاں مجھے اُس کی ہی زبانی پتہ چلا کہ وہ قیامِ پاکستان سے دو تین سال قبل ہی کلکتہ کی فلمی صنعت کے ایک کہنہ مشق فلم ایڈیٹر سے فلم ایڈٹنگ، پھر ایک پرانے اور نامور سنیما ٹوگرافر سے فلمی عکاسی کے اسرار و رموز سیکھ کر بنگالی فلموں کے ایک بڑے ہدایتکار روبن پارتو کو اسسٹ بھی کرنے لگا تھا۔ تقسیم کے بعد اپنے خاندان کے بڑوں کے اصرار پر پاکستان آ گیا اور 1960ء میں اُس نے اپنی پہلی فلم ''پیاس'' کی خود مختارانہ ہدایتکاری کی تھی۔ اُس دن کے بعد سے کامیابی مسلسل اُس کے قدم چوم رہی تھی۔

اب وہی پرویز السلام فاضل میرے سامنے بیٹھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے نیلے خانوں والی انتہائی نفیس سی سفید بوشرٹ، جس کا دامن اعلیٰ تراش کی گہری نیلی پتلون سے باہر، گلے میں گہرا سرخ مفلر اور پیروں میں سیاہ چمکدار جوتے۔ دبلے پتلے سے جسم پر اُسی مناست کا سر اور ہلکے سے تیل لگے بالوں میں بائیں ہاتھ کی جانب سے نکالی گئی مانگ۔ نفاست سے قدرے چھوٹے کٹے انتہائی سلیقے سے سنوارے گئے سیاہ بال جن میں کہیں کہیں جھلکتے سفید تار۔ تنگ پیشانی، صاف رنگت والے کلین شیو چہرے پر سنجیدگی اور متانت۔ آنکھوں پر لگے موٹے شیشوں والے چوکور چشموں سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی مگر گہریں اور ذہین آنکھیں۔ ستواں ناک۔ اُن کے عین نیچے پتلے پتلے ہونٹ جو غالباً کثرتِ سگریٹ نوشی کے سبب گہرے سانولے ہو رہے تھے۔ چھوٹی سی گول ٹھوری جس میں باتیں کرتے وقت ہلکا سا گڑھا پڑتا تھا۔

''دیکھیں ادیب الحسن صاحب.....!، آپ جیسے دانشور لوگ ہی پھر شور مچاتے ہیں کہ پاکستانی فلموں میں شامل کہانیوں کا کوئی ادبی معیار نہیں ہوتا۔ میں نے اِس بار عزمِ مصمم کیا ہے کہ میں اپنی اگلی فلم کے لیے ایک ایسی اچھوتی کہانی لکھواؤں گا جو نہ صرف ادب کے معیار پر بھی پوری اترے بلکہ اسے دیکھ کر فلم بینوں کی شعوری و لاشعوری دونوں طرح سے اصلاح بھی ہو۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور اپنی انگلیوں میں دبے سگریٹ کو اُس نے انگوٹھے اور شہادت کے

عین بعد والی انگلیوں سے پکڑ لیا اور جلتے ہوئے سِرے پر جمع ہوئی ہلکی باریک سی راکھ کو شہادت کی انگلی سے دھیرے دھیرے کریدنے لگا۔ شاید یہ اُس کی مستقل عادت تھی کیونکہ اُس انگلی کے سرے پر کھال کی رنگت بقیہ حصے کی نسبت قدرے سیاہ ہو رہی تھی۔

پہلے تو میں کافی دیر تک اپنے سرد و تلخ لہجے سے کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح سے اُسے ٹال دوں۔ اُسے آئے ہوئے اب کچھ آدھ گھنٹہ ہو چلا تھا لیکن میں نے اسے مروتاً بھی چائے یا پانی تک کو نہیں پُوچھا تھا۔

''اچھا ایسا کرتے ہیں کہ میرے کئی ادیب دوست ایسے بھی ہیں جو بڑے اچھے قلمکار ہیں۔ میرے کہنے پر وہ خوشی خوشی آپ کی فلم کا اسکرپٹ لکھنے پر راضی ہو جائیں گے۔'' میں نے تنگ آ کر بلا اپنے سر سے اتارنا چاہی۔

میری بات سن کر پرویز السلام فاضل بولا تو کچھ بھی نہیں، البتہ ایک بڑی ہی معنی خیز سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر مچلی اور ساتھ ساتھ آنکھیں بھی چمک اُٹھیں۔

گو میں اُس گہری مسکراہٹ کا مطلب اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا، پھر بھی انجان بنتے ہوئے اندھیرے میں تیر چلایا:

''تو اِس کا مطلب ہے کہ آپ کو میری تجویز پسند آئی۔''

پرویز السلام فاضل نے بڑے ہی اطمینان کے ساتھ دھیرے مگر انہتائی پختہ لہجے میں وہی جواب دیا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔

''ادیب الحسن صاحب، اگر کسی اور سے ہی کہانی لکھوانا ہوتی تو میں لاہور سے چل کر یہاں کراچی آتا ہی کیوں؟ وہیں لاہور ہی میں بیٹھ کر یہ کام کر سکتا تھا۔ ان گنت ادبی پائے کے مصنفین ایک اشارۂ ابرو کے منتظر ہیں کہ میں ان سے کب کہوں اور وہ کب میرے لیے اسکرپٹ لکھیں۔''

اتنا کہہ کر اُس نے اپنی انگلیوں میں دبا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ پھر بڑی ہی آہستگی اور نفاست کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو دھیرے دھیرے جھاڑتا ہوا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''اگر میری فلم کی کہانی کسی نے لکھنی ہے تو وہ آپ ہی لکھیں گے ورنہ میں فلم ہی نہیں بناؤں گا بس.....!!!''

''لیکن کیا آپ جانتے بھی ہیں کہ میرے تمام تر افسانے، کہانیوں اور ناولوں کے مضوعات عموماً انسانی نفسیات، شعور و لاشعور کی الجھی گتھیوں کو سلجھاتے اور ماضی میں پیوستہ اُن کی جڑوں کی تلاش کے اردگرد گھومتے ہیں۔ آپ کے لئے انہیں فلمانا کچھ ناممکن سا ہی ہوگا۔'' میں نے اپنے چہرے پر ایک گہری

طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ میں نے گذشتہ دس برس کے دوران شائع ہونے والے آپ کے سارے ناول اور افسانوں کے مجموعے پڑھ رکھے ہیں۔'' پرویز السلام فاضل کا یہ جواب میرے لیے ایک نیا دھچکا تھا۔

''اور پھر میں آپ کی انڈسٹری میں بننے والی فلموں کی طرح سے روایتی پیار و محبت، مار دھاڑ، کشت وخُون سے لبریز گنڈاسوں والی کہانیاں نہیں لکھ سکتا۔'' میں نے مزید جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں میرا آپ سے اس قسم کی کہانی لکھوانے کا قطعاً کوئی ارادہ بھی نہیں۔''

اس پر میں نے ایک نیا پینترا بدلا۔

''دیکھیں، میں فری لانس کام کرنے کا عادی ہوں۔ کبھی کسی کے لیے اور کسی کے کہنے پر آج تک کوئی تحریر نہیں لکھی۔ اپنی اسٹڈی میں دنوں اور مہینوں بند ہو کر جو کچھ لکھتا ہوں اُس کا مسودہ پبلیشر خود میرے گھر سے پیشگی معاوضہ دے کر لے جاتا ہے اور ہر چھ ماہ میں میری سابقہ کتب کی رائیلٹی کا چیک مجھے بذریعہ ڈاک مل جاتا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اور تو اور میں شہر میں منعقدہ سو کالڈ ادبی محافل اور نشستوں میں بھی شرکت نہیں کرتا۔ ویسے بھی میرے بارے میں ادبی حلقوں میں کچھ اچھی رائے نہیں پائی جاتی۔ ادبی لوگ مجھے منہ پھٹ، جھکی، بدمزاج اور شارٹ ٹیمپرڈ کہہ کر پکارتے ہیں۔ مجھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر شدید غصہ آجاتا ہے اور میں اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہوں۔ معمولی معمولی سی باتوں پر ہتھے سے اکھڑ جاتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ میرے ساتھ کام کر سکیں گے، اب میں مزید کچھ اور نہیں کہنا چاہتا، بہتر ہوگا کہ اب آپ تشریف لے جائیں..... !!!۔'' میں نے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ثبت کر کے اپنے ہاتھ جھٹک کر اُسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور آپ میرے بارے میں نہیں جانتے..... !!!۔'' پرویز السلام فاضل ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑے ہی پُرسکون لہجے میں بولا۔

''میرے بارے میں ساری فلمی صنعت میں یہ مشہور ہے کہ مجھے اپنے تیس سالہ کیریئر میں کبھی ایک بار بھی غصہ نہیں آیا۔ میرے خیال میں، میں فلمی صنعت کا وہ واحد ہدایتکار ہوں جس کے ساتھ آپ باآسانی کام کر سکتے ہیں۔''

میری جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں تھا کہ اُس سے جان چُھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ تھا کہ ہار مان کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ ویسے میں نے اپنے بارے میں کچھ ایسا غلط بھی تو نہیں کہا تھا۔

میرا گزشتہ دس بارہ سالوں پر محیط ادبی سفر کوئی بہت زیادہ پُر پیچ نہیں تھا۔ دورانِ تعلیم ہی میں نے ملک کے بہت ہی بڑے اور نامور ادبی جریدے میں افسانہ نگاری کا آغاز کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے میرے اولین افسانے کے ساتھ ہی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ جریدے کے ہر ماہ شائع ہونے والے شمارے میں میرے افسانے کی شمولیت ایک لازمی امر ٹھہر گئی۔ یہ سلسلہ یونہی دو تین سالوں تک چلتا رہا۔ پھر ایک روز جریدے کے مدیر ریاض جے پوری صاحب نے مجھ سے گزشتہ دو تین برسوں کے دوران شائع شدہ افسانوں میں سے منتخب افسانوں کا مجموعہ اپنے ادارے کے تحت شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا اور جب کتاب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ نہ سہی کچھ تھوڑا بہت معاوضہ بھی ہاتھ آ رہا ہو تو پھر انکار کی گنجائش ہی کہاں رہتی تھی۔ میری خوش نصیبی رہی کہ جہاں میرا پہلا ہی مجموعہ اچھی تعداد میں فروخت ہوا وہیں اُسے ناقدین کی جانب سے بھی سراہا گیا۔ اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے جے پوری صاحب نے میرے بقیہ افسانوں کو بھی ایک اور مجموعے کی صُورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ مجموعہ تو اُن کے ادارے سے شائع شدہ دیگر تمام کتب کی فروخت کے سابقہ ریکارڈ توڑ گیا۔ ان دو کامیاب مجموعوں نے ادبی دنیا میں میرے قدم جما دیئے اور ملک کے نامور ترین اشاعتی ادارے مجھ سے رابطہ کرنے لگے۔ اگلے چھ ماہ میں ہی میرا اولین ناول "پیاس کا سمندر" کامیابی کی نئی داستان رقم کر رہا تھا اور پھر یکے بعد دیگرے ایسی متعدد داستانیں رقم ہوتی چلی گئیں۔ میری شہرت میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ میرے افسانوں اور ناولوں کی خاص بات اس کے مرکزی کردار تھے جو کہ عموماً بے حد زندہ دل، زندگی کی جانب مثبت سوچ و عمل کے حامل اور سب سے بڑھ کر گفتار و کردار کے غازی۔ ان کرداروں نے قارئین پر میری تصانیف کے ساتھ ساتھ میری شخصیت کے حوالے سے بھی ایک مثبت تاثر قائم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

خُود سر تو میں پہلے ہی سے تھا۔ ان کامیابیوں نے مجھے خُود پسند بھی بنا دیا۔ میرا اپنے بارے میں یہ خیال پختہ ہو چلا تھا کہ بھلا مجھ سے بہتر انسانی نفسیات و فطرت، کشمکشِ قلب و خرد، شعور و لاشعور کی پیچیدہ گتھیوں، اسرار و رموزِ حیات و موت اور کون جان و سمجھ سکتا ہے۔ میرے ذہن نے اپنے سوا دیگر تمام لوگوں کو حقیر، سوچ و سمجھ اور عقل و خرد سے عاری ایک مخلوق قرار دے دیا تھا۔

ویسے بھی شروع ہی سے میں کچھ گوشہ نشین طبیعت کا حامل تو تھا ہی، اب ان پے در پے کامیابیوں کے بعد حاصل ہونے والے گرانقدر ادبی منصوبوں کی تکمیل کے لیے کل وقتی ادیب کی حیثیت سے اپنی اسٹڈی میں قلم اور کاغذ سے اپنا ایک اٹوٹ رشتہ استوار کر لیا۔ باالفاظِ دیگر یوں کہہ لیں کہ میری اسٹڈی

میرے لیے ایک کمفرٹ زون یا گوشۂ عافیت بن گئی تھی۔

تو یہ تھی اُس دور میں میری شخصیت کی کچھ جھلکیاں.....اُس وقت تک میں نے جو کچھ بھی کیا تھا اپنی ذات کے خول میں مقید ہو کر ہی کیا تھا۔ٹیم ورک کیا ہوتا ہے؟ میں اُس سے قطعاً نا آشنا تھا۔

''اچھا چلیں آپ ایسا کریں کہ میرے کسی بھی افسانے یا ناول کو فلما لیں۔''میں نے یہ سوچ کر کہا کہ اِس ہٹ دھرم سے بھی جان چھوٹے گی اور بطورِ خاص کچھ لکھنا بھی نہیں پڑے گا۔

''نہیں، بالکل نہیں ادیب الحسن صاحب، میں آپ سے اپنے ایک برسوں پرانے آئیڈیا پر کہانی لکھوانا چاہتا ہوں۔ جسے میں نے اُس وقت سوچا تھا جب میں کلکتے میں ہدایتکار روبن پارتو کو اسسٹ کر رہا تھا۔لیکن مجھے فلمی صنعت میں کوئی ایک بھی ایسا ادیب نظر نہیں آتا جو اس کہانی کے ساتھ آپ سے بڑھ کر انصاف کر سکے۔''پرویز السلام فاضل کی آنکھوں کی چمک پہلے سے کہیں زیادہ گہری ہوتی چلی گئی۔اُس کی اندرونی قلبی کیفیات وجذبات اُس کے چہرے پر موجزن تھے۔

''ادیب صاحب، آپ کے افسانوں اور ناولوں میں پائے جانے والا مخصوص رومانٹک ماحول، اُن کے کردار اور ان کی خاص نفسیات جو کہ زندگی سے انتہائی قریب تر ہوتے ہوئے بھی پراسراریت کی ایک دبیز چادر میں لپٹے رہتے ہیں۔ دلوں کو چھو لینے والی کہانیاں، جو کہ پڑھنے والوں کے دل سے لے کر احساس تک کو گرما اور آنکھوں سے لے کر روح تک کو بھگو دیا کرتی ہیں۔ مجھے بھی اپنی فلم کے لیے ایک ایسی ہی حساس کہانی اور ایسے ہی زندہ وجاوید کرداروں کی تلاش ہے۔''پرویز السلام فاضل ایسے بول رہا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔اُس کی نظریں مسلسل دو رخلاؤں میں کہیں گھور رہی تھیں۔

اب میں نے اپنا سب سے مہلک وکاری ہتھیار آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

''اسلام صاحب، لگتا ہے آپ ہار ماننے والوں میں سے ہرگز نہیں۔ چلئے میں آپ کی کہانی تو لکھ دوں گا لیکن میرا معاوضہ.....روپے ہوگا۔''

میں نے اب تک کی اپنی آخری شائع شدہ کتاب جو کہ مارکیٹ میں بیسٹ سیلر ثابت ہوئی تھی، سے بھی کوئی دس گنا زیادہ معاوضہ بتا دیا اور پھر طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پرویز السلام فاضل کا چہرہ ویسا ہی کسی خاموش سی جھیل کی طرح پُرسکون اور اُس پر وہی دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ موجود تھی جو اس ساری گفتگو کے دوران موجود رہی تھی۔محض چند ہی لمحات کے توقف کے بعد اُس نے فقط اتنا کہا۔

''مجھے منظور ہے۔''

پھر اپنے بریف کیس میں سے چیک بک نکالی اور اپنی بوشرٹ کی جیب میں لگا پین نکل کر جلدی

جلدی ایک چیک لکھا، دستخط کیے اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ آپ کا نصف معاوضہ ہے اور بقیہ کا چیک میں آپ کی خدمت میں اُس وقت پیش کروں گا جب آپ مجھے مکمل اسکرپٹ دیں گے۔''

شاید اِسے ہی تو کہتے ہیں، خود آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔

چیک میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے وہ مزید بولا۔

''ساری گفتگو کے دوران قسم لے لیں جو اگر آپ ایک بار بھی مسکرائے ہوں۔چلیں اب میری درخواست پر ایک بار مسکرا دیں، آپ کا مسکرانا ہماری فلم کے لیے مبارک ثابت ہوگا۔''

پہلے تو میرا جی چاہا کہ اُسے خوب کھری کھری سناؤں لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ وہ میرے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے بادلِ نخواستہ مسکراتے ہوئے چیک وصول کر لیا۔

مجھے آج تک یاد ہے کے اُس روز میں نے اُسے چائے حتیٰ کہ پانی تک پوچھے بغیر ہی اپنے گھر سے چلتا کر دیا تھا۔ حالانکہ دورانِ گفتگو دو ایک بار بیگم نے چھوٹے صاحبزادے کو چائے پانی کا دریافت کرنے بھیجا بھی تھا۔لیکن میں نے بدتہذیبی کی انتہا کرتے ہوئے اُسے پرویز اسلام فاضل کے سامنے ہی دانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا تھا۔

پرویز السلام فاضل نے مجھے اُسی روز فلم کی کہانی کا مرکزی خیال جسے فلمی زبان میں ون لائن اسٹوری کہا جاتا ہے سنایا۔

یہ ایک ایسے نوجوان شاعر وادیب کی کہانی تھی جو اپنی تحریروں میں معاشرتی ناہمواری اور ناانصافی کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا اور معاشرے کے رستے ناسوروں اور تلخ حقائق کو منظرِ عام پر لانے کی تگ ودو میں لگا رہتا۔لیکن اِس کوشش کی پاداش میں اس کا روزگار اس کی محبت اور حتیٰ کہ اُس سے جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔

پرویز السلام فاضل جہاں ایک ذہین ہدایتکار تھا وہیں اُسے کہانی اور اُس سے مربوط واقعات کی بُنت کا بھی بڑی حد تک اندازہ تھا۔گو اُس نے مجھے کہانی کا مرکزی خیال تو بڑا مختصر سا ہی سنایا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ کہانی کے حوالے سے متعدد واقعات اور مناظر ڈسکس کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ اُنہیں وہ کس طرح سے پردۂ سیمیں پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ دراصل کہانی کا تانا بانا وہ اپنے ذہن میں گزشتہ تیس سالوں سے بن رہا تھا۔اب مجھے مرکزی خیال، واقعات اور مناظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک مکمل کہانی کو پروان چڑھانا تھا۔ چونکہ میں کہانی لکھنے کی حامی تو بھر ہی چکا تھا اور پھر اُسے لکھنے کے سلسلے میں پرویز السلام فاضل کے ساتھ

ہونے والی نشستیں کافی بارآور ثابت ہوئیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری اُس میں ایک خاص دلچسپی پیدا ہوتی چلی گئی جس کے نتیجہ میں ایک بڑا ہی بھرپور اور مربوط اسکرپٹ وجود میں آیا۔

چونکہ یہ ایک نیم کمرشل، رومانوی اور سماجی نوعیت کی فلم تھی لہٰذا اس میں گانوں کی بھرپور گنجائش تھی۔ مجھے پرویز السلام فاضل کی یہ بات بھی بہت ہی اچھی لگی کہ اُس نے دیگر فلموں کی طرح محض فلم کی لمبائی بڑھانے اور فلموں کی روایت کو قائم رکھنے کی خاطر بھرتی کے گیتوں کی شمولیت کی بجائے مجھ سے گیتوں کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک سچویشنز لکھوائیں جس سے تمام تر نغمات فلم میں اِس طرح سے فٹ ہوتے چلے گئے جیسے انگوٹھی میں متعدد نگینے فنکارانہ مہارت سے جڑ دیئے گئے ہوں۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ یہ سارے کے سارے نغمات فلم کی کہانی کو آگے بڑھاتے چلے جاتے تھے۔

ایک روز وہ میرے پاس پھر آن دھمکا۔ وہ اپنے ساتھ ایک کیسٹ لایا تھا۔ اس نے وہ کیسٹ ڈرائینگ روم میں رکھے کسیٹ پلیئر میں لگا کر چلا دیا۔ اسپیکرز سے ابھرنے والی آواز کو سُن کر میں حیرت میں پڑ گیا۔ اطہر نفیس کی غزل فریدہ خانم گا رہی تھیں۔

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اُس کا حال سنائیں کیا
کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں اب سچا شعر سنائیں کیا

دراصل مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ فریدہ خانم وہ غزل گا تو اُسی روایتی دھن میں رہی تھیں جس میں انہوں نے پہلے گائی تھی، البتہ اُسے ایک مکمل اور بھرپور آرکسٹرا کے ساتھ ری ریکارڈ کر کے اُس کی خوبصورتی کو دوچند کر دیا گیا تھا۔ غزل مکمل ہوتے ہی پرویز السلام فاضل میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے اُس کی اُن داد طلب نظروں کی قطعاً پروانہ کرتے ہوئے بڑے ہی درشت لہجے میں سوال داغ دیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ ہماری فلم کا تھیم سانگ یا یوں کہہ لیں کہ تھیم غزل ہے، جو وقتاً فوقتاً فلم کے متعدد مناظر کے تاثر کو دوچند کرنے کے لیے پسِ منظر میں چلائی جائے گی۔ کیونکہ ہماری فلم کا مرکزی کردار ایک ناکام ادیب و شاعر ہے اس لحاظ سے اطہر نفیس کی یہ غزل ہماری فلم کے مزاج کو بہت سوٹ کرے گی۔ اس کی دھن وہی رکھی گئی ہے جس میں یہ پہلے ہی سے شہرت پا چکی ہے۔ البتہ اِسے چالیس سازندوں پر مشتمل آرکسٹرا کے ساتھ ریکارڈ کر کے مزید سنوار کر پیش کیا گیا ہے جس نے اس شاہکار غزل کے امپیکٹ کو دوآتشہ کر دیا ہے۔''

ایک مرحلہ پر آ کر میرا پرویز السلام فاضل سے کسی حد تک اختلاف ہو گیا۔

کہانی کا مرکزی خیال تو بہرحال اُسی کا تھا۔ البتہ صفحۂ قرطاس پر میرے قلم ہی نے اسے حقیقت کا

روپ دیا تھا۔ اسکرپٹ لکھتے لکھتے یہ مرکزی کردار میرے دل و دماغ میں رچ بس سا گیا۔ میں نے اپنے دل ہی دل میں اِس کردار کے لیئے موزوں ترین اداکار کی تلاش شروع کر دی۔ میرے ذہن میں کردار، اِس کی نفسیات، نشست و برخاست اور شخصیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے پاکستانی فلمی صنعت کے ایک ہی اداکار کا نام بار بار ابھر کر آ رہا تھا۔ جب میں نے پرویز السلام فاضل کو اس کردار کے لیے اپنے تجویز کردہ اداکار کا انتخاب کرنے کا مشورہ دیا تو حسبِ سابق اُس کے چہرے پر وہی ٹریڈ مارک دھیمی دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اپنے مخصوص پُرسکون لہجے میں بولا۔

''یہ درست ہے کہ ندیم ہمارے ملک کا بہت بڑا اور باصلاحیت اداکار ہے۔ میری بیشتر سابقہ فلموں میں اُسی نے مرکزی کردار ادا کیے ہیں۔ مجھے اس امر سے بھی انکار نہیں کہ وہ اس کردار کو اپنی بھرپور کردار نگاری سے زندہ و جاوید بنا سکتا ہے لیکن میں اپنی اس فلم کے ذریعہ پاکستانی فلمی صنعت کو ایک نیا اداکار دینا چاہتا ہوں۔ میرے ذہن میں اس کردار کے لیے ایک بالکل نیا چہرہ ہے۔ میں نے گزشتہ دنوں اِس کردار کے مکمل گیٹ اپ میں اُس کا اسکرین ٹیسٹ اور فوٹو شوٹ بھی کروایا جس کا میری توقع کے عین مطابق بے حد متاثر کن رزلٹ آیا ہے۔''

اتنا کہہ کر اُس نے اپنا بریف کیس کھول کر ایک لفافہ نکالا اور اُس میں سے ڈھیر ساری تصاویر نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ وہ نیا چہرہ آذر تھا جو کہ اُس وقت ٹی وی ڈراموں کا ایک ابھرتا ہوا اداکار تھا۔ مذکورہ فوٹو شوٹ میں فلم کے کردار سے مطابقت رکھتے ہوئے گیٹ اپ میں بلاشبہ ہو بہو میری کہانی کا کردار ہی معلوم ہو رہا تھا۔ اس وقت مجھے وہ کہاوت یاد آئی۔ جس کا کام اُسی کو ساجھے۔

اسکرپٹ تمام تر پہلوؤں سے مکمل ہو جانے کے بعد پرویز السلام فاضل نے فلم کے دیگر پری پروڈکشن شعبوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کر دی۔ اعلیٰ ادبی پائے کے شعراء سے فلم کے گیت لکھوائے گئے اور پھر فلمی صنعت کے ایک بڑے ہی کامیاب اور زبانِ زدِ عام نغمات کے تخلیق کار ماسٹر اسد اللہ کو موسیقی کا شعبہ پہلے ہی تفویض کیا جا چکا تھا۔

فلم کی شوٹنگ کے لیے پرویز السلام فاضل نے کراچی کا انتخاب کیا۔ اپنے دو معاون ہدایتکاران کے ہمراہ وہ مسلسل لوکیشنز مارک کرنے کے لیے ریکی کرنے لگا۔ مجھ سے اس نے بطورِ خاص فلم کے مکالموں کے درست تلفظ کی ادائیگی کے لیے فلم کے مرکزی اداکار آذر کو ریہرسل کروانے کی درخواست کی اور اِس کام کے لئے علاحدہ سے معاوضے کی پیشکش بھی کی جسے میں نے کسی قدر پس و پیش کے بعد اِس شرط کے ساتھ منظور کر لیا کہ تمام تر ریہرسلز کے لیے آذر روز میرے گھر آیا کرے گا۔

پھر ایک روز وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اُس روز پرویز السلام فاضل اسکرپٹ لے کر میرے پاس آیا اور فلم کے چند ڈائیلاگز تبدیل کرنے کو کہا۔ بس صاحب میں یہ سنتے ہی حسبِ عادت آپے سے باہر ہو گیا۔

''چند کامیاب فلمیں بنا کر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تم اب اِس قابل ہو گئے ہو کہ مجھ جیسے کامیاب اور ادبی سمجھ بوجھ رکھنے والے ادیب کے لکھے مکالموں میں کیڑے نکال سکو۔ اسی لیے میں فلم والوں کے لیے لکھنے ہی کے خلاف تھا۔ کان کھول کر سُن لو! میرا لکھا پتھر پر لکیر ہے اور میں اِسے ہرگز تبدیل نہیں کروں گا۔''

اتنا کچھ سننے کے بعد بھی اُس کا چہرے ویسا ہی پرسکون تھا جیسے عموماً ہوا کرتا تھا۔ وہ بنا کچھ کہے بس خاموش بیٹھا رہا۔ غصے کی شدت سے اپنا بلڈ پریشر ہائی ہو جانے کے باعث میں بھی کچھ دیر کے لئے خاموش اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ پندرہ بیس منٹ ماحول یونہی خاموش اور ساکت سا رہا۔ ماحول کو قدرے ٹھنڈا پا کر پرویز السلام فاضل بولا۔

''ادیب صاحب، میں یہاں اِس فلم جو کہ محض میری ہی نہیں ہم سب ہی کی فلم ہے کی بہتری کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میرے خیال میں اگر اس کے چند مناظر میں شامل مکالموں کو ذرا سا تبدیل کر لیا جائے تو اس سے نہ صرف ان مناظر کا تاثر ابھر کر سامنے آئے گا بلکہ بحیثیت مجموعی فلم پر بھی بہت ہی اچھا اثر پڑے گا۔''

میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ کافی دیر مجھے سمجھانے کی سعیِ لاحاصل کے بعد وہ چلا گیا۔

اگلے روز جب میرا غصہ قدرے ٹھنڈا ہوا تو میں نے اسکرپٹ کو پرویز السلام فاضل کے آئیڈیا اور ان مناظر جن کے مکالمے وہ تبدیل کرنا چاہتا تھا کو ذہن میں رکھ کر دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو مجھے اُس کی بات ٹھیک لگی اور اُسی مناسبت سے مکالموں کی میرے ذہن میں آمد ہوتی چلی گئی جو خود مجھے بھی پہلے سے کہیں بہتر محسوس ہوئے۔

اُسی شام پرویز السلام فاضل پھر میرے گھر آ گیا حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ میرے گذشتہ روز کے برتاؤ کے بعد وہ مجھ سے ناراض ہوگا۔ وہ ڈرائنگ روم میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو اس کا وہی پُرسکون چہرہ اور مدھم سی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے کچھ اور کہے بنا اسکرپٹ اُس کے ہاتھ پر دھر دیا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے اسکرپٹ دیکھتا رہا اور پھر جب اُس نے سر اٹھایا تو اُس کی مدھم سی مسکراہٹ ایک گہرے معنی خیز تبسم میں ڈھل چکی تھی۔

''میں جانتا تھا، ایسے پُراثر اور جکڑ لینے والے مکالمے صرف آپ ہی تخلیق کر سکتے ہیں۔''

پرویز السلام فاضل تو اسکرپٹ لے کر چل دیا لیکن جاتے جاتے وہ مجھے سوچ کے ایک گہرے بھنور میں دھکیل گیا۔ اُس روز میں نے سوچا کہ ایک تخلیق کار میں ہوں جو اسٹڈی کے دروازے کے پیچھے اپنے

کمفرٹ زون میں بند اپنی ذات کے ویرانوں میں گم ہو کر ایک فن پارہ تخلیق کرتا ہے۔ اُس زیرِ تخلیق افسانے یا ناول کی کہانی، پلاٹ، واقعات، کردار، اُن کے رویے، نفسیات، گفتگو، نشست و برخاست، اُن کی سوچ اور جذبات سب ہی کچھ تو میرے قلم کے تابع ہوتے ہیں۔ میں جب اور جیسے چاہوں ان کو استعمال کروں۔ اُن میں سے کوئی بھی میرے سامنے چُوں و چرا کرنے کی ہمت تک نہیں کر سکتا۔ لیکن پرویز السلام فاضل بھی تو ایک تخلیق کار ہی ہے! لیکن اُسے اپنی تخلیق کو پایہِ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تخلیق کاروں کی ایک مکمل ٹیم مرتب کرنا پڑتی ہے۔ اُس ٹیم کا ہر رکن جو کہ میرے افسانوں اور ناولوں کے کرداروں کے برعکس گوشت پوشت سے بنا، جذبات و احساسات رکھتا جیتا جاگتا انسان اور اپنی ذات میں خود ایک مکمل تخلیق کار ہوتا ہے۔ اسے اپنی تخلیق کے ایک مخصوص گوشے کو سنوارنے کا کام اپنی مرضی کے عین مطابق ایسے لینا ہوتا ہے کہ ان تمام تخلیق کاروں کے کام میں ایک مکمل ہم آہنگی پیدا ہو جائے اور وجود میں آنے والی تخلیق ایک ایسی کثیر جہتی پینٹنگ کی شکل اختیار کر لے جس کا ہر زاویہ نہ صرف خود اپنے اندر ایک تخلیق کا درجہ رکھتا ہو بلکہ ایک دوسرے کی شان بڑھائے اور بحیثیت مجموعی ایک مکمل و اعلیٰ فن پارے کا بھرپور تاثر بھی فراہم کرے۔

پرویز السلام فاضل کے ساتھ اپنے رویہ کی بدصُورتی کا درست اندازہ مجھے فلم ''آئینہ زندگی'' کے پریمیئر شو والے دن ہوا۔ جی ہاں یہ ہی نام تھا اُس فلم کا۔

کسی حد تک فلم کے معیاری ہونے کی امید تو میں نے شروع دن سے ہی لگا رکھی تھی۔ اُس روز سنیما کے اندھیرے ہال میں مسلسل تین گھنٹے میں نے پرویز السلام فاضل کے فن کا مظاہرہ دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں کوئی فلم نہیں بلکہ پردہِ سیمیں پر اپنا ہی کوئی بھولا بسرا سُہانا سپنا دیکھ رہا ہوں جو میں کبھی بہت پہلے دیکھ کر بھُول گیا تھا۔ مگر اُس کے چند دھندلے دھندلے حسین مناظر ہیولوں کی شکل میں اب بھی اکثر میرے ذہن کے نہاں خانوں سے ابھر ابھر کر مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کرتے ہوں۔ پرویز السلام فاضل نے کمال فنکارانہ مہارت کے ساتھ اس حسین و دلربا سپنے کو سیلولائیڈ کے فیتے پر منتقل کر دیا تھا۔

ٹیم ورک کے معجزے پر میرا ایمان اس روز کامل ہوا جب فلم "آئینۂ زندگی" کو کل سات نیشنل فلم ایوارڈز جس میں بہترین فلم، بہترین ہدایتکار، بہترین اداکار، بہترین موسیقار، بہترین سنیماٹوگرافر کے علاوہ مجھے بہترین مصنف اور مکالمہ نگار کے دو ایوارڈوں سے نوازا گیا۔

اس فلم کی فقید المثال کامیابی کے بعد میں اور پرویز السلام فاضل ایک ٹیم کی شکل اختیار کر گئے۔ پھر یہ رفاقت انتہائی گہرے دوستانے پر منتج ہوئی۔ اُس کی اگلی تمام فلموں، جن کی کُل تعداد چار بنتی ہیں کی کہانیاں اور مکالمے میں نے ہی لکھے۔ بلآخر یہ ٹیم اور دوستی ٹھیک گیارہ سال بعد ہدایتکار پرویز السلام

فاضل کے اچانک ہارٹ اٹیک کے باعث انتقال کر جانے سے ٹوٹ گئی۔

آج پرویز السلام فاضل کو ہمارا ساتھ چھوڑے ہوئے بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی عار نہیں ہے کہ اسلام صاحب کے جانے کے بعد اُس جیسا کوئی اور خوابوں کا صُورت گر ہماری فلمی صنعت کو میسر ہی نہ آ سکا۔

اِس حقیقت کے باوجود کہ وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا، اس نے کبھی میرے طرزِ عمل کے بارے میں مجھ سے کوئی بات تک نہ کی اور محض اپنے عمل اور کردار سے میرے لیے رول ماڈل بنا۔

میری دعا ہے کے اللہ پرویز السلام فاضل مرحوم کی معغفرت کرے اور اس کے درجات بلند کرے، آمین۔

یہ آخری کلمات ادا کر کے میں نے ڈائس پر بکھرے کاغذات سمیٹے اور اسٹیج سے اتر کر سُست قدم اٹھاتا ہوا اپنی نشست کی جانب چل دیا۔ کراچی آرٹس کونسل کے کھچا کھچ بھرے ہوئے آڈیٹوریم میں محض چند ساعتوں کی مکمل خاموشی کے بعد اچانک چھت شگاف تالیوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو تمام حاضرین اپنی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر والہانہ انداز میں تالیاں پیٹ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ تالیاں پرویز السلام فاضل کی برسی پر لکھے گئے میرے مقالے کی پسندیدگی کے لیے تھیں یا خود پرویز السلام فاضل مرحوم کے لیے۔

◂◂ ● ▸▸

903-Misty View CT, Lilburn,
GA-30047, (USA) Cell : 404-207-9063

ششماہی خرمن انٹرنیشنل (شمارہ نمبر۳) مرتبین : سید تحسین گیلانی رمہر افروز ناشر: ہدیٰ پبلی کیشنز، دھارواڑ، کرناٹک (انڈیا) قیمت ۳۰۰ سو روپے صفحات ۴۶۴		ششماہی تکمیل بھیونڈی (شوکت حیات نمبر) مدیر اعلیٰ: اصغر حسین قریشی مدیر: مظہر سلیم قیمت : ۲۵۰ روپے صفحات ۲۷۲
سہ ماہی سیاق (جموں) مدیرانِ اعزازی: محمد سلیم وانی، زمرد مغل مدیر: خالد کرار قیمت ۲۰۰ سو روپے صفحات ۱۹۸		ہندی سہ ماہی شیش (جودھپور انڈیا) مدیر: حسن جمال قیمت ۲۰ روپے صفحات ۱۲۰

● معظم شاہ

گشتی

مجھے اس تھانہ میں تعینات ہوئے تیسرا ماہ تھا۔ بطور سب انسپکٹر یہ میری دوسری تعیناتی تھی، میرے اکثر دوستوں کو یقین نہ آتا تھا کہ میں یعنی شیخ سعد حمید پولیس جیسے محکمہ میں کامیابی سے ملازمت کر رہا ہوں، والد صاحب ریٹائرڈ کلرک تھے اور والدہ محلے کے بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ گھر کا ماحول اتنا مذہبی تھا کہ میری ضد پر ٹی وی گھر میں اس وقت آیا جب میں فرسٹ ایئر میں پہنچ چکا تھا اس پر بھی ابا کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ رات کو وہ وقت مسجد میں گزارتے، جس دوران ہم ڈرامہ دیکھا کرتے تھے، ایسے ماحول میں، میں نے بی اے کیا اور اے ایس آئی کی سیٹ پر اپلائی کر دیا، اللہ نے کرم کیا اور بغیر کسی سفارش کے مجھے نوکری مل گئی، شروع میں، میں نے سختی سے ایمانداری کو اپنایا لیکن جب دیکھا کہ ساری کی ساری تنخواہ ڈیوٹی پر لگ رہی ہے تو مجھے مجبوراً ہاتھ کھولنا پڑے۔ اب میں رشوت بھی لیتا تھا اور کچھ رنگین مزاجی بھی طبیعت میں شامل ہو چکی تھی لیکن بے گناہ اور معصوم لوگوں سے آج بھی میں نہ تو رشوت لیتا تھا اور نہ ہی انہیں تنگ کرتا تھا۔

اس دن میں ڈیوٹی آفیسر تھا، رات 2 بجے ایک لڑائی جھگڑے کا کیس آ گیا جسے نبٹاتے نبٹاتے صبح کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ میں نماز پڑھ کر سویا تو آٹھ بجے سنتری نے جگایا، آدھے گھنٹے میں نہا دھو کر میں دوبارہ یونیفارم پہن چکا تھا۔ قریب نو بجے صبح وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی، پانچ فٹ آٹھ انچ قد کے ساتھ قدرے بھرا بھرا بدن اور خوبصورت بیضوی چہرے پر موٹی موٹی کاجل بھری آنکھیں، اس کی آنکھوں کی سرخی بتاتی تھی کہ یا تو روئی ہوئی ہے یا پھر رات کو جاگتی رہی ہے۔

وہ آتے ہی میرے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی، بلا کا اعتماد تھا اس کے انداز میں، میں نے کہا۔

''جی بی بی کیسے آنا ہوا؟'' وہ بولی۔

''ایک بے غیرت نے تنگ کر رکھا ہے، میں نے بہت کوشش کی کہ خود ہی مسئلہ حل کر لوں لیکن آج جب وہ حد سے گزر گیا تو مجھے آپ کے پاس آنا پڑا۔'' میں نے کہا۔

''کچھ وضاحت کرو مسئلہ کیا ہے۔'' بولی۔

''صاحب آپ سے کچھ چھپاؤں گی نہیں۔ میرا نام نجمہ ہے، میرے پاس کچھ لڑکیاں ہیں میں ان سے دھندا کرواتی ہوں، میں خود نہیں چلتی، بس انہیں محفوظ گاہکی دلواتی ہوں اور میری دال روٹی چلتی ہے، یہ ندیم بدبخت میرا پڑوسی ہے، اس نے ایک دن مجھے کہا کہ ساری دنیا کو موج کرواتی ہو ہمیں کبھی پوچھا بھی نہیں، میں بولی محلے والوں سے دھندا میرا اصول نہیں ہے۔ تو اس نے مجھے دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ میں اہل محلّہ کو جمع کر کے تمہیں نکلوا دوں گا۔ اب صاحب آپ جانو، میرا چکلا تو ہے نہیں، لڑکیاں عزت سے میرے گھر آتی ہیں، میں ان کی بکنگ فون پر کرتی ہوں اور گاہک تک خود پہنچا کر آتی ہوں، واپس لینے بھی وقت پر جاتی ہوں اور لڑکیوں کو اپنے گھر لا کر ان کا حصہ دے کر انہیں رخصت کر دیتی ہوں، ابھی تو کچھ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لڑکیاں بھی میرے پاس ہیں، کچھ گاہک گپ شپ اور ادب آداب کے شوقین ہوتے ہیں تو وہ پڑھی لکھی لڑکیاں پسند کرتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ میرا جو بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو، آج اُس حرامی نے میرے دروازے پر کھڑے ہو کر صبح ہی صبح شور مچانا شروع کر دیا، میں نے روکا تو میرے ساتھ ہاتھا پائی کی اور میرے کپڑے پھاڑ دیئے'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پرس سے پھٹی ہوئی قمیض نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔

میں نے اس کی درخواست لکھ کر اس کے دستخط کروائے اور اس کے ساتھ چل پڑا، سرکاری گاڑی کسی کام سے تھانہ آئی ہوئی تھی میں نے اسی گاڑی میں اسے بٹھایا اور اس کے پڑوس سے ندیم نامی بدمعاش کو اٹھا لایا۔ یہ لڑکا ابھی نئے نئے پَر پُرزے نکال رہا تھا، تھانے میں اس کے خلاف معمولی نوعیت کی کچھ درخواستیں پہلے بھی پہنچ چکی تھیں لیکن خشکہ ہونے کی وجہ سے دادرسی کی منزل نہ پا سکی تھیں۔ شروع میں تو اس نے تڑبڑ کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی لائن پر آ گیا اور اعتراف کر لیا کہ اس نے واقعی یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا، میں نے درخواست پر استغاثہ مرتب کیا اور ندیم عرف دیسے کو پانچہ (پانچ لتر) لگا کر حوالات میں بند کر دیا (شروع کے دنوں میں، میں چھترول وغیرہ کے سخت خلاف تھا لیکن جب محسوس ہوا کہ جرائم پیشہ لوگ اس مار کو اپنی خوراک سمجھتے ہیں اور اس تھانیدار کو انتہائی چبل، جو اس قسم کی مار نہ دے سکے، تو میں نے بھی مار کٹائی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا)۔

شام کو میرے موبائل پر اس کی کال آ گئی، بولی۔

''شیخ صاحب اگر کچھ دیر کے لیئے غریب خانے پر آ سکیں تو.....لمبی ''تو'' کے بعد خاموشی تھی۔

میں نے پوچھا۔

''ضروری ہے؟''، وہ بولی۔

''نہیں ضروری تو نہیں آپ ابھی مصروف ہیں تو پھر کسی وقت رکھ لیتے ہیں میں تو آپ کا شکریہ ادا

کرنا چاہتی تھی اور آپ کو ایک بات بھی بتانا تھی۔''میں نے کہا۔

''آٹھ بجے میری ڈیوٹی آف ہو گی تو میں ساڑھے آٹھ تک تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا۔''

میں اس کے گھر سادہ لباس میں پہنچا تو اس نے گرما گرم بریانی تیار کر رکھی تھی، میں نے کھانے سے سختی سے انکار کر دیا، جس پر اس کا موڈ خراب ہوا لیکن پی گئی ہم نے باتیں شروع کیں۔ اس نے بتایا کہ ندیم کی گرفتاری کے بعد محلے میں گونجنے والی سرگوشیوں سے اسے پتا چلا کہ ندیم پرچون میں چرس بیچ رہا تھا اور اس کے پاس ایک ناجائز پستول بھی تھا۔ شیخ جی، اس کے گھر پر چھاپہ مارو چرس بھی ملے گی اور پستول بھی۔ میں نے پوچھا۔

''اس کے گھر میں کون کون ہے۔''

وہ مجھے اس کے گھر کے افراد کی تفصیل بتانے لگی۔ اس کا دوپٹہ ڈھلک گیا تھا اور گہرے گریبان سے جو کچھ نظر آ رہا تھا اسے دیکھنا بڑا صبر آزما کام تھا۔ میں نے کہا۔

''دوپٹہ ٹھیک کر لو۔'' وہ ہنس کے بولی۔

''شیخ صاحب! تھانیدار ہو کے بھی.....''

اس کا ادھورا جملہ اور پھر معنی خیز خاموشی کے ساتھ بولتی آنکھیں جو چیلنج دیتی محسوس ہوتی تھیں، میرے لیے مزے کی چیز تھیں، اس نے چھاتی نہیں ڈھانپی تھی، میں ابھی مناسب جواب سوچ رہا تھا کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے گال پر چٹکی کاٹی اور بولی اب اتنے پارسا ہونے کا بھی کیا فائدہ، میں کوئی نیک پاک بندہ تو تھا نہیں، عورت کا وجود میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھا۔ وہ اپنی خوشی سے گود میں گرنا چاہتی تھی، تو مجھے کیا پڑی تھی کہ روکتا پھرتا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس کا آغاز ہی انوکھا تھا میرے اوپر گری پڑی اور میرا چہرہ اپنی چھاتی میں دبا لیا، اس نے بہت پیاری پرفیوم لگا رکھی تھی، اس کے ہاتھ میری پیٹھ پر مچل رہے تھے اور میرا چہرہ اس کے جسم کی نرماہٹوں میں دبا جا رہا تھا، میں نے سر پیچھے ہٹایا تو اس نے تیزی سے اپنی قمیض اتار پھینکی اور ہر بندش سے خود کو آزاد کر کے پھر مجھے ویسے ہی دبوچ لیا، اس کی یہ جارحیت میرے لئے انوکھی بھی تھی اور مجھے ایک نئے سرور میں کھینچے چلی جا رہی تھی۔ فطری طور پر میں وہاں پہنچا جہاں اللہ نے معصوموں کا رزق رکھا تھا لیکن پکے گناہگار پہلا ڈاکہ وہیں پر ڈالتے تھے۔

اس دن مجھے اس نے جسمانی تعلق کے ایک نئے روپ سے آشنا کیا، مجھے ان جہانوں کی سیر کروائی جو آج تک میرے لیے اجنبی تھے، میں سرور کی ان وادیوں سے گزرا جہاں سے پہلے میرا گزر نہیں ہوا تھا، لیکن اس رات کی صبح اس کے لئے بھی تحیر کا ایک نیا جہاں لیے اس کی منتظر تھی، جیسے ہی صبح کاذب کے

آثار نمایاں ہوئے، میں نے ایک جھٹکے سے اپنا آپ چھڑایا اور اسے پیٹنا شروع کر دیا تین چار چانٹے اور دو ایک ٹھوکریں لگانے کے بعد میں اس کے ننگے بدن پر تھوک کر اس کے گھر سے باہر نکل گیا۔ اس دن میں نے ندیم کے گھر پر چھاپہ مارا اور چرس اور پسٹل برآمد کر کے اس پر دو اور پرچے بھی دے دیئے۔

دو تین دن تک اس کا فون نہ آیا، میں بھی اپنے معمولات میں مصروف رہا، ایک شب رات ایک بجے میرے موبائل کی گھنٹی بجی، میں نے دیکھا تو اسی کا نمبر تھا، مجھے کچھ پشیمانی کا احساس تھا، میں نے کال اٹینڈ کی اور پوچھا۔

''کیوں کال کی ہے۔'' بولی۔

''جو کمینہ پن تم نے میرے ساتھ کیا تھا اس کا بہترین جواب میں تمہیں دے سکتی تھی لیکن ایک دنیا دیکھ چکی ہوں، جان گئی تھی کہ تم اس کتے پن پر مجبور ہو، بتاؤ کیوں ایسا کیا تھا۔''

مجھے ایسے لگا جیسے میری استانی جی نے میری کوئی غلطی پکڑ لی ہے اور اب مجھے سچ بولنا ہی پڑے گا۔ میں نے اسے بتایا۔

''میں اس کی وجہ نہیں جانتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں جس عورت سے ملتا ہوں اسے استعمال کرنے کے بعد بے اختیار اسے مارنے لگتا ہوں مجھے اس سے شدید نفرت محسوس ہوتی ہے، مجھے اس سے شدید گھن آتی ہے، لیکن یہ کیفیت کچھ دیر بعد خود بخود ختم بھی ہو جاتی ہے، ہاں، دل کی بے چینی دو تین دن تک رہتی ہے۔''

وہ بھی اپنے مزاج کی ایک الگ قسم کی ڈھیٹ واقع ہوئی تھی، بولی۔

''مجھے نہیں پتا، جو وضاحت کرنی ہے یہاں آ کر کرو۔''

قصہ مختصر میں اس شب اس کے گھر گیا اور اس کے بعد تھانے میں میرا کمرہ، انتظار کرتا رہ گیا کہ میں وہاں بھی کبھی آرام کروں۔ اب میں وہاں صرف ڈیوٹی کے لیے جاتا تھا، (میں نے اپنے آفس میں ہی ایک بیڈ بھی لگا رکھا تھا اور ڈیوٹی ختم کر کے وہیں سو جایا کرتا تھا)۔ میں ان دنوں اسی کے ساتھ مقیم تھا۔ اس دن میں جب اس کے گھر پہنچا تو اس نے اپنے دو بچوں سے مجھے ملوایا، اس کی بیٹی سمیرا چار سال کی تھی بیٹا اسامہ تین سال کا۔ سمیرا بالکل گڑیا جیسی تھی سرخ و سفید رنگت، سنہرے بال، سبز آنکھیں جنہیں پٹ پٹا کر جب وہ بات کرتی تو بے اختیار اسے چوم لینے کو جی چاہتا تھا، اسامہ اس سے بھی زیادہ پیارا تھا موٹا سا گول مٹول بچہ جسے موٹی موٹی بولتی آنکھیں گویا ماں کی جانب سے ملی تھیں۔ اسامہ نے بالکل اجنبیت نہیں برتی اور جھٹ سے میری گود میں آ گیا، مجھے ایسے لگا کہ جیسے وہ میرے ہی وجود کا حصہ ہو، میں نے اسے بے تحاشہ پیار کیا وہ اسی انداز سے مسکرا کر میری جانب دیکھتا رہا، وہ خاموش تھا لیکن اس کی آنکھیں بولتی تھیں، وہ کہتی

تھیں کہ ہم پیار کے ترسے ہوئے ہیں، ہم باپ کی محبت سے نا آشنا ہیں، اور ان میں ایک سوال تھا، ہمیں چھوڑ تو نہیں جاؤ گے۔

نجمہ نے جانے میرے اوپر کیسا جادو کیا، وہ دن بھر میری خدمت کرتی، اس کے بچے میرے ساتھ کھیلتے رہتے، خاص طور پر اسامہ میرے بہت قریب ہو گیا تھا، مجھے بھی اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ رات کو نجمہ انہیں دوسرے کمرے میں سلا کر میرے پاس آ جاتی، ہر رات اس کے انداز میں ایک نئی گرمجوشی ہوتی تھی، اور ہر صبح کی مار اور تذلیل بھی گویا اس نے ایک معمول کے طور پر قبول کر لی تھی، اس دوران نجمہ نے اپنے کام کے اوقات بھی بدل دیئے تھے، اب وہ صرف دن کے وقت دھندہ کرتی تھی جب میں تھانے میں ہوتا تھا رات کو اس کے دونوں موبائل آف ہو جاتے تھے۔ مجھے اکثر یہ احساس ہوتا تھا کہ میں غلط کر رہا ہوں لیکن کبھی نجمہ کے جسم کا نشہ اور کبھی اسامہ کی محبت میرے پاؤں کی زنجیر بن جاتی۔ خاص طور پر اسامہ سے میں اتنا مانوس ہو چکا تھا کہ اس کے بغیر جینے کا تصور اب محال نظر آتا تھا۔

اس رات میری گشت تھی۔ رات دو بجے میں نے ڈرائیور کو نجمہ گی گلی کی جانب چلنے کو کہا اور علاقہ کے شروع کے ایک چوک میں گاڑی رکوا دی۔ ہوٹل والے کو اشارہ کیا کہ ڈرائیور کو چائے وغیرہ دے اور خود پیدل گھر کی جانب چل دیا، گھر کی ایک چابی میرے پاس ہوتی تھی، آج پہلا موقع تھا کہ میں ڈیوٹی کے دوران گھر جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی لیکن مجھے نجمہ کا ایک ایک انگ یاد آ رہا تھا، میں نے سوچا ایک گھنٹے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کوئی کال آئی تو ڈرائیور مجھے فون پر بتا دے گا۔ یہی سوچ کو میں مطمئن انداز میں گھر کی جانب بڑھتا جا رہا تھا، گلی میں تاریکی تھی، میں نے دروازے میں چابی گھمائی اور کھول کر بے آواز اندر چلا گیا، میں نے سوچا، شاید نجمہ نے بچوں کو اپنے پاس سلایا ہو، کہیں ان کی آنکھ نہ کھل جائے، میں نے کمرے کا دروازہ کھولنے سے پہلے عادتاً کھڑکی سے دیکھا تو مجھے بیڈ پر دو انسان نظر آئے، نجمہ ایسی حرکت کرے گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، وہ اتنی ہی گرم جوشی اور خلوص سے کسی غیر کے ساتھ مصروف تھی۔ میں نے زور سے دروازہ بجایا اور کمرے میں کھلبلی مچ گئی، کون ہے، نجمہ کی سخت آواز گونجی، گشتی دروازہ کھول، میں نے آواز دبا کر کہا۔ دروازہ تو نہیں کھلے گا، جو کر سکتے ہو کر لو، نجمہ بھی کوئی معمولی شے نہ تھی، میرا جی چاہا کہ دروازہ توڑ دوں لیکن یک دم جیسے میں سوتے سے جاگ گیا، شیخ جی کیا کر رہے ہو، تمہارا اس سے تعلق کیا ہے، دنیا والوں کو کیا بتاؤ گے کہ کیوں ایک غیر عورت کے گھر مار پیٹ کر رہے ہو، اگر یہ بندہ تمہارے ہاتھوں مارا گیا تو قتل تو گلے پڑے گا ہی محکمہ میں جو بدنامی ہو گی وہ الگ، بہتر ہے خاموشی سے نکل چلو، میں نے دماغ کی آواز پر کان دھرا اور نکل آیا۔ اس کے بعد صبح تک گشت میں نے صرف یہی سوچتے ہوئے کیا کہ مجھ سے اتنے دن تک کیا حماقت سرزد ہوتی رہی۔

یہ دوسرے دن کا ذکر ہے۔ میں کسی کام سے ایک ساتھی تھانیدار کے کمرے تک گیا ابھی دروازے سے کچھ دور تھا کہ اپنا نام سن کر وہیں رک گیا دونوں میرے دوست تھے ایک اے ایس آئی تھا اور دوسرا سب انسپکٹر، ایک کہہ رہا تھا؛ "شیخ بھی عجیب آدمی ہے یار، دلہ بن جائے گا ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔ دوسرا بولا۔ ''نجمہ گشتی کو کون نہیں جانتا یار، مجھے تو اب شیخ کو دوست کہتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے، ان سالیوں کو ایک رات سے زیادہ سر نہیں چڑھانا چاہئے، یہ سالا تو اس کا خصم بن کر بیٹھ گیا، حد ہے یار.....'' میں الٹے قدموں واپس ہو گیا، میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اسی صبح میں نے ایس پی صاحب سے درخواست کر کے اپنا تبادلہ پولیس لائن میں کروالیا، مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ فیلڈ میں نکل کر نوکری کر سکوں۔ دو تین ماہ لائن میں گزارے اور اس دوران اپنے شہر میں ٹرانسفر کی کوششیں کرتا رہا آخر ایک دن میرا ٹرانسفر میرے آبائی ڈسٹرکٹ میں ہو گیا اور میں نے سکھ کا سانس لیا۔ اس دوران نجمہ نے کئی بار کال کی لیکن میں نے اس کی آواز سنتے ہی کال کاٹ دی، اس نے منت بھی کی لیکن میں بھلا اس کی بات کیسے سن سکتا تھا، اس نے میسیج بھی کیے جن میں اس کا یہی کہنا تھا کہ وہ اس کا پرانا گاہک تھا اور ضد کر بیٹھا تھا کہ وہ نجمہ کے گھر ہی رات گزارے گا۔ مجھے اس کے ایس ایم ایس سے بھی گھن آ رہی تھی میں نے ڈیلیٹ کر دیا۔

تین سال گزر گئے۔ ایک دن میں کسی کام سے راولپنڈی گیا۔ ایک گلی میں مڑ رہا تھا کہ اچانک نجمہ سامنے آ گئی وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔ میں نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگا تو اس نے بلند آواز سے پکارا؛ ''شیخ جی میری بات سن لو۔'' میں رک گیا، وہ پھر وہی وضاحت کرنے لگی کہ اس دن وہ مجبور ہو گئی تھی، اس کا کہنا تھا کہ وہ میری خاطر ہر غلط کام چھوڑنے پر تیار ہے، پتا نہیں میرے دماغ کو کون سی سنک چڑھی میں نے پوچھا، اسامہ کا کیا حال ہے، بولی شیخ جی، اسامہ تو مر گیا۔ اس کی بات سن کر مجھے دھکا سا لگا، دل رک سا گیا، آنکھوں میں اس معصوم کا سراپا گھوم گیا، میری آنکھوں کی نمی بغاوت پر آمادہ تھی میں نے اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر غم کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کی آنکھوں کا کاجل ویسا ہی تھا، وہ بڑے نارمل انداز میں بتا رہی تھی کہ ایک سال ہو گیا، اسے بخار ہوا تھا دو دن بیمار رہا اور تیسرے دن مر گیا، ایسے تو کوئی کسی پڑوسی کا ذکر بھی نہیں کرتا جیسے وہ اسامہ کا کر رہی تھی۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا ارد گرد سے ہر چیز گویا غائب ہو چکی تھی مجھے صرف اس کی کاجل بھری آنکھیں نظر آ رہی تھیں جن میں شوخی تھی، شرارت تھی اور غم کی پرچھائیں تک نہ تھی، یہ آنکھیں پتا نہیں کیوں مجھے اٹھارہ سال پیچھے لے گئیں۔

ان دنوں میں میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ شیخ احمد ماموں ہماری امی کے کزن تھے، اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے، میری امی ان سے بہت بے تکلف تھیں، ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی سہیلیوں میں لے

جاتیں اور کہتیں، یہ ہے میرا بھائی شیخ احمد، ہم انہیں شیخ ماموں کہا کرتے تھے، میں نے کبھی ان کے بارے میں تجسس سے نہیں سوچا، مجھے وہ امی کے سگے بھائی لگتے تھے۔ ان دنوں میں نے گھر والوں سے چھپ کر ایک موٹر مکینک کے پاس بیٹھنا شروع کیا تھا، مقصد یہ تھا کہ ریزلٹ آنے تک کم از کم گاڑی کی دیکھ بھال ہی سیکھ لوں۔ ایک دن ورکشاپ میں دل گھبرا سا گیا، پتا نہیں کیوں ایک عجیب سی بے چینی نے ایسے آن گھیرا کہ میں استاد کو بتا کر گھر کی جانب چل پڑا، ابو اپنے دفتر میں تھے اور بہن بھائی اسکول گئے ہوئے تھے، گھر میں صرف ایک نوکرانی تھی جو کچن میں کام کر رہی تھی۔ میں گھر میں داخل ہوا اور امی کو آوازیں دینے لگا۔ میرا ایمان تھا کہ وہ آیاتِ قرآنی پڑھ کر پھونکتی ہیں اور میرے دل کو سکون مل جاتا ہے۔ امی نے جواب نہ دیا ایک کمرے کا دروازہ بند تھا، میں نے بجایا تو نوکرانی بے چین سی ہو گئی اور بولی۔ ''صاحب آپ اپنے کمرے میں جاؤ بیگم صاحبہ آتی ہیں۔'' میں وہیں کھڑا ہو گیا کہ بات کیا ہے۔ اتنے میں امی کمرے سے باہر نکلیں ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے بولیں۔ ''تمہارے شیخ احمد ماموں کو مجھ سے کوئی مشورہ کرنا تھا اسی لیے اس کمرے میں بات کرنے آ گئے تھے۔ آؤ اپنے ماموں سے ملو۔ میں خاموشی سے اندر داخل ہوا تو شیخ احمد ماموں خجل سے بیٹھے تھے۔ میں نے بھی اکھڑی اکھڑی سی ایک آدھ بات کی اور انہوں نے امی کو اونچی آواز میں بتایا کہ اچھا بھئی میں چلتا ہوں، اس دن سے میں نے ان کے تعلق کو ایک نئے زاویئے سے دیکھنا شروع کیا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ دال ساری کی ساری کالی ہو چکی ہے، اور پھر ایک دن میں نے اپنی سگی ماں کے منہ سے وہ سنا جس کا میں کبھی مر کر بھی یقین نہیں کر سکتا تھا۔

دوپہر تھی، میں اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ شیخ احمد ہمارے گھر کب آیا، میں تو کچن میں رکھی فریج سے پانی پینے آیا تھا۔ ہمارا کچن ایسے بنا ہوا تھا کہ باہر سے پتا نہیں چلتا تھا کہ اندر کوئی ہے یا نہیں مجھے ملحقہ کمرے سے امی اور شیخ احمد نکلتے نظر آئے۔ وہ امی سے کہہ رہا تھا۔ ''تم مانو یا نہ مانو مجھے لگتا ہے سعدی کو شک ہو گیا ہے۔'' امی بولیں۔

''دیکھو میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی اگر بات بن گئی تو ٹھیک ورنہ اپنے کسی کارندے سے ایک گولی چلوا دینا، تمہارے لیے کون سی نئی بات ہے۔''

میرے کانوں میں جیسے پگھلتا ہوا سیسہ اتر گیا۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ ایک ہفتے بعد ہی شیخ احمد ہمارے گھر سے واپس جاتے ہوئے گاڑی کی بریکیں فیل ہونے پر سٹیئرنگ پر قابو نہ رکھ سکا اور ایک گہری کھائی میں گر کر بری حالت میں مردار ہوا۔ کسی کو خیال بھی نہیں آیا کہ گاڑی کی بریک فیل ہونا حادثہ نہیں ہے۔ میں امی کے ساتھ اس کے جنازے پر بھی گیا۔ کئی ماہ تک امی کی حالت نہیں سنبھل سکی۔ میں آج بھی

ان کے ساتھ ایسا رویہ رکھتا تھا کہ انہیں کبھی معمولی سا شک بھی نہیں ہوا کہ شیخ احمد کے قتل میں میرا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ میں بچہ نہیں تھا۔ میری غیرت کبھی گوارہ نہیں کرسکتی تھی کہ کوئی میری اور میرے باپ کی عزت سے کھیلتا پھرے۔ میں اسے قتل کرنے کا منصوبہ تو بنا ہی چکا تھا۔ بریکس کو ایسے خراب کرنا کہ گاڑی کچھ کلومیٹر چلنے کے بعد خراب ہو، میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

میں نے کبھی امی کو شک نہیں ہونے دیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح میرے اوپر قرآنی آیات پڑھ کو پھونکتیں، مجھے دعائیں دیتیں لیکن مجھے یہ سب کچھ بناوٹ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ سب گزر گیا لیکن میرے دماغ میں ایک سوال کا کالا ناگ بٹھا گیا جو ہر پل میری سوچوں کو ڈستا رہتا تھا۔ کیا کوئی عورت خود اپنے بچے کو مروانے کی بات کرسکتی ہے؟ کیا اس کے دل میں مامتا کی ایک رمق بھی نہیں تھی؟؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ماں کے دل سے مامتا ختم ہوجائے؟؟؟

''شیخ جی، شیخ جی'' نجمہ کی آواز مجھے ماضی کے دھندلکوں سے حال کی تلخ دنیا میں واپس کھینچ لائی۔

''ہاں'' میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا، اس کی آنکھوں میں اب بھی وہی چمک تھی، وہی کاجل کی مستی، وہی شرارت، وہی شوخی، کیا یہ ایک ایسی ماں کی آنکھیں تھیں جس کا بچہ منوں مٹی کے نیچے جا سویا تھا؟ مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ ایک بدکار عورت، ایک بدکردار عورت کیسے ماں بن سکتی ہے، اس کے وجود سے نئی زندگی تو تشکیل پاتی ہے لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ اسے وہ رتبہ بھی دے دے جو اس نے ایک ماں کو دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میرا اللہ بہت بڑا احسان کرنے والا ہے وہ اپنے وعدے کی پابندی نہیں کرے گا تو بھلا کون کرے گا۔ اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر ماں کے قدموں تلے جنت رکھ دیتا ہے، جس ہستی کے پیروں میں جنت ہو، بھلا کون ہوگا جو اسے اس میں داخل ہونے سے روکے، گویا ماں ہونا اتنی بڑی نعمت ہے جسے کسی گناہگار کو دیئے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اس لیے اللہ ہر بدکردار عورت سے اس کا ماں بنا چھین لیتا ہے اس کے دل سے اپنی اولاد کی محبت نکال دیتا ہے۔ وہ اس انعام کی حقدار نہیں رہتی جس کا اللہ نے ہر ماں سے وعدہ کیا ہے۔ گشتی کسی کی ماں نہیں ہوتی۔ گشتی میں مامتا کہاں؟ میری آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہنے لگے، میں پلٹ کر بھاگا۔

''شیخ جی.....شیخ جی.....'' نجمہ کی آوازیں دیر تک میرا پیچھا کرتی رہیں۔

◀◀ ● ▶▶

H. No. 1444, Jail Road,
Awan Sharif, Attock City, Punjab, Pakistan.
Postal Code: 43600, Contact Number: 03335191523

● سلیم سرفراز

بددعا کرنے والے

میں یہ انتہائی قدم نہ اٹھاتا لیکن ناگہانی طور پر پیش آنے والے واقعات کے بعد میں بہت دل برداشتہ ہوگیا تھا۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں ان سے انتقام لے سکتا اور نہ ہی قانون کے ذریعہ انہیں سزا دلوا سکتا تھا۔ انصاف کی طرف جو راستے جاتے تھے ان کے ہر موڑ پر ایسے راہزن بیٹھے ہوئے تھے جو مال و متاع بھی لوٹ لیتے اور وہاں تک پہنچنے بھی نہیں دیتے۔ یہ بڑی اذیت ناک صورت حال تھی۔ ایک آزاد اور جمہوری ملک میں ظلم و ناانصافی کے ایسے مناظر اس کے خدوخال کو مسخ کرتے تھے۔ اس چھوٹے سے شہر کے ایک چھوٹے سے گھر میں میری رہائش تھی۔ گھر پر میری دائمی مریضہ بیوی اور ایک سن بلوغ کو پہنچ چکی بیٹی تھی۔ میں ایک نجی کمپنی میں ملازم تھا۔ دن بھر کی محنت شاقہ کے عوض مہینے کے آخر میں تنخواہ کے نام پر جو رقم ملتی تھی وہ ہم تینوں کی کفالت کے لیے ناکافی تھی۔ اس پر میری بیوی کی دواؤں کا خرچ ایک اضافی بار تھا۔ وہ تو میری بیٹی بے حد حساس اور سمجھدار تھی کہ اس نے کالج میں داخلے کے بعد ہی کچھ ٹیوشن پکڑ لیے تھے جن سے نہ صرف اس کے تعلیمی اخراجات پورے ہوجاتے بلکہ گھر کی دیگر ضروریات کی مد میں بھی تھوڑی مدد ہوجاتی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد وہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرتی اور پھر بچوں کو پڑھانے نکل جاتی۔ رات نو بجے تک اس کی واپسی ہوتی تو وہ بے حد تھکی ہوئی ہونے کے باوجود کھانا پکانے میں اپنی بیمار ماں کی مدد کرتی۔ رات دس ساڑھے دس بجے کے قریب میں گھر آتا اور کھا پی کر سو جاتا۔ عجب بے رس اور تیرگی زدہ زندگی تھی۔

امید کی بس ایک ننھی سی کرن تھی کہ میری بیٹی تعلیم مکمل کر کے کسی معقول ملازمت سے لگ جائے گی تو شاید ہمارے خزاں رسیدہ شب و روز میں تھوڑی سی بہار آجائے لیکن یہ امید کی کرن بھی.....ایک رات میری بیٹی نے قدرے جھجکتے ہوئے بتایا کہ جب وہ کالج جاتی ہے تو راستے میں دو تین آوارہ لڑکے اسے چھیڑتے ہیں، تعاقب کرتے ہیں اور آوازے کستے ہیں۔ ان میں سب سے پیش پیش اپنے ہی علاقے کے چودھری جی کا بیٹا ہوتا ہے۔ چودھری صاحب کو میں پہچانتا تھا۔ خاصے شریف اور عبادت گزار شخص تھے۔ جب کبھی علاقے کی مسجد میں جانا ہوتا، ان سے ملاقات ہوجاتی۔ ہمیشہ سلام میں پہل کرتے۔ بے حد نرمی

اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ مجھے دکھ ہوا کہ ان کا لڑکا ان شورہ پشتوں کا سرغنہ ہے۔ دوسرے روز میں ان سے ملا اور انہیں ان کے لڑکے کی نازیبا حرکت سے آگاہ کیا۔ انہوں نے خاموشی سے میری شکایت سنی اور پھر سنجیدگی سے کہا۔

''میں اسے تنبیہ کروں گا کہ آئندہ ایسی بدتمیزی نہ کرے۔'' قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولے۔

''لیکن تمہیں بھی خیال رکھنا چاہیے کہ جوان لڑکی کو تنہا باہر نہ بھیجا جائے، سخت ممانعت ہے۔''

''وہ تعلیم حاصل کرنے کالج جاتی ہے۔ اب کیا اس کا کالج جانا بند کروادوں۔'' میں نے حیرت سے کہا تو وہ مبلغانہ انداز میں بولے۔

''لگتا ہے تم دین و مذہب سے بالکل بیگانے ہو۔ دین میں سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ بالغ لڑکی بغیر کسی محرم کے گھر سے باہر قدم نہ نکالے اور پھر کالج کا علم تو شیطانی علم ہے جسے حاصل کرنا گناہ ہے۔ میری مانو تو اس کی پڑھائی بند کروا کے گھر بٹھاؤ اور جلد سے جلد اس کا کہیں نکاح کروادو۔''

میں حیرت زدہ سا ان کے باریش چہرے کو دیکھتا رہا۔ مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ بظاہر معقول سے نظر آنے والے چودھری صاحب اس قدر دقیانوسی اور فرسودہ خیالات کے حامل ہوں گے۔ یہ تو نیم جاہل قصباتی ملاؤں والے خیال تھے جبکہ میں انہیں ایک جہاندیدہ اور روشن خیال فرد تصور کرتا تھا۔ میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو انہوں نے پھر کہا؛

''میرے مشورے پر عمل کرنا۔ فلاح پاؤ گے۔''

اب میں سوچتا ہوں کہ کاش میں نے ان کے احمقانہ مشورے پر عمل کیا ہوتا تو یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔ اس رات میں حسب معمول کام سے واپس آیا تو میری بیوی متفکر اور پریشان سی میری منتظر تھی۔ اس نے بتایا کہ میری بیٹی اب تک گھر نہیں لوٹی ہے تو میں بھی فکرمند ہو گیا۔ وہ نو بجے سے قبل ہی گھر آ جاتی تھی جبکہ اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اگر اسے کہیں رکنا ہوتا تو یقیناً اپنی ماں سے کہہ کر جاتی۔ میں دل میں ڈھیر سارے خدشات لیے الٹے پیروں باہر نکل آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ آخری ٹیوشن کہاں کرتی ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر میں دروازے پر ایک بوڑھا شخص نظر آیا۔ میں نے اپنی بیٹی کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے تعجب سے کہا۔

''وہ تو میری پوتیوں کو پڑھا کر کب کی چلی گئی۔ شاید آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے۔ کیا وہ اب تک گھر نہیں پہنچی؟''

میں نے اپنی پریشانی اس سے چھپاتے ہوئے کہا۔

''نہیں.....! شاید اپنی کسی سہیلی کے یہاں رک گئی ہو۔''

میں دھڑکتے دل کے ساتھ پھر گھر آیا کہ شاید وہ آ گئی ہو۔ لیکن وہاں میری بیوی تنہا ہلکان ہو رہی تھی۔ اس نے پرامید نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''کچھ پتہ چلا.؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ سمجھدار اور باہمت لڑکی ہے۔ کسی وجہ سے کہیں ٹھہر گئی ہو گی۔ جلد ہی آ جائے گی۔''

میں نے محسوس کیا کہ میری آواز میں یقین کم اندیشے زیادہ ہیں۔ اب میں اسے تلاش کرنے کہاں جاتا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں بند ہو چکے تھے۔ میں کس کے گھر جاتا۔ میری تو یہاں کسی سے ایسی شناسائی بھی نہیں تھی کہ اس سردی میں میری مدد کو آتا۔ میں اور میری بیوی رات بھر جاگتے رہے اور ہر آہٹ پر چونکتے رہے۔ فجر کی اذان ہوئی تو میری بیوی مصلے پر جا بیٹھی۔ نماز پڑھ لینے کے بعد وہ دیر تک دعا مانگتی رہی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی خیر و عافیت سے گھر لوٹنے کی ہی دعا مانگ رہی ہو گی۔ میں اداس آنکھوں سے اس کے نحیف و ناتواں سراپے کو دیکھتا رہا۔ معاً دروازے پر دستک ہوئی تو میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ میری بیوی بھی دعائیں بھول کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی جو اب زور زور سے کھٹکھٹایا جانے لگا تھا۔ میں نے چٹخنی گرائی اور پٹ کھول دیئے۔ سامنے خاکی وردی میں ملبوس پولیس والوں کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بڑی مشکل سے میرے لبوں کو جنبش ہوئی۔

''کیا بات ہے؟''

سامنے کھڑے پولیس انسپکٹر نے کہا۔

''اس علاقے کے قبرستان کے پاس درخت سے لٹکی ہوئی ایک جوان لڑکی کی لاش ملی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے۔ چل کر شناخت کرو۔''

میں گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ میری بیوی تڑپ کر چیخی اور غش کھا کر مصلے پر گر پڑی۔ مجھ میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ آگے بڑھتا اور اسے دیکھتا کہ جیتی ہے یا مر گئی۔ پولیس انسپکٹر نے بے حس لہجے میں کہا۔

''دیر ہو رہی ہے۔ آگے کی قانونی کارروائی بھی کرنی ہے۔ تم لاش شناخت کر کے اپنا بیان درج کرواؤ۔'' اس نے ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا تو اس نے آگے بڑھ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

''چلو!''

میں کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑا۔قبرستان کے قریب پہنچا تو وہاں بھیڑ جمع تھی۔وہ پیپل کا درخت تھا جس کی ایک موٹی شاخ سے میری بیٹی..... ہاں میری ہی بیٹی کی نیم برہنہ لاش جھول رہی تھی۔اس کے کپڑے تار تار تھے اور جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔میں نے اسے شناخت کیا اور پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔حواس واپس آئے تو دیکھا کہ کوئی مجھے سنبھالے ہوئے گھر کی طرف لا رہا ہے۔گھر میں میری بیوی اسی طرح مصلے پر پڑی ہوئی تھی۔میرے ساتھ آنے والا شخص اس کے قریب پہنچا۔نبض دیکھی اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور وحشت زدہ سی خود پر جھکے چہرے کو تکتی رہی۔اچانک اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور جیسے اسے سب کچھ یاد آ گیا۔وہ بڑبڑائی۔

''میری بیٹی.....کیا وہ لاش میری بیٹی کی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی تو وہ ڈھاریں مار کر رو پڑی۔مجھے چکر سے آ رہے تھے۔میں سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گیا۔میری بیوی کی گریہ وزاری کی آواز سن کر پڑوس کی کچھ عورتیں گھر میں آ گئیں اور میری بیوی کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں۔میرے ساتھ آنے والے شخص نے مجھے مخاطب کیا۔

''آپ گھر پر ہی رہیں۔سارے معاملے ہم لوگ سنبھال لیں گے۔''

میری بیٹی کی لاش ہسپتال لے جائی گئی۔پوسٹ مارٹم ہوا اور پھر گھر لایا گیا۔پڑوسیوں نے ہی سارا انتظام کیا اور سہ پہر کو اس کی تدفین کر دی گئی۔لوگوں کی باتوں سے مجھے علم ہو گیا تھا کہ میری بچی کی اجتماعی طور پر عصمت دری کی گئی تھی اور پھر اسے قتل کر کے لاش پیڑ سے لٹکا دی گئی تھی۔انہوں نے سرگوشیوں میں چودھری جی کے بیٹے اور اس کے دو ساتھیوں کے نام بھی لیے تھے۔مجھے یقین تھا کہ یہ درندگی انہوں نے ہی کی ہوگی۔رات گئے پولیس پھر آئی۔مجھ سے پوچھ تاچھ کی گئی تو میں نے ان لڑکوں پر شبہے کا اظہار کیا۔

''تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟''

پولیس افسر نے سخت لہجے میں پوچھا تو میں نے بے چارگی سے پڑوسیوں کی سمت دیکھا لیکن وہ سب کے سب مہر بہ لب رہے۔میں نے شکست خوردہ انداز میں سر کو جھکا لیا۔

بغیر کسی ثبوت کے کسی پر انگلی نہ اٹھاؤ،''اس نے تنبیہ کی۔''ہم تحقیقات کر رہے ہیں۔بہت جلد مجرموں کو حراست میں لے لیا جائے گا۔''

پولیس چلی گئی۔لوگ بھی چلے گئے۔میں اپنی غم زدہ اور بیمار بیوی کے پاس چلا آیا۔میں جانتا تھا کہ پولیس محض خانہ پری کر کے اس کیس کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دے گی۔چودھری صاحب کا بیٹا اور اس کے ساتھی برسر اقتدار جماعت کے فعال اور بولڈ کارکن تھے۔ان کی پشت پر ان بااثر سیاسی رہنماؤں کا ہاتھ

تھا جن کے اشاروں پر وہ مخالف جماعت کے افراد کیساتھ محاذ آرائی کرتے رہتے تھے۔ان رہنماؤں کی حمایت کی وجہ سے پولس افسران بھی ان کے خلاف کارروائی کرنے سے قاصر تھے۔بیٹی کے غم میں میری بیوی بستر سے لگی تو پھر اٹھ نہ سکی۔پندرہویں روز میرے گھر سے ایک اور جنازہ اٹھا اور میں بالکل ٹوٹ کر رہ گیا۔میری بیوی بیمار ہی سہی میری غم گسار تو تھی، میرا سہارا تو تھی۔میں اس کی تکلیف اور لاچاری کو محسوس کر کے اپنے غموں کو فراموش کرنے کی سعی کر رہا تھا۔وہ نہیں رہی تو مجھے اپنی تنہائی اور شکست خوردگی کا شدید احساس ہوا۔میں روشنی کی جن نحیف کرنوں کے سہارے دبیز تیرگی میں کسی طرح سفرِ حیات جاری رکھے ہوئے تھا، جب وہی نہیں رہیں تو اس سفر کا کیا جواز تھا،اور میں نے اس تکلیف دہ سفر کو یہیں ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔رات کے آخری پہر میں گھر سے نکل پڑا۔ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد میں اس پل پر کھڑا تھا جس کے نیچے پرشور دریا بہہ رہا تھا۔صبح کے آثار نظر آنے لگے تھے۔میں نے آنکھیں بند کیں، اپنی معصوم بیٹی اور مرحومہ بیوی کو یاد کیا، اپنی غربت اور ناتوانی پر لعنت بھیجی اور پھر دریا میں چھلانگ لگا دی.....

مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح کچھ آوازیں میری سماعتوں سے ٹکرائیں تو میری آنکھیں کھل گئیں۔اوپر بوسیدہ سی چھت دکھائی دی تو مجھے حیرانی ہوئی۔کیا مجھے دریا کی موجوں سے بچا لیا گیا۔میں نے نگاہوں کا زاویہ تبدیل کیا۔بڑا سا ہال نما کمرہ تھا جس میں بیسوں افراد موجود تھے. دو یا تین افراد کچھ کچھ فاصلے پر بیٹھے سرگوشیوں میں محوِ گفتگو تھے۔میرے بستر کے سامنے ایک باریش بزرگ ایک جون العمر شخص کو جانے کیا سمجھا رہا تھا۔معاً ان کا دھیان مجھ پر گیا اور دونوں میری طرف لپکے۔میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو بزرگ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور بے حد نرمی سے کہا۔

''اٹھو نہیں۔تمہیں نقاہت محسوس ہوگی۔تم پر بہت دیر غشی طاری رہی ہے۔''

''لیکن میں یہاں کیسے پہنچا؟''میں تو اپنی جان دینے کے لیے دریا میں کود گیا تھا۔''

''ہم میں سے کچھ لوگ تمہیں موجوں سے محفوظ نکال لائے۔''

''لیکن آپ لوگ کون ہیں؟''میرے استفسار پر بزرگ نے کمرے میں موجود لوگوں پر نگاہ ڈالی اور قدرے توقف کے بعد گویا ہوئے۔

"ہم لوگ مختلف جگہوں کے رہنے والے ہیں۔اکثر یہاں آتے ہیں،مل بیٹھتے ہیں کیونکہ ہم لوگ مشترکہ طور پر ایک ہی کام کرتے ہیں۔''

''کون سا کام؟''

بزرگ نے لمحے بھر کو کچھ سوچا اور پھر کہا۔

''ہم لوگ بددعا کرتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''بہت سے ایسے ناتواں لوگ ہیں جو کسی شہ زور کے ظلم اور زیادتی کے شکار ہوتے ہیں۔ وہ ظالموں کے خلاف کچھ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ ہم لوگ ایسے مظلوموں کی خاطر ظالموں کے خلاف بددعائیں کرتے ہیں۔''

میں گہرے تعجب سے بزرگ کے سنجیدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ لوگ پہنچے ہوئے ہیں؟ آپ لوگوں کی بددعاؤں سے کیا ظالموں کا کچھ بگڑتا ہے؟''

''نہیں۔ ہم لوگ تمہاری طرح ہی عام آدمی ہیں۔ بس ہم میں ایک قدر مشترک ہے کہ ہم بھی ظلم و ناانصافی کے شکار ہوئے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہماری بددعاؤں سے ظالموں کو کوئی ضرر پہنچتا ہے یا نہیں لیکن ہمیں اطمینانِ قلب ہو جاتا ہے کہ ہم نے اپنا فرض پورا کیا۔''

''کیا بددعائیں کرنے کا کوئی معاوضہ لیا جاتا ہے؟'' میں حیرتوں کے حصار میں تھا۔

''نہیں، ہم لوگ رضا کارانہ طور پر یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ بس مظلوم کی رضامندی درکار ہوتی ہے۔''

''لیکن مظلوم کی شناخت کیسے کی جاتی ہے؟''

''مظلوموں کی شناخت کون سا مشکل مسئلہ ہے۔ ان کی مظلومیت تو چہرے پر تحریر ہوتی ہے بس اسے پڑھنے کی ضرورت ہے۔''

عجیب و غریب لوگوں سے سابقہ پڑا تھا۔ جی چاہا کہ انہیں اپنی رودادِ غم سناؤں لیکن اس سے قبل ہی وہ بولے۔

''ہمیں یقین ہے کہ تم بھی ہم میں سے ہو۔ اگر تم چاہو تو ہماری خدمات حاصل کر سکتے ہو۔ ہم تم پر ظلم کرنے والوں کے خلاف بددعائیں کریں گے۔''

میں نے ان کی پیشکش فوراً قبول کر لی۔ انہوں نے تفصیل سے میری دل دوز کہانی سنی۔ گہری ہمدردی ظاہر کی اور پھر کہا۔

''ہم میں سے کچھ لوگ آج ہی رات تمہارے گھر چلیں گے۔ تم کچھ کھا پی کر آرام کرو۔'' ان کے اشارے پر ایک شخص کھانے کا سامان لے آیا۔ انہوں نے اصرار کیا تو میں نے بڑی مشکل سے چند لقمے زہر مار کیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ کسی کے اٹھانے پر میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ وہی بزرگ تھے۔

''رات ہو گئی۔ اپنے گھر چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

میں انہیں ساتھ لے کر اپنے گھر روانہ ہوا۔ بزرگ کے ساتھ چار دیگر افراد تھے۔ گھر پہنچ کر میں نے دروازہ کھولا اور ہم سب اندر داخل ہوئے۔ وہ پانچوں کمرے کے درمیان حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ بزرگ نے ظالموں کے نام دریافت کیے۔ میں نے چودھری جی کے بیٹے اور اس کے دونوں ساتھیوں کے نام بتا دیئے۔ بددعا کی شروعات بزرگ نے ہی کی تھی اور پھر چاروں اس عمل میں شریک ہو گئے۔ عجب رقت آمیز اور کربناک آواز میں وہ لوگ نام لے کر ان ظالموں کے خلاف بددعائیں کرنے لگے تھے۔ بتدریج ان کی آوازیں رفتار پکڑتی گئیں اور پھر ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے لگا کہ کمرے کے در و دیوار کے بھی لب وا ہو گئے ہیں اور ان سے بددعائیں نکلنے لگی ہیں اور پھر یہ بددعائیں کمرے کے حدود سے نکل کر باہر پھیل گئی ہیں اور زمین و آسمان کی ساری مخلوقات اس عمل میں شریک ہو گئی ہیں۔ معاً مجھے محسوس ہوا کہ میرے رگ و پے میں ایک طمانیت کی لہر دوڑتی جا رہی ہے اور میرا مضطرب وجود پرسکون ہوتا جا رہا ہے۔ رات کے آخری پہر تک ان بددعاؤں کا سلسلہ چلتا رہا اور میری روح سرشار ہوتی رہی۔ آخر کار یہ سلسلہ بند ہوا اور وہ لوگ سجدے میں گر گئے۔ دیر تک سجدے کی حالت میں رہنے کے بعد انہوں نے ایک ساتھ اپنے سر اٹھائے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ لوگ میرے قریب آئے۔ بزرگ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دبایا اور دھیرے سے کہا۔

''اب ہم لوگ چلتے ہیں۔ آئندہ خودکشی کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ مظلوموں کی حمایت میں ظالموں کو بددعائیں دینے میں دل کو عجب سی راحت ملتی ہے، جینے کا حوصلہ ملتا ہے۔ کبھی ہمارے ساتھ بددعا کرنے کی کسی مجلس میں شامل ہو کر دیکھنا۔''

وہ لوگ پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا اور پرسکون محسوس کر رہا تھا جیسے میرے وجود سے یکلخت سارے غموں کے لبادے اتر گئے ہوں۔ بہت دنوں کے بعد میں گہری اور مطمئن نیند سویا۔ آنکھیں کھلیں تو دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر میری ساری نقاہت دور ہو چکی تھی اور میں بالکل تر و تازہ تھا۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے از سرِ نو زندگی کا سفر شروع کرنا ہے اور پوری استقامت سے اسے جاری رکھنا ہے۔ اس فیصلے سے مجھے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ میں اسی روز اپنی کمپنی میں گیا۔ مالک میری حالات سے آگاہ تھا۔ اس نے دوبارہ مجھے ملازمت پر بحال کر دیا۔ بہت سارے دن گزر گئے۔ اس دوران کچھ واقعات رونما ہوئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ان کی بددعاؤں کے اثر سے ہوئے یا محض اتفاق تھے۔ پہلا واقعہ تو یہ ہوا کہ موجودہ حکومت کی میعاد پوری ہو گئی اور نئے سرے سے انتخابات کرائے گئے۔ اس انتخاب میں برسرِ اقتدار جماعت بری طرح شکست کھا گئی اور حزبِ مخالف ایوانِ اقتدار میں داخل

ہوا۔نئی حکومت آئی تو مخالفین کے گڑے مردے اکھاڑے جانے لگے۔دوسرا واقعہ میرے لیے اس لحاظ سے بے حد اہم تھا کہ میری بیٹی کے مردہ کیس میں بھی جان ڈالی گئی اور تحقیقات کی ذمہ داری خفیہ ادارے کے سپرد کی گئی۔ ابتدائی تفتیش کی بنیاد پر ہی چودھری جی کے بیٹے اور اس کے دونوں مصاحب حراست میں لے لیے گئے۔مقدمہ سریع الرفتار عدالت میں پہنچا۔تعجب کی بات کہ ان کے خلاف پختے ثبوت کے ساتھ عینی شاہدین بھی مل گئے۔ عدالت نے اس جرم کی دہشت ناکی کے مدنظر تینوں ملزموں کو پھانسی کی سزا سنادی۔چودھری صاحب بیٹے کی گرفتاری سے پہلے ہی بری طرح شکستہ ہو چکے تھے،سزائے موت کے فیصلے سے بالکل ڈھ گئے اور بیٹے کی سزا پر عمل درآمد ہونے سے قبل ہی مرگِ عبرت سے ہمکنار ہوئے۔کچھ دنوں بعد تینوں گناہ گاروں کو پھانسی دے دی گئی تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔اس وقت مجھے بددعا کرنے والے لوگ یاد آئے اور میں ان سے ملنے کے لیے اس بڑے کمرے والے مکان تک پہنچا لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ دروازے پر تالے پڑے تھے اور مکان کے اردگرد سناٹا طاری تھا۔میں بوجھل قدموں سے واپس ہوا۔راستے کی بھیڑ میں ایک شناسا چہرے پر نگاہ پڑی تو مجھے یاد آیا کہ وہ اس روز بڑے کمرے میں موجود تھا۔میں نے اسے جالیا اور پیچھے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔اس نے پلٹ کر حیرت سے میری طرف دیکھا تو میں سرعت سے بولا۔

''تم بددعا کرنے والوں میں سے ہو نا؟'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس متجسس نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا۔میں نے اسے یاد دلایا۔''مجھے دریا میں ڈوبنے سے بچا کر اس مکان میں لایا گیا تھا جہاں تم بھی موجود تھے۔میں تم لوگوں سے ملنے آیا تھا لیکن مکان میں تالے پڑے ہیں۔سب لوگ کہاں گئے؟''

اس نے غور سے مجھے دیکھا تو آنکھوں میں پہچان کا عکس لہرایا۔قدرے توقف کے بعد اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

''نئی حکومت کو ہم مظلوموں کے بے ضرر وجود سے خطرہ محسوس ہوا۔اس نے ہمارے بددعا کرنے کے عمل کو خطرناک قرار دیا اور اس پر پابندی عائد کردی۔مکان پر تالے حکومت کی طرف سے ہی لگائے گئے ہیں۔اب وہ اسی کی تحویل میں ہے۔''

وہ شخص مڑا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔میں وہیں گم صم کھڑا گہری افسردگی سے اسے بھیڑ میں گم ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔

◂◂ ● ▸▸

J.N.Pharmacy ،K.T.Road,
Asansol North 7133O2 (W.B)
Mob: O9378291891

● سیمیں درانی

چھام چھاپ

شدید گرمی کے روز ے ملک نواز کو سب سے زیادہ محسوس ہو رہے تھے کہ بڑے ملک جی نے حویلی میں شراب نوشی پہ نہ صرف پابندی عائد کر رکھی تھی بلکہ تمام نائیکائیں بھی اپنی اپنی لڑکیوں کے ہمراہ خود کو بخشوانے میں مصروف تھیں۔بیش تر رنڈی خانے بند اور جوئے کے اڈے بھی سونے سونے سے لگتے تھے۔جھلائے ہوئے ملک نواز نے اپنی جیپ کا رخ بھٹے کی جانب موڑا تا کہ ہفتے کا بہی کھاتہ دیکھ سکے۔بیڑیوں کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔چھیماں دیوار کے سائے میں کھڑی گرمی اور شدت پیاس سے ہانپ رہی تھی اور اس کی ماں اپنے پیروں سے بندھی زنجیر ہلا ہلا کر اس کو تنبیہ کر رہی تھی کے ملک صاحب اس کو ہڈحرامی کرتے دیکھ نہ لیں۔

یہ بیڑیاں چھیماں کی پیدائش کے قصور کی سزا تھیں، جب دائی نے زچگی کے دوران خون زیادہ بہہ جانے کے باعث وزیراں کو اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا تو کرموں کے پاس ملکوں سے سود پہ قرض لینے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔سود کی سال بہ سال بڑھتی رقم نے تینوں کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کے ان کو بھٹے پہ ملکوں کا پابند کر دیا۔۱۴ سالہ چھیماں کی پیدائش کے بعد ہی سے کرموں اب اپنی بیوی کو ہاتھ لگاتے بھی ڈرتا تھا۔

منشی اپنے ریڈیو پہ اونچی آواز میں نعتیں سن رہا تھا۔ملک کو دیکھ کے سلام کیا اور پنکھے کا رخ ملک نواز کی جانب موڑ دیا۔اے سی سے پنکھے میں آ کر چھوٹے ملک کو بہت کوفت محسوس ہوئی۔منشی خوشامدانہ لہجے میں بولا۔''کیا خدمت کروں حضور کی۔''

ملک تلملا اٹھا اور بولا۔''اب تجھے یہ بھی یاد کروانا پڑے گا۔چور کی نسل۔برف زیادہ ڈال کے لا، اور سن،اب کی بار دو بوتلیں میری جیپ میں بھی رکھوا دے۔''

جب کلیجہ ٹھنڈا ہوا تو اندر کے شیطان نے اسے گرما دیا اور اس نے منشی کو ہدایت کی کہ چھیماں کو اندر بھیج دے۔جب چھیماں کی پیروں میں پڑی بیڑیاں کھولی گئیں تو اس کی ماں نے اس کو خوب کوسنے دیئے کہ اس ہڈحرام کی وجہ سے ان کی پیشی ہوگی اور رات کو بھی بطور سزا بھٹے پہ کام کرنا پڑے گا۔چھیماں ہانپتی کانپتی ملک صاحب کے حضور پیش ہوئی تو ماتھے پہ ہاتھ لے جا کے بولی۔''سلام صاحب، وہ جی روزہ

لگ رہا تھا تو دو گھڑی چھاؤں میں کھڑی ہوگئی۔''

ملک نے مسکرا کر منشی کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ چھیماں کی چیخ کان میں پڑتے ہی منشی نے ریڈیو کی آواز اونچی کر دی اور نعتوں پہ سر دھنتے ہوئے تسبیح پھیرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ملک نواز اپنا ازار بند باندھتے باہر نکلا اور منشی سے مخاطب ہوا۔ ''اس لڑکی کے گھر والوں کو افطاری میں لال شربت کی بوتل اور دو کلو برف دے دینا۔ آج واقعی گرمی بہت ہے۔''

کرموں اور اس کی بیوی کا واویلا سن کر منشی نے ڈانٹ پلائی۔ ''اوئے بے غیرتو، کچھ تو شرم کرو۔ روزوں میں ایسی بیہودہ باتیں کرتے ہو۔ ذرا لحاظ ہے تمہیں رمضان شریف کا بھی کہ نہیں۔''

تیرہ چودہ سالہ چھیماں اور اس کے ماں باپ بیڑیوں میں ایڑیاں رگڑتے رہے پر ان کا واویلا ان کی بیڑیوں کی آواز میں دب جاتی۔ چند ماہ بعد جب کرموں کا انتقال ہوا تو وزیراں اور اس کی بیٹی کو آزادی دی گئی کہ دسواں کر کے آئیں۔ جنازہ اٹھنے کے بعد جب گاؤں کی عورتوں نے چھیماں کے حمل پہ چہ مہ گوئیاں شروع کیں تو وزیراں نے چیخ چیخ کے دل کا غبار نکالا۔ بات جنگل کی آگ کی مانند بڑے ملک صاحب تک پہنچی۔ وہ ملکانی پہ گرجا۔ ''تیرے لاڈلے نے تو بھٹے والیوں کو بھی نہیں بخشا۔ یہ تربیت ہے تیری۔''

اس پر ملکانی نے غرور بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''ملک جی، آپ جو ہر وقت شیر کا بچہ مانگتے تھے۔ اب جنا ہے تو سنبھالیں۔ شیر بکریاں بھیڑیں تو کھائے گا نا۔''

بڑے ملک صاحب یہ سن کر بہت ہنسے اور بولے۔ ''بولتی تو تو سچ ہے، کسی شیر سے کم نہیں ہے میرا نواز، پر اس لڑکی کا پیر بھاری ہے۔ اس نیچ اچھوت کی کوکھ میں ملکوں کا خون ہے۔''

اس پر ملکانی بولی۔ ''دیں چار پیسے کہ بچہ گروائے۔ ہم نے اگلے ماہ اپنے نواز کی بات پکی کرنی ہے گورنر صاحب کی بیٹی سے۔''

بڑے ملک صاحب نے منشی کو بلا بھیجا اور ہدایت کی کہ اس گند سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ دائی نے جب مہینوں کا حساب لگا کے حمل گرانے کو ناممکن قرار دیا تو ملکانی نے ترس کھاتے ہوئے اس کو گاؤں سے نکل جانے کا حکم دیا۔ منشی نے پانچ سو کا نوٹ ماں بیٹی کے آگے پھینکا اور بولا۔

''شکرانے کے نفل ادا کرو ماں بیٹی، لاکھوں کا سودر حم دل ملکوں نے منٹوں میں معاف کر دیا۔ دعا دوان کو دعا۔''

دونوں ماں بیٹی جو کبھی پڑوس کے گاؤں بھی نہ گئی تھیں اب شہر کو روانہ ہوگئیں۔ بس کے دھوئیں اور خالی پیٹ نے چھیماں کی حالت مزید ابتر کر دی اور قے کرتے کرتے نیم بے ہوشی کی کیفیت میں جا پہنچی۔ اسٹاپ آتے ہی کنڈیکٹر نے دونوں ماں بیٹی کو باہر دھکیلا اور خود اگلے اسٹاپ کی تکرار شروع کر دی۔ وحشت زدہ ماں بیٹی

فٹ پاتھ کے کنارے جا بیٹھیں۔ ان کی حالت دیکھ کر منزل کی جانب گامزن مسافروں نے اپنی بلائیں ٹالنے کو ان کے سامنے سکے ڈالنے شروع کر دیئے۔ یوں اس بس اسٹاپ سے ان کی ایک نئی زندگی کا سفر شروع ہوا۔ دونوں نے مل کے کھولی ڈالی اور چند ماہ بعد چھیماں نے ملکوں کی بیٹی کو جنم دیا جس کو سب گڑیا پکارنے لگے۔ گڑیا اپنی دادی ملکانی کی طرح نیلگوں آنکھوں اور سنہرے بالوں والی سرخ و سفید رنگت میں ایک ولایتی گڑیا ہی معلوم ہوتی تھی۔ آس پاس اس کی خوبصورتی کا چرچا ہوا اور جب چھیماں اس کو گود میں لیے گاڑیوں کے شیشے کھٹکھٹاتی تو نہ چاہتے ہوئے بھی لوگ کچھ نہ کچھ دے ڈالتے۔ گڑیا جب اڑھائی سال کی ہوئی تو چھیماں نے اسے ''سلام صاحب'' کہنا سکھایا۔ جب گڑیا اپنی پیشانی پہ سیلوٹ مار کے چھام چھاب کہنے لگی تو ان کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور بھکاریوں میں ترقی پا کے چھیماں کو ایک مشہور سگنل شام کے اوقات کے لیے دہاڑی پہ مل گیا۔

شان بین الاقوامی شہرت کا حامل آرٹسٹ تھا اور ملک کے امیر ترین حلقے اس کی پینٹنگز اپنے گھروں میں آویزاں کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر ملک سے باہر رہتا اور ایک ''کرونک بیچلر'' کی حیثیت میں تمام ہائی کلاس پارٹیوں میں فلرٹ کرتا پھرتا۔ اس کا گزر اکثر اس سڑک سے ہوتا جہاں شام کے اوقات میں گڑیا اپنی ماں کی گود میں ''چھام چھاب'' کے سیلوٹ کے ساتھ پیسے اکٹھے کرتی۔ وہ اس کو بہت غور سے دیکھتا اور سو کے نوٹ سے نوازتا۔ چھیماں، گڑیا کو گود میں اٹھائے اس کی بیش قیمت گاڑی کی تاک میں رہتی۔ پھر شان نے بھیک کی رقم میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا۔ گڑیا بھی اس سے مانوس ہو چلی تھی۔

ایک شام وی آئی پی موومنٹ کے باعث ٹریفک جام تھی۔ شان کو دیکھ کر چھیماں، گڑیا کو گود میں لیے گاڑی کی طرف لپکی۔ گڑیا دور سے ہی شان کو دیکھ کر ماتھے پہ ''چھام چھاب'' کرنے کو اپنا ننھا منا ہاتھ رکھ کے مسکرانے لگی۔ شان نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چھیماں ذرا ہچکچائی مگر پھر گڑیا کو لیے جا بیٹھی۔ شان نے گڑیا کو گود میں لے لیا اور اس کو گاڑی میں نصب بتیاں دکھانے لگا۔ چار سالہ گڑیا کو کبھی کھیلنے کو گڑیا نہیں ملی تھی، اس کے کھلونے بھیک میں ملے چھوٹے بڑے سکے تھے۔ وہ انتہا ہی تجسس اور شوق سے کھیلنے میں مصروف ہوگئی۔ چھیماں کے لیے یہ سب کچھ غیر یقینی تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے شان سے پوچھا۔ ''صاحب، تم کیا کرتے ہو۔''

شان نے سامنے مزین ایک بل بورڈ پہ بسورتے بچے کی تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ۔''

''اوہ.....تو تم تصویریں بناتے ہو؟''

''ہاں۔'' شان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ٹریفک ہارن کی آواز سن کر شان نے گڑیا کو اپنے ساتھ زور سے بھینچا اور اسے پانچ سو کا نوٹ تھما کے چھیماں کے حوالے کر دیا۔ ایک روز شان نے سرخ لہنگا چولی

اور ننھے منے سونے کے زیورات چھیماں کے حوالے کرتے ہوئے چھیماں کو ہدایت کی۔ ''یہ سب کچھ گڑیا کا ہے۔ خبردار، اس میں سے ایک بھی شے کم نہ ہو، میں چند دن بعد گڑیا کو کچھ دیر کے لیے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اس کو اچھی طرح تیار کر دینا۔''

چھیماں حیران و ششدر ہاتھ میں سامان لیے کھڑی تھی۔ سگنل کھلا اور شان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ بھکاریوں کی دنیا میں شان اور گڑیا کا لگاؤ مشہور ہو گیا اور کالے کلوٹے بچوں والیاں حسد اور رشک کی نگاہ سے گڑیا کی معصومیت اور ملکوتی حسن کو تکا کرتیں۔ وزیراں اور چھیماں اپنی قسمت اور کمائی پہ ناز کرتیں اور گڑیا کے لاڈ اٹھاتے نہ تھکتیں۔

موبائل کی گھنٹی سن کے شان لپکا اور انگریزی میں بات کرنے لگا۔

Ohh, Sure, I am conforming my presence at the occasion on the given date. Don't you worry please. I will never disappoint you. This time, its going to be even more interesting and mind blowing presentation from my side. I know the standards and requirements of the ring. I do appreciate your good self for trusting me and ranking me as an elite member of the ring.

شان کا اس سڑک پر ایک ہفتے سے گزر نہ ہوا تو چھیماں کا ماتھا ٹھنکا۔ ''کمبخت، سب حرامیوں نے نظر ہی لگا دی۔ اچھا خاصا ایک دن ہی میں پورے ہفتے کی کمائی ہو جاتی تھی۔'' ننھی گڑیا سب سے بے نیاز اسی طرح سے ''چھام چھاب'' کا سیلوٹ کرتی پھرتی۔

چلچلاتی دھوپ میں چھیماں گاڑیوں کے پیچھے بھاگتی پھر رہی تھی کہ اچانک زوردار ہارن کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔ وہ اس کو اچھی طرح پہچانتی تھی، اس جانب لپکی۔ شان نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور چھیماں کو ہزار کا نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔ ''کل گڑیا کو تیار کر دینا، میں لینے آؤں گا۔'' اور گاڑی دوڑا دی۔ چھیماں تذبذب کے عالم میں ہزار کا نوٹ لیے کھڑی تھی کہ گڑیا کی آواز آئی۔ ''چھام چھاب۔''

کھولی میں پہنچی تو بے یقینی اور حیرت کے سمندر میں ڈوبی، چھیماں نے وزیراں کو ساری بات بتائی تو وہ خوشی سے کھل اٹھی۔ مگر چھیماں کے دل میں ہزار وسوسے ڈنگ مار رہے تھے۔ اپنا ماضی جو کے سکوں کی کھنکار کے نیچے دب چکا تھا، سامنے آ بیٹھا مگر وزیراں نے اس کو ہزار کے نوٹ اور سونے کے ننھے منے زیورات کے نیچے دبا دیا۔ چھیماں نے جب گڑیا کو سرخ لہنگا پہنا کر سرخی لگائی تو سوچنے لگی کہ جب میری گڑیا دلہن بنے گی تو حور لگے گی حور۔ خود بھی عرصے بعد کنگھی چوٹی کی اور صاف ستھرے کپڑے پہنے اور سگنل پہ مقررہ وقت پر گڑیا کو گود میں لیے کھڑی ہو گئی۔ شان کی گاڑی قریب آ کر رکی اور اس نے دروازہ کھولا۔ جب چھیماں بیٹھنے

لگی تو تلخ لہجے میں بولا۔ ''میں نے صرف گڑیا کا کہا تھا، تمہارا نہیں۔'' اس نے لپک کر گڑیا کو کھینچ کر گاڑی میں بٹھایا اور تیزی سے گاڑی دوڑا دی۔ گڑیا کی خوشی اور حیرت کی انتہا نہ تھی۔ وہ موسیقی کی آواز پہ تالیاں بجانے لگی۔ اپنے عالی شان بنگلے کا گیٹ شان نے خود ہی کھولا کہ ملازمین کو وہ اپنے لندن ٹرپ کی وجہ سے پہلے ہی ایک ماہ کی رخصت دے چکا تھا اور اس کو شام کی فلائٹ پکڑنا ضروری تھی۔ اپنے بیڈروم پہنچ کر اس نے گڑیا کو بیڈ پہ بٹھا کے ہاتھ میں چاکلیٹ پکڑائی اور خود کمرے میں نصب کیمروں کی سیٹنگ فکس کرنے لگا۔

سر پہ لال اوڑھنی، ماتھے پہ بندیا اور ہونٹوں پہ سرخی لگائے گڑیا اس کو مکمل نظر انداز کیے چاکلیٹ کھانے میں مصروف تھی۔ کیمروں کی سیٹنگ سے مطمئن ہو کے وہ گڑیا کی جانب بڑھا اور کیمرے کی جانب اشارہ کر کے بولا۔ ''گڑیا جان، ادھر سلام تو کرو۔''

گڑیا نے معصومیت میں کیمرے کی جانب تکتے ہوئے اپنا مخصوص سیلوٹ کیا۔ پھر گڑیا کچھ کسمسائی، اس کو شان کا یوں سر سے لپٹی اوڑھنی اتارنا بالکل نہ بھایا۔ پھر جب اس کے ماتھی کی بندیا کی باری آئی تو وہ بول اٹھی۔ ''نہ نہ چھاب'' اور سمٹ کے پیچھے ہٹ گئی۔ جدید ترین کیمروں میں ان مناظر کی ریکارڈنگ جاری تھی۔ کیمرے چیختی چلاتی گڑیا اور شان کی بڑھتی ہوئی درندگی کی مسلسل ریکارڈنگ کر رہے تھے۔ ہر زاویے سے فلم بنتی رہی اور شان ہر طور سے گڑیا کو مسلتا رہا جو چیخ و پکار کے بعد شدت تکلیف سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

شان نے جلدی جلدی فلمیں بیگ میں ڈالیں۔ جن کو کل لندن میں اپنی ''سیکرٹ سوسائٹی آف پیڈوفائل'' کی خفیہ رسومات میں شرکت کے دوران ایک بونس فیچر کے طور پر پیش کرنا تھا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی برطانوی شہریت کے لیے وہاں پر موجود ایلیٹ ممبران اس کی ضرور مدد کریں گے۔ اس نے بے ہوش گڑیا کو ایک چادر میں لپیٹ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ ڈالا اور ایک قریبی اسپتال کے باہر نصب بینچ پر لٹا کے گاڑی کو دوڑا لیا۔

شام کے باعث آمد و رفت زیادہ نہ تھی۔ چوکیدار کی نظر جب خون میں لپٹی گڑیا پہ پڑی تو اس کو اٹھا کے ایمرجنسی میں لے گیا۔ ڈاکٹرز اس پھول سی بچی کے ساتھ بہیمانہ سلوک دیکھ کر میڈیا کو کال کرنے لگے۔ اسی اثنا میں گڑیا نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ اپنے آس پاس خوش لباس لوگوں کو دیکھ کر اس نے اپنے لرزتے، کانپتے ہاتھ کو ماتھے سے لگایا۔ ''چھام چھاب'' اور آنکھیں موند لیں۔ موبائل سگنل کمزور ملنے پر ڈاکٹر باہر کو لپکا تا کہ جلد از جلد اس خبر کو میڈیا کوریج مل سکے۔ موقع بھانپ کر قریب ہی کھڑے جمعدار نے جلدی سے گڑیا کے ماتھے سے وہ بندیا اتار لی جسے وہ بمشکل چھاب سے بچا پائی تھی۔

◄◄ ● ►►

C/o - Mr. Md. Ali Bhutto, Banglow C-105. Block 15
Gulistan e Johar, Karanchi. Pakistan Contact No. +92 332 5520674

● فرحین جمال

آنگن

میں اس دن کو آج تک نہیں بھولی، جب میں احسن پر چیختی چلاتی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ احسن نے پوچھے بغیر میرے نوٹس اٹھا کر اپنی گرل فرینڈ کیتھرین کو دے دیئے تھے۔ میں سکول سے ہی بھری ہوئی گھر پہنچی تھی اور چلانے لگی تھی۔ ماں ایک طرف صوفے پر پتھر بنی بیٹھی تھیں۔ ان کی نظریں مجھے دیکھ رہی تھیں لیکن چہرہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا۔ میں اپنا غصہ بھول کر ان کے قریب گئی۔ اور پوچھا کہ آپ کو کیا ہوا؟ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔

''تم بہن بھائی اتنا لڑتے کس لیے ہو؟ تم کیسی بہن ہو کہ جو کہہ جاتی ہے اس کی میں جان لے لوں گی؟ کیا تمہارا دل تمہاری زبان کا ساتھ دیتا ہے؟'' ماں کو اس قدر سنجیدہ دیکھ کر میں نے انہیں ساتھ لگا لیا تھا اور کہا۔

''ماں وہ بہت تنگ کرتا ہے۔ آپ بھی تو کچھ نہیں کہتی اسے۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ لڑائیاں جھوٹ ہیں۔ یہ نفرت ایک محبت بھرا ڈراما ہے۔ یہ گالیاں محبت کا انمول جذبہ ہیں۔ تو میں بیچ میں کیسے آؤں؟ سنو ایک بات سنو۔ بتاتی ہوں۔ تمہارے ماموں.....'' اتنا کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھرا اور وہ کچھ دیر کے لیے خاموشی سے اپنے ناخن کو دوسرے ناخن سے اس طرح کریدنے لگیں کہ جیسے انگلی سے جدا کرنا چاہتی ہوں۔ میں انہیں دیکھتی رہی۔ وہ اس دن غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھیں۔ شادی کے بعد ماں بابا کے ساتھ ہی یورپ میں آ گئی تھیں اور یہاں رہتے ہوئے پچیس سال بیت چکے تھے، اس دوران وہ بہت کم پاکستان گئی تھیں۔ موقع ہی کم ملتا تھا اور پھر یہ زندگی اتنی مشکل ہے کہ دونوں میاں بیوی کو کاروبار بہتر کرنے، گھر بنانے اور پھر بعد میں ہماری تعلیم.....ان سب نے بہت کم موقع دیا تھا کہ وہ اپنوں کو ملتی رہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ کبھی اتنی اداس دکھائی نہیں دی تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ تھاما اور کہا۔

''کیا ماں؟ کچھ بتانے والی تھیں آپ؟'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور بولنا شروع کیا۔

''وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب پہلی بار ہمارے آنگن میں جنید آیا تھا۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا کہ اچانک روئی کے سفید گالے کی طرح نرم نرم، گداز سا وجود لے کر چلا آیا تھا۔ وہ

کتنا خوبصورت لمحہ تھا جب ہم سب بہن بھائی ایک دوسرے کو دھکا دیتے آپس میں جھگڑتے اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے چین تھے۔ اور وہ کتنے اطمینان سے گود میں رضائی میں لپٹا سو رہا تھا۔'' ماں کے چہرے کی سنجیدگی مسکراہٹ میں بدل گئی اور مجھے محسوس ہوا جیسے وہ بغیر ویزے کے پاکستان میں پہنچ کر اپنے آنگن میں بیٹھ کر مجھے ماموں کی کہانی سنا رہی ہیں۔ سچی بات ہے۔ مجھے احسن پر بھی پیار آنے لگا تھا۔ پھر ماں نے کہا۔

''میں بہت خوش تھی اس دن۔ مجھے کھیلنے کو ایک جیتا جاگتا کھلونا جو مل گیا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ نظروں سے دور ہی نا جائے۔ وہ رات میں نے سوتے جاگتے گزاری تھی اور صبح سویرے ہی امی کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔''

''امی..امی..اسے مجھے دیں نا... میں نے اپنی چھوٹی سی گود پھیلا دی۔''

''ابھی بہت چھوٹا ہے۔ تم سے نہیں سنبھلے گا!'' امی نے مجھے سمجھانا چاہا۔

''نہیں.....نہیں.....یہ بس میرا ہے۔'' میں ضد پر اتر آئی۔

''اچھا بھئی لو۔'' امی نے زچ ہو کر اسے میری گود میں ڈال دیا۔ اس نے کسمسا کر ایک چھوٹی سی انگڑائی لی۔ پیارے پیارے ہونٹ سکیڑ کر منہ بنایا اور ایک لمبی سی جمائی لی۔

''امی! یہ آنکھیں کب کھولے گا۔'' مجھے بہت جلدی تھی۔

''ابھی سونے دو اس کو۔''

''نہیں مجھے ابھی جاگتا دیکھنا ہے بس.....! میری ایک ہی رٹ تھی۔ ہماری یہ تکرار شاید اس کی نیند میں خلل ڈال گئی۔ اور اس نے منہ بسورتے ہوئے آنکھیں کھول دیں. میری تو جیسے مراد بر آئی۔ دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں اور ان کی شفاف چمک مجھے خیرہ کیے دے رہی تھی۔ اس نے امی کی خوشبو اور لمس ناپا کر ایک لمبی سی تان چھوڑ دی۔ اور میری گود سے جانے کے لئے مچلنے لگا۔ یہ میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی۔'' ماں بتاتے ہوئے کتنی پیاری لگ رہی تھیں۔ میرا جی کر رہا تھا میں سنتی چلی جاؤں۔ ماں خاموش ہوئیں تو میں نے بے چین ہو کر کہا۔

''تو پھر کیا ہوا؟''

''بس یہاں سے ہی ہماری دوستی کی بنیاد پڑ گئی۔ میرے صبح شام اس کے گرد ہی گردش کرنے لگے۔ اسکول میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ گھر پہنچنے کی جلدی ہوتی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کپڑے تبدیل کرواتی۔ لوریاں سناتی۔ امی کہتی تھیں میں بولا گئی ہوں۔

''لو دیکھو کوئی ایسا بھی کرتا ہے۔ نا کھانے کا ہوش، نہ سونے کی فکر۔''

سب میرے اس دیوانے پن پر ہنستے تھے۔لیکن مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہ تھی.....!وقت گزرتا گیا۔وہ پاؤں پاؤں چلنے کے قابل ہوگیا۔جب پہلی بار چلنے کی کوشش کی تھی تو لڑکھڑا گیا تھا اور میں گھبرا کر اس کی طرف لپکی تھی۔ڈر تھا کہ کہیں گر نا جائے۔اچھی طرح چلنا آ گیا تو میرے کمرے میں چلا آتا۔کتابوں کی الماری تل پٹ کر دیتا۔کوئی اور ہوتا تو میں گھر آسمان پر اٹھا لیتی پر وہ تو میرا شہزادہ تھا۔اس لیے صرف ہلکی سی سرزنش کے بعد ٹافیاں دے کر اپنی پڑھائی میں مگن ہو جاتی۔پھر وہ دن بھی آیا جب ساڑھے تین سال کی عمر میں وہ اسکول جانے کو تیار ہوا۔سفید قمیض ،خاکی پتلون اور سرخ ٹائی میں کتنا پیارا لگ رہا تھا۔کیا بتاؤں.....!امی نے جلدی جلدی اس کی نظر بھی اتاری اور میری انگلی پکڑ کر وہ علم کی راہ پر چلنے لگا۔پھر وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔وہ شلوار قمیض اور سر پر سفید ٹوپی پہن کر مدرسہ بھی جانے لگا۔میں اکثر اسے پٹھان کہتی تھی کیوں کہ وہ لگتا ہی ایسا تھا۔گوراچٹا،سنہرے بالوں والا۔گلی میں بچوں کے ساتھ کھلتے جب چوٹ لگ جاتی تو میں ننگے پاؤں باہر نکل جاتی تھی،اتنا ہوش بھی نہ رہتا کہ سر پر دوپٹہ نہیں ہے۔اسکی چھوٹی سی چھوٹی تکلیف پر میں رونے والی ہو جاتی۔'' ماں کا چہرہ مزید کھلا۔

''ایک دن اس نے ضد کر کے سبز مرچ کھا لی تھی میری دیکھا دیکھی.....اور اس کا منہ ایک دم لال ہو گیا،آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا۔میں گھبرا گھبرا کر چینی اس کے منہ میں ڈال رہی تھی اور اس کی حالت اور غیر ہو رہی تھی۔وہ تو بھلا ہو بھائی جان کا کہ انہوں نے اسے فوراً کلی کروادی۔گرمیوں کی دوپہر میں ہم چوری چوری قلفیاں کھاتے تھے اس کا الگ ہی مزہ تھا۔اور وہ صبح کچپ سے پراٹھا کھاتا تھا اور ہم سب ہنستے تھے۔ایک مہینے صرف اور صرف کچپ .....ایک بار جب اسے خسرہ نکل آیا تھا اور وہ بخار میں جل رہا تھا تو مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔سارا جسم سرخ دانوں سے بھر گیا تھا اور میں جلے پیر کی بلی کی مانند کمرے کے باہر ٹہل رہی تھی۔امی اندر جانے نہیں دیتی تھیں کہ کہیں مجھے دیکھ کر وہ میرے پاس آنے کی ضد نا کرے اور کہیں اسے ہوا نا لگ جائے اور اس دن جب وہ ساتویں جماعت میں تھا اور اسکول میں کسی لڑکے سے لڑ کر گھر آیا تھا۔اس کی قمیض کی آستین پھٹی ہوئی تھی اور ماتھے سے خوں بہہ رہا تھا میں تو دیکھ کر ہی دہل گئی تھی،اور ڈریسنگ کرتے ہوئے اس چوٹ کی بار بار تکلیف سے سسک رہی تھی۔اور وہ ہونٹ بھینچے بہادری سے کھڑا رہا کہ مبادا میں اور پریشان نا ہو جاؤں۔رات بھر کراہتا رہا.....'' میں نے ماں کی بات ٹوکی۔

''ماں آپ دونوں کی کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی؟ جیسے میری اور احسن کی ہوتی رہتی ہے۔''

''لڑائی تو ہماری کبھی ہوئی ہی نہیں۔وہ مجھ سے اتنا چھوٹا تھا کہ لڑائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔یہ تو اوپر تلے کے بہن بھائی میں ہوتی ہے۔میں کالج میں تھی اور وہ ابھی اسکول میں ہی پڑھ رہا تھا۔رات کو اکثر مجھ سے کہانی سننے آجایا کرتا تھا۔پھر اور بڑا ہوا تو پڑھائی میں مدد لینے لگا۔اسکول کا رزلٹ جب آتا تو میں اس کے

ساتھ اسکول جاتی اور واپسی میں اس کے پسند کی آئس کریم کھلاتی۔بازار جاتے یا اپنی سہیلیوں کے گھر جاتے ساتھ لے جاتی تھی۔ابو میرا اکیلا جانا پسند نہیں کرتے اور وہ میرا ننھا سا محافظ ساتھ ساتھ ہوتا۔خوب مزے ہوتے تھے اس کے بھی۔مزے مزے کی چاکلیٹ ملتیں کھانے کو۔اسے چاکلیٹ بہت پسند تھی۔بہت زیادہ۔'' ماں خاموش ہوگئیں۔میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو ان کے آنسو ٹپک رہے تھے۔میں نے انہیں ساتھ لگایا۔

''ارے ماں.....کیا ہو گیا آپ کو،اموشنل ہوگئیں آپ.....ماں کی دبی دبی سی آواز ابھرنے لگی۔

''کالج ختم کرنے کے بعد میری شادی ہوگئی اور میں بیاہ کر یہاں چلی آئی۔میرے اور اس کے درمیان میلوں کی مسافت حائل ہوگئی۔کئی سال بیچ میں آ گئے۔میرے دن ورات پر اب میرے گھر اور بچوں کی حکمرانی تھی۔وقت بیتا چلا گیا.....'' ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ماں کو ایسے تو روتے کبھی نا دیکھا تھا۔میں نے ماں کو بانہوں میں بھر رکھا تھا،گرفت اور مضبوط کی۔

''ماں.....آپ کا یہ رونا دیکھا نہیں جاتا۔بس چپ ہو جائیں۔'' ماں دھاڑیں مارتے ہوئے بولیں۔

''ابھی ابھی بھائی جان کا فون آیا تھا۔وہ نہیں رہا۔وہ نہیں رہا۔اور میں آج پہنچ نہیں سکتی۔میں سب باتوں سے بے خبر رہی۔میں کچھ بھی جان نہ پائی۔اس کی تکلیف پر بھاگ کر پہنچنے والی،آج بے بس ہے۔آج وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے اور میں.....میں.....کیسے جاؤں؟ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اتنی دور ہوں.....اتنی دور ہوں کہ اس کا ساکت جسم میرا انتظار نہیں کر سکتا۔'' میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ایک لمحے کے لیے میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ ماں کیا کہہ رہی ہیں۔اسی حیرانی کے دوران احسن باہر کا دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوتے ہی بولا۔

''اے چڑیل.....'' اور ماں کو ایسے روتے دیکھ کر میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔میں کچھ نہ کہہ پائی۔اور جا کر احسن کو گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔شاید اس لمحے مجھ میں ماں کی روح سرایت کر گئی تھی۔اور احسن.....جنید بنا میرے سامنے کھڑا تھا۔

◂◂ ● ▸▸

Rue de la Station .. 188,
1410 waterloo
Belgium
0032025391745

● شاہین کاظمی

گڈی

گلال ملے میدے کی سی رنگت، ناک میں چمکتی ہوئی ننھی سی لونگ اور گہری سیاہ آنکھیں، جب اٹھتیں تو دل بے قابو ہو کر سینے کی دیواروں سے ٹکرانے لگتا، صبیح پیشانی پر چمکتی پسینے کی بوندیں، جیسے کلی کے کومل بدن پر ٹکے ہوئے شبنم کے قطرے کاشف جب جب اسے دیکھتا دل کو سنبھلنا مشکل ہو جاتا، آدھے چہرے کو سفید چادر میں چھپائے جب وہ گلی سے گزرتی تو پوری گلی جیسے مہک اٹھتی، اس کا نام عنبر تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے سکول کی اکلوتی استانی، بہت دلجمعی سے اپنے فرائض سرانجام دیتی۔ وہیں گاؤں میں ایک کمرے پر مشتمل گھر میں جو کاشف چوہدری کے باپ کی ملکیت تھا رہائش پذیر تھی۔ اس کے ساتھ گاؤں کی بوڑھی دائی بھی رہتی تھی جو کھانا وغیرہ بنانے میں اس کی مدد کر دیا کرتی۔ چند ماہ پہلے ہی اس کا تبادلہ اس گاؤں میں ہوا تھا۔ سب کو لگتا تھا وہ گاؤں میں ٹکے گی نہیں۔

''وہ ٹھہری شہر کی نازک چھوکری۔ اسے کہاں یہ دھول مٹی پسند آئے گی۔ دیکھنا چند دنوں میں سب چھوڑ چھاڑ کر چلی جائے گی۔'' یہ ماسی رشیداں کی رائے تھی جس کا اب اسے بیٹی کہتے منہ نہیں تھکتا تھا۔

کاشف چوہدری نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا، وہ تھی ہی ایسی، اس پر اس کا رکھ رکھاؤ اسے اور بھی منفرد بنا دیتا تھا۔ کاشف نے بارہا اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی طرف سے بات محض ہوں ہاں تک ہی محدود رہی۔ کاشف کے لیے یہ بالکل نئی بات تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے جس بھی لڑکی کی طرف نظر کی وہ جیسے کھنچی چلی آئی۔

''یہ سالی آخر خود کو سمجھتی کیا ہے، دو ٹکے کی چھوکری اور نخرہ دیکھو۔'' کاشف چوہدری بہت تلملایا ہوا تھا۔

''لگتا ہے کچھ اور ہی کرنا پڑے گا،، اس نے موبائل پر نمبر ڈائل کرتے ہوئے سوچا۔

''کیا ہو رہا ہے آج کل؟'' دوسری طرف وسیم تھا۔

''ہونا کیا ہے یار ایک کبوتری پسند آئی ہے پر ہے بڑی نخریلی۔''

''تو بھائی کوئی چارہ دانہ، دام درہم۔'' وسیم کا قہقہہ بہت طویل تھا۔

''ابے گھامڑ! کچھ نہیں کیا ہوگا۔ وہ سالی نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔''

''وہ یار کاشف! یہ تم ہو؟'' وسیم ہنستے ہوئے بولا۔

''جگر! اشارہ کر ہم یاروں کے یار ہیں، کہے تو اٹھوا لیں۔''

''لگتا ہے کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔'' کاشف آہستہ سے بولا۔

''تُو حکم کر بس۔ کب اور کہاں باقی میرا کام۔''

''ٹھیک ہے تو کل یہاں آ، پھر کرتے ہیں بات۔'' کاشف نے فون رکھ دیا۔

مرد کے پندار کو ٹھوکر لگے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اسے سوائے اپنے آپ کے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے ساتھ اگر منہ میں چبانے کے لیے سونے کے دانت بھی ہوں تو رگوں میں دوڑتا لہو زہر بن جاتا ہے جو اچھے برے کی تمیز بھلا دیتا ہے۔ یہی کاشف چوہدری کے ساتھ تھا۔ اپنی سفلی خواہشات کے تکمیل کے لیے وہ کمینگی پر اتر آیا۔ چار دن بھنبھوڑنے کے بعد جب وہ اسے اماں سرداراں کے پاس لایا تو اس کی محض سانسیں چل رہی تھیں۔

''جانتی ہو نا منہ کھولنے کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔'' وہ نوٹوں کی دو گڈیاں اس کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔ اس کے سرد لہجے نے اماں کی بوڑھی ہڈیوں میں خنکی اتار دی۔

اس کی طبیعت بہت دنوں سے خراب تھی، سکول جانا تو چھوٹ ہی ہو گیا تھا۔ اس حادثے کے بعد اس نے گھر والوں سے بھی رابطہ تقریباً ختم ہو چکا تھا اور گھر میں تھا ہی کون، اماں عرصہ ہوا گزر گئی تھیں۔ ابّا کو اپنی نئی بیوی کے چونچلوں سے ہی فرصت نہ تھی۔ رہ گئی ایک بہن تو اسے کبھی کبھار میسج کر دیا کرتی تھی، جہاندیدہ سرداراں اس کی حالت سے بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ جب اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو عنبر تڑپ اٹھی۔

''میرے مولا کیا ابھی بھی کوئی آزمائش باقی ہے۔'' اس کی آواز پھٹنے لگی۔ آہ و زاری عرش کو چھونے لگی لیکن کوکھ میں پلتی زندگی سانسیں لیتی رہی۔

اس رات بہت شدت کا طوفان تھا۔ آسمان سے چھاچھوں پانی برس رہا تھا۔ اماں گہری نیند سو چکی تھی۔ اس نے چادر سنبھالی اور کنڈی کھول کر خاموشی سے باہر نکل آئی۔ اسے ہوش آیا تو وہ روشن بی کے پاس تھی جس نے اسے ریل کی پٹڑی سے اس وقت اتارا تھا جب ریل سر پر آن پہنچی تھی۔

''بتاؤ گی نہیں کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ جو تم جان دینے پر تل گئیں تھیں۔'' روشن بی نے اس کے سر پر بہت شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

''ہاں! مجھ جیسی بدنصیب کو تو موت نے بھی اپنانے سے انکار کر دیا۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

پھر ایک دن خاموشی سے وہ عنبر سے گڈی بنا دی گئی۔

اس کا پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ سانسیں لینے سے لگتا تھا جیسے سینے میں خنجر سا اتر رہا ہو۔ نئی زندگی تخلیق کرنا کون سا آسان کام ہے۔ جانکنی کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ درد کا چنگھاڑتا ہوا عفریت اور جب آنے والا ان چاہا بھی ہو تو شدت سوا ہو جاتی ہے۔

''مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے۔'' روشن بی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو آنکھوں کے کونے سے پھسل کر نمکین پانی کا ننھا سا قطرہ اس کے بالوں میں جذب ہو گیا۔

''ارے پگلی روتی کاہے کو ہے، دیکھ تو کتنی خوبصورت بچی ہے۔'' روشن کی آواز اس کے نام کی طرح روشن تھی۔ لیکن لگتا تھا چند لمحوں پہلے والا درد دل میں اتر آیا ہو، نمکین پانی کے قطرے مسلسل بالوں اور تکیے میں جذب ہوتے رہے۔

''آئے ہائے روتی کیوں ہو، تجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ کیا خوبصورت بچی ہے۔ ماں قسم تیرا تو مقدر بن گیا۔'' نیلم بچی کا منہ چومتے ہوئے بولی۔

''آپا تم تو ایسا نہ کہو، تم تو مجھے جانتی ہو۔'' اس کے رونے میں اضافہ ہو گیا۔

''دیکھ گڈی اب یہی تیرا گھر ہے اور ہم ہی تیرے سب کچھ ہیں، تو جتنی جلدی اس بات کو سمجھ لے اتنا اچھا ہے۔'' نیلم کی آواز میں اکتاہٹ تھی۔

''اماں ذری بچی کو نہلا دو۔ مولوی صاحب آتے ہی ہو گے آذان کہنے۔'' روشن بی نے جاتے جاتے منظورن سے کہا۔

''ابھی لو بٹیا! گرم پانی منگوایا ہے۔''

''وقت جیسا بھی ہو بہت تیزی سے گذر جاتا ہے، اس بات کا احساس کیے بغیر کہ اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں اٹھتے قدموں سے اس کھردری زمین نے ساری توانائی نچوڑ لی ہے، اور آبلوں سے لہو رسنے لگا ہے۔''

ڈائری کے ورق پلٹتے ہوئے اس کی نظریں بے مقصد اس تحریر پر جم گئیں۔

''سچ ہے وقت کسی کے لیے نہیں رکتا۔ اس جہنم میں جلتے مجھے بھی پانچ سال ہو گئے اور احساس بھی نہیں ہوا۔ شاید میں خود کو بھول گئی ہوں۔ میں کون تھی؟ کون ہوں؟ گڈی؟ عنبر؟ میں گڈی کیوں اور کیسے ہو گئی۔'' اس کی آنکھوں سے وحشت جھانکنے لگی۔

یہ تو روشن بی کی مہربانی تھی کہ اسے عام تماش بینوں کو خوش نہیں کرنا پڑتا تھا۔ روشن بی اس کی تعلیم

اور فر فر انگریزی بولنے سے مرعوب تھی اس لیے وہ صرف اونچے طبقے کے شرفاء کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ اس کی بیٹی بڑی ہو گئی تھی۔ اس نے سب سے لڑ جھگڑ کر اسے انگریزی سکول میں ڈال دیا۔

''کچھ بھی کر لو گڈی بیگم! بے بی نے بیٹھنا تو دھندے پر ہی ہے۔'' نیلم کی آواز میں اکثر دل دکھانے والی کاٹ ہوا کرتی تھی۔

''زبان کو لگام دے نیلم اور جا محفل کی تیار کر شام دروازے پر کھڑی ہے۔'' روشن بی کا لہجہ سخت تھا۔

''جا ہی رہی تھی اماں۔'' نیلم بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی۔

آج چار دن بعد وہ واپس آئی تھی۔ تھکا ماندہ بدن اور غلاظت کے بوجھ تلے سسکتی روح لیے خود سے شرمسار۔ ہر بار ہی ایسا ہوتا تھا۔ وہ جیسے ہی بڑے کمرے میں داخل ہوئی اس کے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ بے بی پاؤں میں ننھے ننھے گھنگھرو باندھے تھرک رہی تھی۔ نیلم اور روشن بی اسے دیکھ دیکھ کر صدقے واری ہوئی جا رہی تھیں۔

''نیلم آپا! روشن بی!! کیا ہے یہ سب؟'' اس کی آواز میں کڑواہٹ گھل گئی۔

''لو، دیکھ تو رہی ہو، بے بی ریاض کر رہی ہے۔'' نیلم طنزیہ لہجے میں بولی۔

اس نے دیکھا بے بی کے پاؤں کی اٹھان میں پختگی تھی۔ وہ سلگ اٹھی۔

''کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ؟'' اس کی آواز کافی اونچی تھی۔

''گڈی تو اندر جا، تھکی ہوئی آئی ہے۔ ہم بھی ادھر ہیں تو بھی۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔''

''اور بے بی! چل تو بھی ماسٹرنی سے سبق پڑھ لے۔ کب سے آئی بیٹھی ہے۔'' روشن بی بے بی کے گھنگھرو کھولتے ہوئی بولی۔

عنبر اندر تو آ گئی تھی لیکن دل و دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ اس نے بارہا روشن بی کو کہا تھا کہ وہ بے بی کو ان چیزوں سے دور رکھنا چاہتی ہے اور روشن بی نے مثبت انداز میں جواب دے کر بات ہمیشہ ختم کر دی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ ایسا ہو گا۔

''مجھے سمجھ جانا چاہیے تھا کہ طوائف کا ہر رشتہ پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ختم ہوتا ہے وہ تو اپنی بھی سگی نہیں ہوتی۔'' اس کے اندر رچی بے بسی آنسوؤں میں ڈھلنے لگی۔

بہت سوچ کر اس نے لال خان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ لال خان کسی زمانے میں روشن بی کی چاہت ہوا کرتا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد۔ کبھی خوبرو بھی رہا ہو گا۔ لیکن اب تو کسی اجاڑ ویران کھنڈر کی صورت تھا۔ صرف آنکھیں تھیں جن میں آج بھی زندگی کی رمق باقی تھی۔ ایک تو نشہ اوپر سے یہ موذی مرض

جس نے اس کا بدن چاٹ لیا تھا، روشن بی نے اسے پرانی چاہتوں کے صلے میں اسے اپنے در پر پڑے رہنے کی اجازت تو دے دی تھی لیکن اس کا رویہ اس کے ساتھ کتوں سے بھی بدتر تھا۔ اسے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی، بس دو وقت کی روٹی اس کے آگے ڈال دی جاتی تھی۔ کبھی بہت مہربان ہوئی تو دوادارو کے چند روپے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ پیسے کبھی بھی اس مقصد کے لیے خرچ نہ ہوئے۔ لال خان بھی سب کچھ سن کر کان بند کیے وہیں پڑا رہتا۔ وہ جانتا تھا اس کا وقت بیت گیا ہے۔ جسم سے اٹھتے ناقابلِ برداشت تعفن کے ساتھ کہیں اور جانا ممکن بھی نہ تھا۔

''بی بی! لال خان وعدے کا پکا ہے، تمہارا کام ہو جائے گا لیکن بدلے میں تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔'' اس کی گرسنہ نگاہیں اس کے بدن پر جمی ہوئی تھیں۔ بیماری نے اس کا جسم چاٹا تھا اندر کی خباثت نہیں۔ عنبر پوری جان سے لرز گئی۔ شاید موت بھی اس قدر متعفن اور بھیانک نہیں ہوگی۔ اس کے کمرے میں چند لمحے رکنا محال تھا کجا کہ.....اسے ابکائی روکنا مشکل ہو گیا۔

''کتنی رقم چاہیے ہے تمہیں؟'' عنبر نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔

''بی بی میں جانتا ہوں تم میری بات سمجھ گئی ہو۔ یہ سودا نقد ہے۔ پیسے تو مجھے مل ہی جاتے ہیں۔'' اس نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے تو وہ اسے انتہائی بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔

''ایسی باتوں کی پرواز ندوں کو ہوتی ہے۔ میں تو محض ایک لاش ہوں.....اس کی طرح متعفن اور گلی سڑی۔'' اس نے خود کو جیسے تسلی دی۔ وہ جانتی تھی لال خان جیسا بھی ہے، ہے کام کا آدمی۔

''لیکن اس بات کی کیا گارنٹی کہ تم مجھے دھوکا نہیں دو گے۔'' وہ بہت بے یقین تھی۔

''گڈی بی بی ہم جیسے دو نمبری لوگ اپنے اصولوں کے پکے ہوتے ہیں۔'' لال خان کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

چھ مہینے گذر گئے۔ روشن بی تھک ہار کے بیٹھ گئی۔ کنوؤں تک میں بانس ڈلوائے گئے لیکن بے بی کا سراغ نہ ملا۔ سکول سے آتے ہوئے اس زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ گڈی بھی ایک عرصے تک زیرِ عتاب رہی۔ اسے عام تماش بینوں کی نذر کر دیا گیا۔ لیکن بے بی نے بازیاب ہونا تھا نہ ہوئی۔ لال خان وعدے کا پکا نکلا۔ اس نے کبھی زبان نہیں کھولی۔

اس نے چھ ماہ پہلے کینڈا سے آنے والا اپنی چھوٹی بہن کا پیغام پڑھا اور افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ ڈیلیٹ کا بٹن دبا دیا۔

'' آپو! پارسل مل گیا ہے۔''

اچانک ہی بڑے کمرے میں شور سنائی دینے لگا۔ شمسو چاچا کو توالی گئی ہوئے تھے۔ نیلم بخار میں پھنک رہی تھی۔ وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی بڑے کمرے کی طرف لپکی۔ ستارہ کا کسی تماش بین سے جھگڑا ہو گیا تھا۔

''تم رنڈیاں خود کو سمجھتی کیا ہو؟'' اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

گڈی کے پاؤں وہیں جم گئے۔ اتنے سالوں بعد بھی اس نے اُسے پہچان لیا تھا وہ وہی تھا۔

''تم جیسے لوگ ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں، تمہارا دھندا بند نہ کروایا تو میرا نام کاشف چوہدری نہیں۔'' وہ گرج کر بولا۔

''صاحب گذارا تو آپ کا بھی ان ناسوروں کے بغیر نہیں ہوتا۔'' وہ گری ہوئی ستارہ کو زمین سے اٹھاتے ہوئے بولی۔

'' آپ جانتے ہیں معاشرے کے بدن پر ایسے کوڑھ کب اُگتے ہیں'' گڈی نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''جب آپ جیسے رئیس زادوں کے منہ حرام لگ جائے صاحب۔''

'' فلسفہ بھگارنے کی ضرورت نہیں ہے چھنال زادی۔ میں تمہارا لیکچر سننے نہیں آیا ہوں۔'' کاشف سخت غصے میں تھا۔

'' چل ستارہ صاحب سے معافی مانگ اور ان کے ساتھ چلنے کی تیاری کر۔'' روشن بھی اچانک اندر آتے ہوئے بولی۔

''روشن آپا میں جاتی ہوں صاحب کے ساتھ۔'' عنبر کی آنکھوں میں التجا تھی۔

روشن بی کچھ نہ سمجھی لیکن اثبات میں سر ہلا دیا۔

عنبر نے بیگ سے لیبارٹری ٹیسٹ والا لفافہ نکال پر الماری میں رکھا ورسوٹ کیس لے کر باہر آ گئی۔ لال خان کا دیا ہوا بیماری کا تحفہ دوسرا درجہ عبور کر گیا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Arneegger Street- 10,9204
Andwil SG, Swizerland

● ثمینہ سید

ہے تو یہیں کہیں

عجیب سے دن ہیں نہ پہلے والے دنوں جیسے نہ آنے والے دنوں جیسے مخمصے، الجھنیں اور غلط فہمیاں۔ رافع کچھ کہتا مجھے کچھ اور سمجھ آتی۔ یہ سب کب سے شروع ہوا تھا میں روز اندازا کرتی مگر کوئی بھی سرا اب تک میرے ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے حد مانوس تھے۔ ''مانوس'' کا لفظ بھی انہی دنوں میری سمجھ میں آیا ہے مجھے ایک دم ادراک ہونے لگا ہے کہ میرا اور رافع کا ہر رشتہ مانوسیت تھی بے انتہا لگاؤ اور برسوں کا ساتھ۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ہر عادت ہر ضرورت سے واقف تھے بغیر کچھ کہے سنے سب جان لیتے تھے۔ اور یہ جاننا اب بھی جاری ہے۔ پانچ سال سے رافع اور میں ایک بھرپور زندگی گزار رہے تھے۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ ہر ضرورت پوری کرنا۔ خاندان بھر میں آئیڈیل میاں بیوی اور خاندان بھر کے ساتھ پرجوش تعلقات چھ ماہ پہلے تک ہم دونوں صرف ایک دوسرے کو سنتے تھے۔ اس کے باوجود کہ ہم ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے تھے۔ مگر یہ راز تو اب کھلا کہ ہم ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے۔ جب رافع کی آنکھوں میں ایک جیتا جاگتا عکس لہرانے لگا۔ وہ سوتے جاگتے بے چین رہنے لگا۔ فون پہ کسی سے بات کرتے اس کا روم روم مہکنے لگتا اس کا سانولا رنگ سرخ ہونے لگا تو میں چونکی۔

''کس کا فون تھا؟''

''کیوں؟'' وہ حیرت زدہ سا مجھے دیکھنے لگا تو میں شناسائی اور آگہی کے تمام تر مراحل طے کر آئی وہ سنبھلا اور مسکرایا ''زبیر کا فون تھا۔ کام سے متعلق، تمہیں کیا ہوا؟''

''نہیں۔ ہوا تو کچھ نہیں۔''

میں اتنا کہہ کر منظر سے ہٹ گئی اور جو میں نے جان لیا تھا اسے ہضم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اور رافع اپنے جھوٹ کو سنبھالنے میں لگا رہا۔

میں اکثر سوچتی تھی رافع کچھ خاص خوبصورت اور وجیہہ شخص نہیں ہے۔ بس بہت نیک سادہ مزاج اور

ذہین ہے۔ اس کی عادات اچھی ہیں۔ کام بہت محنت سے کرتا ہے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا جذبہ مجھے بہت ہی متاثر کرتا ہے مجھے لگتا تھا میں اس کی بیوی ہوں اس لیے اس سے پیار کرتی ہوں ورنہ اتنے عام سے مرد سے کوئی بھی لڑکی پیار نہیں کر سکتی پھر کچھ مہینوں سے یہ کون تھی؟؟ جس نے رافع کو محبت سے بھر دیا؟

''میں سوچ رہا تھا۔ سارے قمیض شلوار پرانے ہو رہے ہیں۔ موسم بدلنے والا ہے۔ تم کچھ سوٹ نکال کر کسی کو دے دو تا کہ نئے کپڑوں کی جگہ بن سکے۔'' رافع الماری میں جھانک کر بولا تو مجھے اچنبھا سا ہوا۔ میری ہنسی چھوٹ گئی۔

''کیا میں نے کچھ عجیب بات کی ہے؟'' وہ حیران ہوا اور الماری بند کر کے میرے قریب آ گیا۔ کافی سناٹا تھا کمرے کی فضا میں میرے اندر اور رافع کی آنکھوں میں بھی۔

''اچھا ہٹیں میں دیکھتی ہوں..... پرانے سوٹ۔'' میں نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کر ہٹانا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کچھ دیر بعد جانا۔ رکو ذرا'' رافع کی سرگوشی مجھے بہت جھوٹی لگی۔ میرا تو جیسے دم گھٹنے لگا۔

''آپ مجھ سے جھوٹی محبت کیوں جتانے لگے ہیں؟'' مجھ سے رہا نہیں گیا تو پوچھ بیٹھی۔ وہ ہٹ گیا۔

''تم ایسا کیسے سوچ سکتی ہو میرے بارے میں؟''

''رافع یہ تو سوال پر سوال تھا، جواب کون دے گا؟''

میری آنکھیں بھر آئیں۔ وہ منہ موڑ کر کچھ پل رکا رہا۔

''تم جانتی ہو میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اس طرح کا رویہ ہماری زندگی کو مشکل بنا دے گا۔''

''تو آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟''

میں سراپا سوال بنی کھڑی رہی وہ جن نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا ان میں ذرا بھی محبت نہیں تھی۔ وہ تو جھوٹ موٹ بھی نہ کہہ پا رہا تھا کہ ہاں محبت کرتا ہوں تم سے۔ چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ دیر تک کرچیاں ادھر ادھر بکھرنے کی آواز آتی رہی۔ رافع کے قدموں تلے کرچیاں مزید کرچیوں میں بٹتی رہیں اور وہ چلا گیا۔

رافع کی بھانجی کی شادی تھی ایبٹ آباد میں۔ سارے گھر والوں سمیت رافع کو بھی جانا پڑا۔ وہ ہمیشہ ایسی شادیاں بہت انجوائے کرتا تھا۔ خاندان کے لوگوں سے ملاقات ہوتی تو سب اس کی ذہانت اور لاہور جیسے شہر میں اتنا اچھا بزنس جما لینے، گھر بنا لینے کی تعریفیں کرتے۔ اس بار وہ بڑی گاڑی میں گھر والوں کو لے کر آیا تھا۔ سب خوب مدح سرائیاں کر رہے تھے مگر رافع کو لگنے لگا اس کے کان خراب ہو گئے ہیں۔ کچھ بھی صاف سنائی نہیں دیتا نہ کسی تعریف پہ دھیان جا رہا تھا۔ عجیب طرح کی بے چینی اس کے

وجود کو گھیرے ہوئے تھی۔ وہ بے چینی سے بار بار فون کو دیکھتا اور میں اسے۔

شادی پہ آ کے مجھے بھی خوب مزا آتا تھا۔ بندہ گھر بار کی فکروں، ساس سسر کی خدمتوں اور شوہر کی ناز برداریوں سے بچ کر دو چار دن مہمان ہونے کا مزا لے لیتا ہے لیکن اس بار.....

''مجھ سے بات کریں'' رافع کے فون پہ یہ میسج میں نے کھول کر پڑھا اور ڈیلیٹ کر دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اٹھ کر گیا تھا۔ بس جب میں نے میسج پڑھا اور مٹایا۔

''میں ذرا باہر مردوں میں بیٹھوں۔ یہ میرا موبائل دینا۔'' رافع نے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مجھے لگا میری شہ رگ میں سرسراہٹ سی ہوئی ہو جیسے کسی نے تیز ناخن گاڑ دیا ہو۔

''لیں۔ آپ بھول کیسے گئے حیرت ہے مجھے تو۔'' موبائل رافع کو تھماتے ہوئے میں نے کہا تو وہ لے کر چلا گیا۔ اب اکثر اسی طرح کے فقرے ہمارے درمیان چلتے رہتے تھے۔

''میں کسی لمحے کی گرفت میں آ گیا ہوں۔ شاید یہ وہ احساس ہے جسے محبت کہتے ہیں۔ جو آپ کے خون میں شامل ہو جاتی ہے اور خون کی گردش اس کے حساب سے کم اور زیادہ ہوتی ہے۔ بس ایک ہی دھن ایک ہی احساس سارے بدن کو۔ بلکہ پور پور کو غلام بنا لیتا ہے..... ساری چیزیں ٹھیک تو تھیں پھر یہ محبت..... یہ کہاں سے آ گئی۔ میں نے ایک جگہ پڑھا تھا محبت بنجر ویران زمین پر اچانک پھوٹ پڑتی ہے اور کسی خودرو پودے کی طرح اگتی پھلتی پھولتی چلی جاتی ہے۔ تو کیا اب تک میرے دھیان کی زمینیں بنجر تھیں؟؟؟ کتنے سوال سر اٹھائے چہرے پہنے میرے اردگرد ہیں اور مجھے ذرا بھی پروا نہیں۔ پروا ہے تو بس اپنے مصروف ترین معمولات میں سے اس کے لیے وقت نکالنے کی، اسے دیکھنے اور ڈھیر ساری باتیں کرنے کی۔ یہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات کرنے کی عادت کب تھی مجھے؟؟ مگر اب ہے۔ اب باتیں اتنی زیادہ ہو جاتی ہیں کہ وقت کم پڑ جاتا ہے روز ہی ملاقات ادھوری رہ جاتی ہے۔''

یہ رافع کی ڈائری میں لکھا ہے جس نے مجھے یعنی مسز عمارہ رافع کو آسمان سے زمین پر پٹخ دیا ہے اور میں بہت بری حالت میں بے انتہا تہی دامنی میں زمین پر بیٹھی ہوں۔ ایک دم میرا سارا وجود بے مول ہو گیا ہے اور مجھے اپنے پورے بدن پر چیونٹیاں رینگتی محسوس ہو رہی ہیں۔ مجھے ایک پل میں رافع مظلوم اور بے قصور لگنے لگا۔ اور تو اور میں نے ذرا غور کیا تو وہ مجھے کسی قدر عظیم بھی لگا۔ جس نے اپنی شدید محبت پر مجھے میرے گھر اور میرے بیٹے کو قربان نہیں کیا۔ بلکہ ہمارے ساتھ ہے۔ شاید اس نے طے کر لیا ہے کہ اس کا خالی کھوکھلا وجود محافظ بن کر ہمارے ساتھ رہے گا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہے اور بے حد تنہائی بھی۔''

رافع کے موبائل پر یہ الفاظ چمک رہے ہیں۔ میں نے ڈیلیٹ کر دیا اور موبائل کو جوں کا توں رہنے دیا۔ خالی..... جیسے میرا گھر چل رہا تھا۔ خالی اور بے مزہ۔

''یار آج کل تو ہر ڈرامہ ہر فلم حتیٰ کہ ہر کارٹون فلم بھی اس موضوع پر بن رہی ہے۔ ایک بیوی ایک وہ۔'' ایک زبردست قہقہہ خواتین کلب کے در و دیوار میں گونجا۔ تو مجھے نظریں چرانا پڑیں۔

مجرم تو رافع ہے اور مجرم میں بن بیٹھی ہوں اپنی نظر میں۔ گھر والوں کی نظر میں اور خود رافع کی نظر میں۔ میں نے ہر وقت کے طنز سے گھر کا ماحول خراب کر رکھا ہے۔

''میرے خیال میں تو آپ کا شوہر ایسی کسی سرگرمی میں ملوث ہو تو اس کا پیچھا کریں اور شوہر کی اور اس کی ''وہ'' کی خوب دھنائی کریں کہ دونوں کی عقل ٹھکانے آ جائے۔'' مسز اسد انتہائی غضب ناک انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''اور اگر آپ ایسا نہ کر سکتے ہوں تو؟'' میں نے کمزور سے لہجے میں پوچھا۔

''تو..... تو.....؟؟؟'' وہ ساری سوچنے لگیں۔

''تو شوہر کو اس سے شادی کی اجازت دے دو۔'' ثمرہ نے کہا۔

''وہ اور شوہر لڑ لڑ کر اکتا جائیں گے ایک دوسرے سے اور پھر شوہر پورا واپس آ جائے گا.....'' سب کا قہقہہ میرے دماغ کی نسیں پھاڑنے لگا۔

''اور اگر واپس نہ آیا تو؟'' میں نے پھر پوچھا۔ تو سب میرے اردگرد آ بیٹھیں۔

''یہ شوہر لوگ اتنے برے ہوتے نہیں جتنا ہم انہیں سمجھ لیتے ہیں۔ مجھے تو ایمان کی حد تک یقین ہے کہ شوہر حضرات دوسری عورت سے صرف محبت کرتے ہیں۔ وہ محبت جو ان کے وجود میں زائد پڑی ہوتی ہے اور وقت گزارتے ہیں یا وہ سمجھتے ہیں وہ ثواب کما رہے ہیں ایک لاوارث عورت کو محبت اور وقت دے کر۔ میرے خیال میں تو پیسہ بھی نہیں دیتے اور اگر کچھ لوگ کسی قدر لگاتے بھی ہیں تو وہ ان کے خاندان سے فالتو اور غیر ضروری ہو گا مطلب زائد۔'' سلمیٰ نے سمجھداری کی حد کر دی۔ سب ہنسے جا رہی تھیں سلمیٰ کے ''زائد'' کو سب نے بہت انجوائے کیا۔ اور میں ایک فیصلہ کر کے اٹھ آئی۔ میں چلتے پھرتے سوچ رہی تھی سلمیٰ سچ تو کہتی ہے۔

''اس'' کا وقت بے وقت میسج یا فون نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رافع نے اسے روکا ہو گا..... میری وجہ سے..... تیز ہوا چل رہی تھی۔ آندھی کا شور اور زور کھڑکیاں دروازے بجا رہا تھا۔

رافع کو تیز بخار تھا۔ ایسے لگ رہا تھا اس کا جسم اور دماغ دونوں جل رہے ہیں۔ میں برف کی

پٹیاں رکھ رہی تھی پھر بھی رافع بے سدھ ہوتا جا رہا تھا۔اسی لمحے موبائل پہ میسج چمکا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر موبائل تکیے کے نیچے رکھ دیا۔مگر بے چینی سے میرا پٹیاں کرتا ہاتھ رک گیا۔میں نے میسج کھولا۔

''آپ نے مجھے باندھ رکھا ہے۔یہ عجیب محبت ہیں میں مر رہی ہوں یا آپ۔ہم ایک دوسرے کا پتا بھی نہیں کر سکتے۔رافع..... یہ ظلم کی حد ہے۔آپ بیمار ہیں اور میں بے خبر.....''

دوسرا میسج آ گیا۔

''رافع آپ نے محبت کا ہاتھ بڑھایا تھا۔تب آپ کو ان سارے حالات کا اندازہ نہیں تھا؟ ایک طرف دیکھوں تو آپ کی بے انتہا محبت ہے۔توجہ، خلوص، ہر وقت مجھ پر نظر۔مجھے خود میں پوری طرح الجھا لیا ہے اور دوسری طرف میں کچھ بھی نہیں۔کچھ ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ آپ کے نزدیک آپ کے گھر کا سکون اہم ہے۔''

وہ رو رہی تھی شاید رو تو میں بھی رہی تھی۔میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔احساس کوئی بھی نہیں تھا۔ سب گڈمڈ تھا سب کچھ۔''میں اب بہتر ہوں تم فکر نہ کرو تمہارے ہر سوال کا جواب جلد دیتا ہوں۔میں بھی تم سے دور نہیں رہ سکتا۔تمہیں اپنا لوں گا اکیلے نہیں رہنے دوں گا''

میں نے لکھا.....اور.....ہچکیوں سے رونے لگی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا کیوں آخر.....؟ میں نے تمہارا یا تمہارے گھر کا کیا نقصان کیا تھا؟ اتنا عرصہ گزر گیا۔کچھ بھی غلط ہوا بتاؤ مجھے؟ رافع اجڑے بکھرے وجود کے ساتھ سراپا سوال بنا میرے سامنے کھڑا تھا اور میں بے حد حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کتنی بار تمہیں روکا تھا کہ میرا موبائل نہ دیکھا کرو۔مجھ پہ نظر رکھو گی تو مجھے کھو بیٹھو گی سب کچھ ختم ہو جائے گا مگر تم.....تم نے سب کچھ اپنے طریقے سے ختم کر دیا تم تو تقدیریں لکھنے لگی ہو''تم اتنی ظالم اور سفاک عورت ہو مجھے اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا۔تم کسی کی جان کیسے لے سکتی ہو؟ کیسے بھلا؟؟؟.....''

میری حیران آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''میں نے سچ مچ فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ اسے اپنا لیں بس آپ سے کہنے کی ہمت نہیں تھی تو اس سے کہہ دیا آپ دونوں ایک ہی تو تھے پھر؟''

''وہ بہت خوش تھی کہ وہ سب میں نے کہا ہے۔''رافع سر نیہوڑائے ڈھے سا گیا۔''تو آپ کہہ دیتے.....''میرا دل لرز رہا تھا ڈرتے ڈرتے پوچھا

''اسے کیا ہوا؟''

''مر گئی وہ.....دفنا کے آ رہا ہوں۔''وہ رونے لگا اور میں بھی رونے لگی.....میں کیوں رو رہی تھی۔میں نے ایسا نہیں چاہا تھا۔مگر اس میں تو میرا فائدہ تھا۔پھر.....پھر میں کیوں رو رہی تھی؟

''اس کا مان، بھرم سب ٹوٹ گیا۔جب میں نے کہا.....''میں ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں؟ میری بیوی.....میرا بچہ ہے میں تم سے شادی کیسے کر سکتا ہوں؟''

''تو آپ اس کے ساتھ کیا کر رہے تھے؟ آپ یہ نہیں کر سکتے۔وہ نہیں کر سکتے۔تو کر کیا رہے تھے؟ آپ تو مر رہے تھے اس کے لیے؟''

''یہ قتل آپ نے کیا ہے۔میں نے نہیں۔''میں پوری قوت سے چلائی۔

''تم بہت گھٹیا عورت ہو۔تم نے اسے مار دیا۔''رافع رونے لگا۔

''آپ اپنا چہرہ دیکھئے ذرا آئینے میں۔آپ نے اسے مجھے، خود کو اور ہمارے رشتے کو، سب کو قتل کر دیا۔''

''تم مجھ پر یہ الزام ڈال کر بری الذمہ نہیں ہو سکتیں۔''

رافع پھر دھاڑا۔''تم نے اسے خوش فہمی دی۔''

''تو آپ مان دے لیتے۔''

''قاتل ہو تم یہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔''رافع نے مجھے گھورتے ہوئے آنکھیں پونچھیں۔میں نے دروازے کی طرف دیکھا کہ کہیں ہمارا بیٹا یہ ساری گفتگو نا سن لے۔

یہ دن ٹھہر گئے ہیں۔اب روز یہی کچھ ہوتا ہے ہمارے گھر میں۔وہ نہیں ہے لیکن ہر کہیں وہ موجود ہے وہ یہیں ہمارے درمیان ہے۔

پھرتی ہے اک شناسا سی خوشبو یہیں کہیں
لگتا ہے جیسے آج بھی ہے تو یہیں کہیں

◂◂ ● ▸▸

21-N, New Minimarket
samnaabad, Lahore, Pakistan

- **تجزیہ**
- **مصاعد قدوئی**

قاضی عبدالستار اور پیتل کا گھنٹہ

قاضی عبدالستار کی شناخت ان کا منفرد اسلوب اور مخصوص موضوع ہے۔ قاضی صاحب کا تعلق اتر پردیش کے زمیندار گھرانے سے ہے اور انہوں نے زمینداری کے تمام نشیب و فراز دیکھے ہیں زمینداری ختم ہونے کے بعد ایک پورا معاشرہ ختم ہو گیا۔

قاضی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ وہ صہبا تخلص کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۶ تک انہوں نے اس شوق کو برقرار رکھا۔ مگر بارہ بنکی کے ایک مشاعرے میں ۱۹۵۶ میں ایک ایسا واقعہ ہوا کہ انہوں نے شاعری ترک کر دی۔ جیسا کہ وہ بتاتے ہیں کہ ایک مشاعرے میں وہ ایک رئیس کے مہمان خانے میں آرام فرما رہے تھے کہ کچھ لڑکیاں ادھر آتی نظر آئیں۔ اچانک ان کی والدہ دوڑ کر ان لڑکیوں کے پاس آئیں اور کہا۔ ''ادھر مت جانا وہاں ایک شاعر ٹھہرا ہوا ہے۔'' قاضی صاحب کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا اور انہوں نے سوچا کہ جب لوگ اپنی لڑکیوں کو شاعر کے قریب جانے سے روکتے ہیں تو شاعری اچھا فعل نہیں ہے لہذا شاعری ترک کر دی۔ اس کے بعد نثر سے ان کی محبت بڑھ گئی گو اس سے پہلے ۱۹۴۸ میں ان کا پہلا افسانہ 'اندھا' کے عنوان سے ایک رسالے میں شائع ہو چکا تھا۔

۱۹۵۴ میں انہوں نے اپنا پہلا ناول 'شکست کی آواز' تحریر کیا، جو خاص و عام میں بہت مقبول ہوا اور یہاں سے ان کا سفر ۱۹۶۱ میں مجو بھیا ۱۹۶۳ میں 'غبارِ شب' ۱۹۶۴ میں 'شب گزیدہ' کے ساتھ بڑھتے ہوئے 'پیتل کا گھنٹہ' تک پہنچا۔ ۱۹۶۴ میں انہوں نے با آواز بلند کہا کہ یہ عہد نثر کا عہد ہے شاعری کا نہیں۔

دیہات اور زمینداری قاضی صاحب کا پسندیدہ موضوع ہے۔ گو پریم چند کے افسانوں کا موضوع بھی یہ ہی ہے مگر کردار اور دور مختلف ہے۔ پریم چند کے افسانوں کا دور آزاد ہندوستان سے پہلے کا ہے اور قاضی صاحب کا دور آزادی کے بعد کا۔ پریم چند کے دور میں زمیندار ظالم اور کسان مظلوم ہے۔ قاضی صاحب کے دور میں کیونکہ جاگیردارنہ نظام کا خاتمہ ہو چکا تھا لہذا زمیندار مظلوم اور مسکین نظر آتا ہے۔

پریم چند کے افسانوں میں کسانوں کی مجبوریوں اور دشواریوں کا ذکر ہے تو قاضی صاحب کے افسانوں میں زمیندار کی مظلومیت اور قلبی کیفیت نظر آتی ہے۔

'پیتل کا گھنٹہ' کا موضوع خاتمۂ زمینداری سے پیدا ہونے والے معاشرتی حالات اور دیہی زندگی کا المیہ ہے۔ پہلے جملے میں لفظ 'لاری' قاری کو یہ احساس دلا دیتا ہے کہ افسانہ قدیم دور سے جدید دور میں داخل ہو چکا۔ جیسے جیسے افسانہ آگے بڑھتا ہے۔ ماضی اور حال کے بیچ کی دوریاں ختم کرتا جاتا ہے۔

بھسول کے قاضی انعام حسین جو ہمہ وقت اس فکر میں ہیں کہ کہیں دیواریں اتنی کمزور نہ ہو جائیں کہ چھت کا بوجھ بھی نہ سنبھال سکیں۔ قاضی انعام حسن کے پاس زمینداری کے خاتمے کے بعد اگر کچھ باقی رہ گیا تھا تو وہ تھا 'پیتل کا گھنٹہ' جو پرانے وقت کی یادگار اور ان کی آن، بان اور شان کی تاریخ بھی تھا۔ کہنے کو اس افسانہ میں کئی کردار ہیں مگر افسانہ قاضی انعام حسین کے اردگرد ہی گھومتا ہے۔

قاضی صاحب کا بیانیہ انتہائی رواں اور چست ہوتا ہے جس کی وجہ سے قاری الفاظ کے دریا میں بہتا چلا جاتا ہے۔ قاضی صاحب جب نثر تحریر کرتے ہیں تو تشبیہیں ان کی باندی اور استعارے غلام نظر آتے ہیں جو ان کی بارگاہ میں ان کی چشمِ ابرو کے ایک اشارے پر مجرا کرنے لگتے ہیں۔

'پیتل کا گھنٹہ' کے جملے بھی مرصع اور برجستہ ہیں۔ منظر نامہ ماحول کی مناسبت سے ہے اور ہر کردار گویا انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہو۔

''ایک بار نگاہ اٹھی تو سامنے دو درختوں کی چوٹیوں پر مسجد کے مینار کھڑے تھے۔''

''جس میں الگ الگ دو پیالیاں، لب سوز، بند چائے سے لبریز رکھی تھیں۔''

زمینداری کے وقت قاضی انعام حسین وہ تھے جن کی حکومت اور دولت کے افسانے سنائے جاتے تھے۔

''قاضی انعام حسین جن کے لیے بندوقوں کا لائسنس لینا ضروری نہیں تھا جنہیں ہر عدالت طلب نہیں کر سکتی تھی۔''

مگر زمینداری کے خاتمے کے بعد.....

''ہم اس چکر دار ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے جس کی اندھیری چھت کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی، دھنّیوں کو گھنے ہوئے بدصورت شہتیر روکے ہوئے تھے.....''

اس افسانہ کا منظر نامہ اور کردار نگاری ماضی اور حال دونوں کا آئینہ دار ہے۔

''وہ کلاسکی کاٹ کی بانات کی اچکن اور پورے پائنچے کا پائجامہ اور فرکی ٹوپی پہنے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر ان کی سفید پوری مونچھیں اور حکومت سے سینچیں ہوئی آنکھیں دیکھیں۔'' (ماضی)

''ڈیوڑھی سے قاضی صاحب نکلے لمبے قد کے جھکے ہوئے، ڈوریئے کی قمیض، میلا پائجامہ اور موٹر ٹائر کے تلوؤں کا پرانا پمپ پہنے ہوئے۔'' (حال)

''پھر انہوں نے لپک کر الگنی پر پڑی مارکین کی دھلی چادر گھسیٹ لی اور دوپٹے کی طرح اوڑھ لی۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر دیا کہ کرتے کے دامن میں لگا دوسرے کپڑے کا چمکتا پیوند چھپ جائے۔''

افسانہ کا اختتام نہ صرف قاری کو ہلا دیتا ہے بلکہ جذبات میں تلاطم بھی پیدا کرتا ہے۔ پیتل کا گھنٹہ قاضی صاحب کے ان افسانوں میں سے ہے جو اردو ادب کی آبرو ہیں۔ بقول پروفیسر صغیر افراہیم:

''ان کے اسلوب بیان نے ایک نئے ادبی مزاج کی تعمیر و تشکیل کے باب میں بڑا کام کیا، اور ایک پوری پیڑھی کو پروان چڑھایا ہے۔ وہ عہد حاضر میں برصغیر کے ممتاز، معتبر اور بزرگ ناول نگار کے ساتھ ساتھ ایسی قوتِ تخلیق کے مالک ہیں جس سے اگر وہ خود بھی چاہیں تو بھی نجات نہیں پا سکتے۔''

◂◂ ● ▸▸

Flat No. 1 Zakaria Market, Medical Road Aligarh (U.P)

کراچی سے تعلق رکھنے والے ادیب و محقق **راشد اشرف** کی ۲۰۱۵ء میں بالترتیب چھٹی اور ساتویں کتابیں شائع ہوگئی ہیں:

''حیرت کدہ''

خودنوشتوں اور دیگر کتب سے ماورائے عقل اور مافوق الفطرت واقعات

صفحات:500 قیمت:600

گلدستہ شاہد (احمد دہلوی)

شاہد دہلوی کے جریدے ساقی سے انتخاب، اداریے، مضامین اور شاہد دہلوی پر لکھے خاکے دو درجن سے زائد انتہائی نایاب تصاویر کے ہمراہ

صفحات:450 قیمت:400 صرف

ہندوستان میں حصول کے لیے رابطہ کیجیے:

محمد انیس الدین، پلاٹ نمبر B-6، آفرین، ٹیچرس کالونی پوسٹ بکس کھام گاؤں سٹی ضلع بلڈانہ، ریاست مہاراشٹر (انڈیا) 444303

برقی پتہ: anis_riz@yahoo.com رابطہ نمبر: 9422884848

- **انتخاب**
- **قاضی عبد الستار**

پیتل کا گھنٹہ

آٹھویں مرتبہ ہم سب مسافروں نے لاری کو دھکا دیا اور ڈھکیلتے ہوئے خاصی دور تک چلے گئے۔ لیکن انجن گنگنایا تک نہیں۔ ڈرائیور گردن ہلاتا ہوا اتر پڑا کنڈکٹر سڑک کے کنارے ایک درخت کی جڑ پر بیٹھ کر بیڑی سلگانے لگا۔ مسافروں کی نظریں گالیاں دینے لگیں اور ہونٹ بڑبڑانے لگے۔ میں بھی سڑک کے کنارے سوچتے ہوئے دوسرے پیڑ کی جڑ پر بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔ ایک بار نگاہ اٹھی تو سامنے دور درختوں کی چوٹیوں پر مسجد کے مینار کھڑے تھے۔ میں ابھی سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ ایک مضبوط کھُردرے دیہاتی ہاتھ نے میری چٹکیوں سے آدھی جلی ہوئی تیلی نکال لی۔ میں اس کی بے تکلفی پر ناگواری کے ساتھ چونک پڑا۔ مگر وہ اطمینان سے اپنی بیڑی جلا رہا تھا وہ میرے پاس ہی بیٹھ کر بیڑی پینے لگا یا بیڑی کھانے لگا۔

''یہ کون گاؤں ہے۔؟'' میں نے میناروں کی طرف اشارہ کر کے دیکھا۔

''یو..... یو بھسول ہے۔''

بھسول کا نام سنتے ہی مجھے اپنی شادی یاد آ گئی۔ میں اندر سلام کرنے جا رہا تھا کہ ایک بزرگ نے ٹوک کر روک دیا۔ وہ کلاسکی کاٹ کی بانات کی اچکن اور چوڑے پائنچے کا پاجامہ اور فر کی ٹوپی دیے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر ان کی سفید پوری مونچھیں اور حکومت سے سینچی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ انھوں نے سامنے کھڑے ہوئے خدمتگار کے ہاتھ سے پھولوں کی بدّھیاں لے لیں اور مجھے پہنانے لگے۔ میں نے بل کھا کر اپنی بنارسی پوت کی جھلملاتی ہوئی شیروانی کی طرف اشارہ کر کے تلخی سے کہا

''کیا یہ کافی نہیں تھی؟''

وہ میری بات پی گئے۔ بدّھیاں برابر کیں پھر میرے ننگے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا۔

''اب تشریف لے جائیے۔''

میں نے ڈیوڑھی پر کسی سے پوچھا کہ یہ بزرگ کون تھے۔ بتایا گیا کہ یہ بھسول کے قاضی انعام

حسین ہیں۔ بھسول کے قاضی انعام حسین، جن کی حکومت اور دولت کے افسانے میں اپنے گھر میں سن چکا تھا۔ میرے بزرگوں سے ان کے جو مراسم تھے مجھے معلوم تھے۔ میں اپنی گستاخی نگاہوں پر شرمندہ تھا۔ میں نے اندر سے آ کر کئی بار موقع ڈھونڈھ کر ان کی چھوٹی موٹی خدمتیں انجام دیں۔ جب میں چلنے لگا تو اُنھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، مجھے بھسول آنے کی دعوت دی اور کہا کہ اس رشتے سے پہلے بھی تم میرے بہت کچھ تھے لیکن اب تو داماد بھی ہو گئے ہو۔ اس قسم کے رسمی جملے بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس وقت ان کے لہجے میں خلوص کو ایسی گرمی تھی کہ کسی نے یہ جملے میرے دل پر لکھ دیئے۔

میں تھوڑی دیر کھڑا بگڑی ''بس'' کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنا بیگ جھلاتا ہوا جتے ہوئے کھیتوں میں اٹھلاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ سامنے وہ شاندار مسجد کھڑی تھی، جسے قاضی انعام حسین نے اپنی جوانی میں بنوایا تھا۔ مسجد کے سامنے میدان کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے مکان کا سلسلہ تھا، جن میں شاید کبھی بھسول کے جانور رہتے ہوں گے۔ ڈیوڑھی کے بالکل سامنے دو اُونچے آم کے درخت ٹرافک کے سپاہی کی طرح چھتری لگائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے جل گئے تھے۔ جگہ جگہ مٹی بھری تھی۔ ڈیوڑھی کے دونوں طرف عمارتوں کے بجائے عمارتوں کا ملبہ پڑا تھا۔ دن کے تین بجے تھے وہاں اس وقت نہ کوئی آدمی تھا نہ آدم زاد کہ ڈیوڑھی سے قاضی صاحب نکلے۔ لمبے قد کے جھکے ہوئے، ڈوریے کی قمیص، میلا پاجامہ اور موٹر ٹائر کے تلوں کا پرانا پمپ پہنے ہوئے، ماتھے پر ہتھیلی کا چھجہ بنائے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ جواب دینے کے بجائے وہ میرے قریب آئے اور جیسے یک دم کھل گئے۔ میرے ہاتھ سے میرا بیگ چھین لیا اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ڈیوڑھی میں گھس گئے۔

ہم اس چکر دار ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے جس کی اندھیری چھت کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی۔ دھنیوں کو گھنے ہوئے بدصورت شہتیر روکے ہوئے تھے۔ وہ ڈیوڑھی ہی سے چلّائے۔

''ارے سنتی ہو۔ دیکھو تو کون آیا ہے۔ میں نے کہا اگر صندوق وندوق کھولے بیٹھی ہو تو بند کر لو جلدی سے۔'' لیکن دادی تو سامنے کھڑی تھیں، ڈھلے ہوئے گھڑوں کی گھڑونچی کے پاس۔ دادا ان کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ وہ بھی شرمندہ سی کھڑی تھیں۔ پھر انہوں نے لپک کر گھر کے الگنی پر پڑی مارکین کی دھلی چادر گھسیٹ لی اور دوپٹہ کی طرح اوڑھ لی۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر دیا کہ کرتے کے دامن میں لگا دوسرے کپڑے کا چمکتا پیوند چھپ جائے۔ اس اہتمام کے بعد وہ میرے پاس آئیں اور کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔ سکھ اور دکھ کی گنگا جمنی آواز میں دعائیں دیں۔ دادی کانوں سے میری بات سن رہی تھیں۔ لیکن ہاتھوں سے جن کی جھریاں بھری کھال جھول گئی تھی، دالان کے اکلوتے ثابت پلنگ کو صاف کر رہی تھیں جس پر میلے کپڑے، کتھے

چونے کی کلھیاں اور پان کی ڈلیاں ڈھیر تھیں اور آنکھوں سے کچھ اور سوچ رہی تھیں، مجھے پلنگ پر بیٹھا کر دوسرے جھنگا پلنگ کے نیچے سے پنکھا اٹھا لائیں، جس کے چاروں طرف کالے کپڑے کی گوٹ لگی تھی اور کھڑی ہو کر اس وقت تک جھلتی رہیں جب تک میں نے چھین نہ لیا۔ پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔ وہ ایک تین دروں کا دالان تھا۔ بیچ میں مٹی کا چولہا بنا تھا۔ المونیم کی چند میلی پتیلیاں، کچھ پیپے، کچھ ڈبّے، کچھ شیشے، بوتل اور دو چار اسی قسم کی چھوٹی موٹی چیزوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ میری طرف پیٹھ کیے چولہے کے سامنے بیٹھی تھیں۔ دادا نے کونے میں کھڑے ہوئے پرانے حقّہ سے بے رنگ چلم اتاری اور باورچی خانہ میں گھس گئے۔ میں ان دونوں کی گھن گھن کرتی سرگوشیاں سنتا رہا۔ دادا کئی بار جلدی جلدی باہر گئے اور آئے۔ میں نے اپنی شیروانی اتاری۔ ادھر ادھر دیکھ کر چھ دروازوں والے کمرے کے کواڑ پر ٹانگ دی۔ نقشین کواڑ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ ایک جگہ لوہے کی پتی لگی تھی۔ لیکن بیچو بیچ گول دائرے میں ہاتھی دانت کا کام، کتھے اور تیل کے دھبّوں میں جگمگا رہا تھا۔ بیگ کھول کر میں نے چپل نکالے اور جب تک میں دوڑوں دوڑوں دادا گھڑونچی پر سے گھڑا اٹھا کر اس لمبے چوڑے کمرے میں رکھ آئے جس میں ایک بھی کواڑ نہ تھا۔ صرف گھیرے لگے کھڑے تھے۔ جب میں نہانے گیا تو دادا المونیم کا لوٹا میرے ہاتھ میں پکڑا کر مجرم کی طرح بولے۔

''تم بیٹے! اطمینان سے نہاؤ۔ اِدھر کوئی نہیں آئے گا۔ پردے تو میں ڈال دوں لیکن اندھیرے ہوتے ہی چمگادڑ گھس آئے گی۔ اور تم کو دِق کرے گی۔''

میں گھڑے کو ایک کونے میں اٹھا لے گیا۔ وہاں دیوار سے لگا، اچھی خاصی سینی کے برابر پیتل کا گھنٹہ تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا گھنٹے میں مونگریوں کی مار سے داغ پڑ گئے تھے۔ دوانگلی کا حاشیہ چھوڑ کر جو سوراخ تھا اس میں سوت کی کالی رسّی بندھی تھی۔ اس سوراخ کے برابر ایک بڑا سا چاند تھا اس کے اوپر سات پہل کا ستارہ تھا۔ میں نے تولیہ کے کونے سے جھاڑ کر دیکھا تو وہ چاند تارا بھسول اسٹیٹ کا مونوگرام تھا۔ عربی رسم الخط میں ''قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ'' کھدا ہوا تھا۔ یہی وہ گھنٹہ تھا جو بھسول کی ڈیوڑھی پر اعلان ریاست کے طور پر تقریباً ایک صدی سے بجتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اسے روشنی میں دیکھنے کے لئے اٹھانا چاہا لیکن ایک ہاتھ سے نہ اٹھا سکا۔ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دیکھتا رہا۔ میں دیر تک نہاتا رہا جب باہر نکلا تو آنگن میں قاضی انعام حسین پلنگ بچھا رہے تھے۔ قاضی انعام حسین جن کی گدی نشینی ہوئی تھی۔ جن کے لیے بندوقوں کا لائسنس لینا ضروری نہیں تھا۔ جنہیں ہر عدالت طلب نہیں کر سکتی تھی۔ دونوں ہاتھوں پر خدمتگاروں کی طرح طباق اٹھائے ہوئے آئے۔ جس میں الگ الگ رنگوں کی دو پیالیاں ''لب سوز'' لب بند چائے سے لبریز رکھی تھیں۔ ایک بڑی سی پلیٹ میں دوابلے ہوئے انڈے کاٹ کر پھیلا دیے گئے تھے۔ شروع اکتوبر کی خوشگوار ہوا کے ریشمی جھونکوں میں ہم لوگ بیٹھے نمک

پڑی ہوئی چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ دروازے پر کسی بوڑھی آواز نے ہانک لگائی۔

''مالک!''

''کون؟''

''مہتر ہے آپ کا۔صاحب جی کو بلا بے آئے ہے۔''

دادا نے گھبرا کر احتیاط سے اپنی پیالی طباق میں رکھی اور جوتے پہنتے ہوئے باہر چلے گئے۔اپنے بھلے دنوں میں اس طرح شاید وہ کمشنر کے آنے کی خبر سن کر بھی نہ نکلے ہوں گے۔

میں ایک لمبی ٹہل لگا کر جب واپس آیا تو ڈیوڑھی میں مٹی کے تیل کی ڈبیا جل رہی تھی۔دادا باورچی خانے میں بیٹھے چولہے کی روشنی میں لالٹین کی چمنی جوڑ رہے تھے۔میں ڈیوڑھی سے ڈبیا اٹھا لایا اور اصرار کر کے ان سے چمنی لے کر جوڑنے لگا۔

ہاتھ بھر لمبی لالٹین کی تیز گلابی روشنی میں ہم لوگ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔دادا میرے بزرگوں سے اپنے تعلقات بتاتے رہے۔اپنی جوانی کے قصّے سناتے رہے۔کوئی آدھی رات کے قریب دادی نے زمین پر چٹائی بچھائی اور دسترخوان لگایا۔بہت سی ان میل بے جوڑ اصل چینی کی پلیٹوں میں بہت سی قسموں کا کھانا چنا۔شاید میں نے آج تک اتنا نفیس کھانا نہیں کھایا تھا۔

صبح میں دیر سے اٹھا۔یہاں سے وہاں تک پلنگ پر ناشتہ چنا ہوا تھا۔دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ دادی نے رات بھر ناشتہ پکایا ہے۔جب میں اپنے جوتے پہننے لگا تو رات کی طرح اس وقت بھی دادی نے مجھے آنسو بھری آواز سے روکا۔میں معافی مانگتا رہا۔دادی خاموش کھڑی رہیں، جب میں شیروانی پہن چکا دروازے پر یکّہ آ گیا، تب دادی نے کانپتے ہاتھوں سے میرے بازو پر امام ضامن باندھا۔ان کے چہرے پر چونا پتا ہوا تھا۔آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں، انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ اکاون روپے تمہاری مٹھائی کے ہیں اور دس کرائے کے۔''

''ارے.....ارے دادی.....آپ کیا کر رہی ہیں؟'' اپنی جیب میں جاتے ہوئے روپیوں کو میں نے پکڑ لیے۔

''چپ رہو تم.....تمہاری دادی سے اچھے تو ایسے ویسے لوگ ہیں۔جو جس کا حق ہوتا ہے، وہ دے تو دیتے ہیں۔غضب خدا کا تم زندگی میں پہلی بار میرے گھر آؤ اور میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چٹ بھی نہ دے سکوں.....میں.....بھیّا.....تیری دادی تو فقیرن ہوگئی.....بھکارن ہوگئی۔''

معلوم نہیں کہاں کہاں کا زخم کھل گیا تھا۔وہ دھاروں دھار رو رہی تھیں، دادا میری طرف پشت

کیے کھڑے تھے اور جلدی جلدی حقّہ پی رہے تھے۔مجھے رخصت کرنے دادی ڈیوڑھی تک آئیں لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں۔میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اور گردن ہلا کر رخصت کر دیا۔

دادا قاضی انعام حسین تعلقدار بھسول تھوڑی دیر تک میرے یکّہ کے ساتھ چلتے رہے، لیکن نہ مجھ سے نگاہ ملائی نہ مجھ سے خدا حافظ کہا۔ایک بار نگاہ اٹھا کر دیکھا اور میرے سلام کے جواب میں گردن ہلا دی۔

سدھولی جہاں سے سیتا پور کے لیے مجھے بس ملتی ابھی دور تھا۔میں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرے یکّہ کو سڑک پر کھڑی ہوئی سواری نے روک لیا۔جب میں ہوش میں آیا تو میرا یکّہ والا ہاتھ جوڑے مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''میاں.....اِلّی شاہ جی بھسول کے ساہوکار ہیں ان کے یکّہ کا بم ٹوٹ گوا ہے، آپ برا نہ مانو تو الّی بیٹھ جائیں۔''

میری اجازت پا کر اس نے شاہ جی کو آواز دی۔شاہ جی ریشمی کرتا اور مہین دھوتی پہنے آئے اور میرے برابر بیٹھ گئے اور یکّے والے نے میرے اور ان کے سامنے پیتل کا گھنٹہ ''دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر رکھ دیا۔گھنٹے کے پیٹ میں مونگری کی چوٹ کا داغ بنا تھا۔دو انگل کے حاشیے پر سوراخ میں سوت کی رسّی پڑی تھی۔اس کے سامنے قاضی انعام حسن آف بھسول اسٹیٹ اودھ کا چاند اور ستارے کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔میں اسے دیکھ رہا تھا شاہ جی مجھے دیکھ رہے تھے۔اور یکّے والا ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔یکّے والے سے رہا نہ گیا۔اس نے پوچھ ہی لیا۔

''کا شاہ جی!.....گھنٹہ بھی خرید لایو؟''

''ہاں! کل شام کا معلوم نائی، کا وقت پڑا ہے میاں پر گھنٹہ دے دیہن بلا کے۔اَی.....''

''ہاں وقت وقت کی بات ہے۔شاہ جی نا ہی تو ای گھنٹہ.....اے گھوڑے کی دم راستا دیکھ کے چل.....'' یہ کہہ کر اس نے چابک جھاڑا۔

میں.....میاں کا برا وقت.....چوروں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔مجھے معلوم ہوا کہ چابک گھوڑے کے نہیں میری پیٹھ پر پڑا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Sir Sayed Nagar, Civil Lines
Aligarh, U.P. 202002

● ناول کا دوسرا باب
● اقبال حسن خان

راج سنگھ لاہوریا

میں کوٹ پتلون پہن کر اگلی صبح اصغر علی چاچا کے دفتر پہنچ گیا۔ دفتر ایک سنسان سڑک پر تھا۔ دفتر کیا تھا تین چار لمبی لمبی بارکیں تھیں جن میں دو رویہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہوا تو چند لمحوں تک مجھے کچھ دکھائی ہی نہیں دیا کیونکہ میں روشنی سے نیم تاریکی میں داخل ہوا تھا۔ اصغر علی، آفس سپرینٹینڈنٹ کا دفتر تیسرے کمرے میں تھا اور وہ اس وقت دفتر میں موجود نہیں تھے۔ اُن کی میز سے ذرا ہٹ کر ایک میز اور تھی جس پر عینک ناک کی پھننگ پر رکھے جو آدمی تندہی سے ایک فائل میں کچھ لکھ رہا تھا، اُس کا نام دین دیال تھا جسے اصغر علی جب بے تکلفی سے،، دینا،، کہہ کر بلاتے تو اُس کے مذہب کی شناخت بہت مشکل ہو جایا کرتی تھی۔

دین دیال کلرک تھا۔ انتہائی خوش اخلاق تھا اور اس امر سے واقف بھی کہ میں اصغر علی کی سفارش پر اس دفتر میں بھرتی ہونے آیا تھا۔ اُس نے تعارف کے بعد مجھ سے مسکرا کر کہا۔

’’سالا آج شاید بیوی سے لڑ کے آیا ہے۔ صبح سے دفتر کے ہر افسر کی حاضری اپنے کمرے میں لگا کے بے عزتی کر رہا ہے۔ ابھی آ جاتے ہیں‘‘۔

یہ مجھ پر کچھ دیر کے بعد کھلا کہ وہ اُس انگریز چیف انجنیئر کی بات کر رہا تھا جو اس دفتر کا سرخیل تھا اور جس کے پاس مجھے انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ میں بیٹھا سوچتا رہا کہ اس وقت اپنی باری کے مطابق اصغر علی چاچا کی بے عزتی ہو رہی ہوگی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد اصغر علی چاچا آئے تو اُن کے سرخ اور بالوں سے بے نیاز سر پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ بہر حال وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور آتے ہی چپراسی سے میرے لئے چائے لانے کو کہا اور بیٹھتے ہوئے بولے۔

’’بہت بڑا کنجر ہے۔ گھبرانا مت۔ سالے رات رات بھر شراب پی کے گاتے ناچتے ہیں۔ نیند پوری نہیں ہوتی تو دفتر میں آ کے غصہ ہم پہ نکالتے ہیں۔ کیوں دینے؟‘‘

دین دیال نے اثبات میں سر ہلایا۔ چائے پی کر جب میں انٹرویو کے لئے تیار ہوا تو اصغر علی نے

کچھ اور انکشافات بھی کیے۔

’’تین سال کے لئے آتے ہیں یہ سب۔ اس کے تین سال پورے ہونے والے ہیں۔ اس کے بعد جو آ رہا ہے یوں سمجھو اپنی ماں کا خصم ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی بھگت چکا ہوں سالے کو۔ یہ پھر اچھا آدمی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو انسان ہی نہیں سمجھتا تھا۔ مگر خیر حرامیوں کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ کیوں دینے؟‘‘

اصغر علی اپنی ہر بات کی صداقت کی گواہی دین دیال سے لیا کرتے تھے اور وہ ہونٹ بھینچ کر اثبات میں اس شدت سے سر ہلاتا تھا کہ اصغر علی کی بات خود بخود پتھر پہ لکیر ہو جایا کرتی تھی۔ پھر اُنہوں نے چند ہدایات اور بھی دیں۔

’’پہلے دروازے پر ہلکی سی دستک دینا۔ وہ کم ان کہے تو سیدھے ہاتھ سے چک ہٹا کر اندر جانا۔ وہ چشمہ اُتار کے تمہیں دیکھے گا۔ جاتے ہی گڈ مارننگ کہنا اور جب تک وہ نہ کہے کھڑے رہنا۔ ویسے بیٹھنے کو کہے گا۔ جب بیٹھ جاؤ تو موسم کی ذرا سی برائی کرنا۔ ان سالوں کو ہندوستان کا کوئی بھی موسم اچھا نہیں لگتا۔ خوش ہو جائے گا۔ بس پھر جو پوچھے اس کا جواب مختصر دینا۔ اب جاؤ۔ اللہ کے حوالے۔‘‘

جب میں اجازت ملنے پر کمرے میں داخل ہوا تو میں نے چیف انجنیئر کا جو سراپا اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا وہ میرے اُوپر ہی گر گیا۔ بڑی سی گندی دکھائی دینے والی میز کے پار ایک پستہ قد، منحنی سا انگریز بیٹھا تھا، جس کے چہرے پر نمایاں چیز اُس کی آنکھیں تھیں۔ اُس نے کمرے میں داخل ہونے کے ساتھ ہی میری ساری انگریزی دانی خاک میں ملا دی اور ہنس کر اُردو میں بولا۔

’’اوہ تو تم اصغر علی کے وہ سفارشی ٹٹو ہو جس کے لئے وہ دو سال سے میرے کان کھا رہا تھا؟ لیکن مجھے نہیں لگتا تم اس نوکری کے لیے مناسب اُمیدوار ہو لیکن چونکہ تم اب آ ہی گئے ہو تو تم سے دو چار باتیں کرنا ضروری ہو گیا ہے۔‘‘

یہ بات سن کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ انٹرویو محض خانہ پُری کے لیے کیا جا رہا تھا۔ اپنی بے عزتی کے احساس سے میرا رنگ اُس وقت یقیناً سرخ ہو گیا ہوگا تبھی تو وہ ہنسا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے سامنے پڑی دو کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

’’میں تین سال کا یہاں آیا تھا۔ میرا سوتیلا باپ راولپنڈی میں پولیس کپتان تھا تو میں تمہاری زبان تم سے اچھی بول سکتا ہوں۔‘‘

میں نے بیٹھنے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

’’میرا خیال ہے کہ مجھے یہ نوکری نہیں ملے گی اس لیے میں یہ انٹرویو دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں

اجازت چاہوں گا۔''

میں نے محسوس کیا انگریز کا منہ ایک بار حیرت سے کھلا اور پھر بند ہوا۔ ساتھ ہی وہ مسکرایا اور بولا۔

''بیٹھ جاؤ۔ یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے۔ تمہیں نہیں۔''

میں بیٹھ گیا۔ اُس وقت میرا جی بے تحاشہ اپنا پسینہ پونچھنے کو چاہ رہا تھا مگر اُس نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور اس مرتبہ انگریزی میں بولا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، ہم یہ جنگ جیت جائیں گے؟''

وہ جنگ عظیم کی بات کر رہا تھا جو اُن دنوں جاری تھی۔ میں سمجھ ہی نہ سکا کہ ایک کلرک کے لیے کیے جانے والے انٹرویو میں ایسا سوال کیوں پوچھا گیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں جی جان سے چاہتا تھا کہ انگریزوں کو اس جنگ میں شکست ہو جائے اور ہندوستان کسی بھی طرح آزاد ہو جائے۔ مجھے اس آدمی کا طرز تخاطب پسند نہیں آیا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب چونکہ مجھے یہاں نوکری کرنا ہی نہیں تھی تو پھر کھل کر ہی بات کیوں نہ کی جائے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

''جنگ کے بارے میں ہم متضاد خبریں سنتے رہتے ہیں۔ بی بی سی سے ہمیشہ سنا ہے کہ جرمنی کو جلد شکست ہو جائے گی لیکن کوئی بھی ہندوستانی بی بی سی پر اعتبار نہیں کرتا۔'' میں نے اُس کے چہرے پر ردعمل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے چشمہ لگایا اور پھر اُتار کر بولا۔

''میں نے تمہارا تبصرہ نہیں مانگا۔ میں نے سوال کیا تھا۔'' مجھے لگا جیسے وہ میری بات پر غصے میں آ گیا تھا۔ میں نے اُسے مزید جلانے کو کہا۔

''میں اس پر تبصرہ تو نہیں کر سکتا البتہ اپنی خواہش کا اظہار ضرور کر سکتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ انگریز یہ جنگ ہار جائیں۔'' میرا خیال تھا کہ وہ میری بات سن کر اُچھل پڑے گا۔ سامنے پڑا پیپر ویٹ اُٹھا کر مجھے دھمکائے گا اور شاید مجھے فوراً ہی دفعان ہونے کو بھی کہے گا لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کیا۔ اس مرتبہ وہ مسکرایا تو انگریزی محاورے کے مطابق اُس کی مسکراہٹ دونوں کانوں کی لوؤں تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ قدرے آگے ہو کر بیٹھا اور بولا۔

''یہ تمہاری خواہش ہے تو دعا بھی ضرور ہو گی..... ہے نا؟ میں بھی چاہتا ہوں کہ انگریز یہ جنگ ہار جائیں۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ ہندوستان چھوڑ دیں۔ ہندوستان ہی نہیں اپنے تمام مقبوضہ علاقے خالی کر دیں۔ آج کی دنیا میں کسی کو کسی ملک کے عوام کو غلام بنانے کا کوئی حق نہیں۔ ینگ مین! میں نے تمہیں اسی وقت جونیئر سٹور کیپر کی آسامی پر فائز کر دیا ہے۔ تم سب انجینئر مسٹر رابرٹ کو رپورٹ کرو گے مگر اُس

کے سامنے یوں سچ نہ بولنا جیسے میرے سامنے بولا ہے۔ وہ باکسر بھی رہا ہے اور ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس کی ماں نے اُس کے باپ سے کبھی شادی بھی نہیں کی تھی۔''

اُس مسٹر رابرٹ کو جسے مجھے رپورٹ کرنا تھی، حرامی قرار دے کر وہ اپنا پائپ بھرنے لگا۔ میں کھڑا ہوا تو اُس نے کہا۔

''ایک بات اور۔ میں جانتا ہوں تم ہندوستانی اپنا شہر چھوڑتے ہوئے بہت گھبراتے ہو لیکن افسوس تمہاری نوکری اس شہر میں نہیں ہے۔ تمہیں راولپنڈی جانا ہو گا۔ کم از کم چھے ماہ کے لئے تو ضرور ہی۔ ناؤ گٹ لوسٹ۔'' میں نے اصغر علی چاچا کو نوکری مل جانے کی خوشخبری دی تو اُنہوں نے مجھ پر سب کھولنے کی کوشش کی۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تمہیں رابرٹ کے ساتھ کام کرنا ہے۔ اچھا آدمی ہے۔ اُس کی بیوی بڑی پڑھی لکھی عورت ہے۔ سنا ہے اخباروں میں لکھتی ہے۔ وہاں لندن میں بھی لکھتی تھی۔ اُس بندے کو کیا کہتے ہیں جو اِدھر اُدھر کی خبریں اخباروں میں نمک مرچ لگا کر لکھتا ہے؟''

میں نے بتایا کہ اُسے صحافی کہتے ہیں۔

وہ ہنسے اور مٹھی میں دم پخت کیے سگریٹ کا ایک براہ راست کش لے کر بولے۔

''اپنی ماں کی سری کھائیں، کہتے ہوں گے کچھ بھی۔ رابرٹ کی پہلی بیوی کو مندرہ کے ڈاک بنگلے میں سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد تین چار سال دوسری میموں پر گزارہ کرتا رہا۔ یہ شادی ابھی کوئی سال پہلے ہوئی ہے۔ پتہ نہیں ہوئی بھی ہے کہ نہیں پر وہ دونوں ایک ہی بنگلے میں رہتے ہیں۔ مگر خیر دفع کرو۔ تم نے نوکری کرنی ہے کوئی نکاح تو نہیں کرنا۔ اچھا تو رابرٹ کو پورٹ کرنی ہے؟ یار میں اُس دلے کا شکریہ ادا کر آؤں۔ کیوں دینے؟''

دین دیال نے پھر ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا اور اصغر علی چاچا سگریٹ بجھا کر فوراً ہی کمرے سے نکل گئے۔

ابا جی اُسی شام چاچا اصغر علی کے گھر مٹھائی وغیرہ لے گئے۔ لیکن جیسے ہی علم ہوا کہ میری نوکری راولپنڈی میں ہوئی تھی، گھر میں دو پارٹیاں بن گئیں یعنی اماں اور ابا۔ ابا جی کا کہنا تھا کہ مرد کو گھر سے دُور رہنے سے تجربہ حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ میں اپنی تعلیم کے دوران چار سال گھر سے باہر گزار کر آیا ہوں تو میرے لئے یہ کچھ بھی مشکل نہ ہو گا۔ اماں نے یہ دلیل سن کر کہا۔

''وہاں کالج والے کھانا پینا سب دیتے تھے اور اس کے الگ سے پیسے جاتے تھے۔ وہاں یہ

بیچارہ چکی چولہا کیسے کرے گا؟''

ابا جی کے آئیڈیل میرے دادا تھے جنہوں نے افریقہ سے لے کر ہندوستان تک ایک طویل مدت، یعنی کوئی چالیس برس انگریزوں کے گھروں اور نیم فوجی میسوں میں بٹلر گیری کی تھی اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ دادا کا انتقال میرے بہت بچپن میں ہو گیا تھا تو میں اُن سے وہ فیض حاصل نہ کر سکا تھا جو ابا جی نے حاصل کیا تھا۔ اپنے والد سے انگریزوں کے بارے میں سن سن کر ابا جی انگریزوں کی حرکات وسکنات وغیرہ سے واقف ہو کر انگریزیات کی چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا بن گئے تھے۔ وہ اسے میری عین خوش نصیبی جان رہے تھے کہ میں کسی انگریز کے سایہ عاطفت میں اپنی نوکری شروع کر رہا تھا۔ اُنہیں اماں جی کی بات ذرا پسند نہ آئی اور اُنہوں نے کہا۔

''ایویں ٹرٹر نہ کیا کر ہر وقت۔ شکر نہیں کرتی کہ انگریزوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا ہے اسے؟ ابا جی کہتے تھے کہ دنیا میں ایک ہی قوم اللہ نے سب سے اعلیٰ بنائی ہے اور وہ انگریز ہیں۔ باقی تو ٹوٹل ہی پورا ہوا ہے''۔

اماں تنک کر بولیں۔

''بڑی اعلیٰ قوم ہے۔ کاغذ سے پونچھنے والی۔'' ابا جی کو یہ بات سخت ناپسند ہوئی اور اُنہوں نے حقے کے دو کش اس قوت سے لگائے کہ چلم میں شعلہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''وہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں کہتا ہوں اللہ راضی ہے انگریزوں سے۔ راضی نہ ہوتا تو اتنی بڑی بادشاہی دیتا اُنہیں؟''

وہ غالباً انگریزوں کے زیر تسلط علاقوں پر سورج کبھی نہ غروب ہونے والی بات بھی کہنا چاہتے تھے لیکن جانتے تھے کہ اماں اس پر کبھی اعتبار نہیں کریں گی کیونکہ اماں کے حسابوں اُن کے شہر میں سورج ڈوب گیا تو ہر جگہ ڈوب گیا۔ ابا جی نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا اور فوراً ہی اپنا موڈ تبدیل کر کے مجھ سے کہا۔

''کسی قسم کی فکر مت کرنا۔ پنڈی میں تیرا چاچا محمد حسین رہتا ہے۔ اُس سے ملنا اور جو بھی مشکل ہو وہ بتانا۔ وہ سب ٹھیک کر لے گا۔''

میں محمد حسین چاچا کو جانتا تھا بلکہ کتنی ہی مرتبہ مل بھی چکا تھا۔ وہ پنڈی کے اندرون شہر میں رہتے تھے اور ان کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

سب انجینیر رابرٹ کا دفتر چک لالہ کے نواح میں ایک پرانی سی بارک میں تھا جسے ڈھونڈنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میں اس سے پہلے کبھی پنڈی نہیں گیا تھا لیکن اس چھوٹے اور کم آبادی والے شہر نے مجھے فوراً ہی اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ رابرٹ، اس کے باوجود کہ چیف انجینیر نے اُسے حرامی قرار دیا تھا

مجھ سے اخلاق سے ملا۔ وہ اتنی ہی اُردو بول سکتا تھا جتنی اُس دور کا کوئی بھی انگریز بولتا تھا اور ہے کو ہائے کہتا تو مجھے بڑا اچھا لگتا۔ اُس نے میرا تقرر نامہ دیکھا اور مجھے بیٹھنے کو کہہ کر چند لمحوں کے لئے ایک الماری کے پیچھے چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو ہونٹ خشک کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے آنکھ ماری اور بولا۔

''ایک حرامزادی مجھے ایک حد سے زیادہ نہیں پینے دیتی تو دفتر میں کچھ انتظام کر رکھا ہے۔ تم تو شراب نہیں پیتے ہو گے؟ یا پیتے ہو؟ نو نو نو مجھے مذہب کے علاوہ اور کوئی وجہ بتاؤ۔'' اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسا اور بولا۔

''تم جوان آدمی ہو۔ زندگی کے راستے تمہارے سامنے کھلے پڑے ہیں، تم نے اپنے لئے یہ حرامیوں والا محکمہ کیوں چُنا؟''

اُسے پتہ نہیں تھا کہ میں نے یہ محکمہ خود نہیں چُنا تھا بلکہ مجھے افسر دیکھنے والے باپ کی خواہش اسی محکمے میں میری بھرتی سے پوری ہو سکتی تھی کیونکہ ہندوستان میں نوکری کی سب سے مضبوط سیڑھی یعنی سفارش اسی جگہ دستیاب تھی۔ پھر رابرٹ سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔

''ہم نے بڑی کوشش کی لیکن پی ڈبلو ڈی اور پولیس سے رشوت ختم نہیں کر سکے۔ ہمارا ابھی اتنا قصور نہیں۔ تمہارے ڈیم فول مسلمان بادشاہوں کے دَور سے یہ نظام چلا آ رہا ہے۔ بہر حال تم سنٹرل سٹورز میں کام کرو گے۔ وہاں تمہارا انچارج لہنا سنگھ ہے۔ باسٹرڈ ہے اور میں اُسے پسند نہیں کرتا لیکن کمبخت ڈھونڈ ڈھونڈ کر عمدہ سے عمدہ شراب میرے لیے لاتا ہے اس لیے برداشت کر رہا ہوں۔ اچھا آدمی ہے۔ بڑھاپے میں دوسری شادی کی ہے کیونکہ پہلی بیوی مر گئی تھی۔ تین سال بعد ریٹائر ہو کر یہاں سے چلا جائے گا تو اُس کی بیوی کیا کرے گی؟'' اُس کی گفتگو کا آخری حصہ میری سمجھ میں تب آیا جب اُس نے مجھے آنکھ ماری۔ پھر وہ ہنسا اور بولا۔

''ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ میں نے فون کر دیا ہے اور کسی قسم کی بھی مشکل ہو مجھے مت بتانا کیونکہ لہنا سنگھ کے ساتھ تم ہر منٹ کے بعد ایک مشکل میں پھنسو گے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور غالباً ایک بار پھر الماری کے عقب میں جانے کو اُٹھا لیکن کچھ سوچ کر رک گیا اور بولا۔

''تم نے یہاں اپنے رہنے کا کوئی بندوبست کیا ہے؟''

میں نے کوئی بندوبست نہیں کیا تھا۔ سوچا تھا کہ محمد حسین عرف حسینا چاچا سے کہہ کر کوئی بندوبست کروں گا۔ فی الحال مجھے اُنہی کے گھر رکنا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو رابرٹ بولا۔

''تم چاہو تو میرے بنگلے کے سرونٹ کوارٹرز میں رہ سکتے ہو۔ وہاں فی الحال مالی اور بیرہ رہتا ہے۔ خان ساماں رات کو اپنے گھر چلا جاتا ہے۔'' مجھے سرونٹ کوارٹرز میں رہنے میں کچھ تامل تھا جو میرے چہرے سے ظاہر ہوا تو رابرٹ بولا۔

''دیکھو شہر میں رہو گے تو دس پندرہ روپے مہینہ کرایہ دو گے۔ ویسے تمہاری مرضی۔''

میں نے سرونٹ کوارٹرز میں رہنا منظور کر لیا کیونکہ اُس جگہ سے دفتر کا پیدل کا فاصلہ دس یا زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کا تھا۔

میں دفتر میں داخل ہوا تو مجھے لہنا سنگھ کو پہچاننے میں اس لئے آسانی رہی کہ وہاں موجود چار چھے سکھوں میں وہی سب سے معمر دکھائی دے رہا تھا۔ دفتر میں خاموشی تھی اور اتنے سکھوں کے یکجا ہونے کے باوجود یہ ایک بڑی عجیب سی بات تھی۔ لہنا سنگھ مجھ سے مل کر نہال ہو گیا کیونکہ وہ مشرقی پنجاب کے اُسی شہر کا تھا جس سے میں آیا تھا۔ اُس نے مقامی لہجے میں بات چیت شروع کی اور ہر جملے میں تین چار جگہ گالیوں کا تڑکا لگایا تو مجھے لگا میں پی ڈبلو ڈی کے ایک بڑے افسر کے دفتر میں نہیں، جیرے کے ہوٹل پر بیٹھا تھا۔ وہ بولا۔

''کاکا کوئی فکر مت کرنا۔ اِدھر سب اپنے ہی ہیں۔ تمہیں ملوا دوں گا سب سے۔ اپنا انچارج ہمیشہ گورا صاب ہوتا ہے۔ مجھے بڑا گلہ ہے ان ماں.....انگریزوں سے بلکہ سمجھو تو ایک ہی گلہ ہے۔ اتنے سال ہو گئے مگر انہوں نے ہماری زبان سیکھ کر نہیں دی۔ خیر اب ان کا چل چلاؤ ہے۔ اپنی موجیں ہوں گی۔ اچھا سردار جتیندر سنگھ کو جانتے ہو؟ نِکا نِکا کہتے ہیں سب۔ اس کا گھر.....''

سردار لہنا سنگھ نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور دیر تک اپنے شہر کو یاد کرتا رہا۔

کام کوئی خاص مشکل نہیں تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ بہت بڑا اسٹور تھا اور اسے چلانا ایک خاصا مشکل کام بھی، جسے لہنا سنگھ بخوبی چلا رہا تھا۔ ایک دن اُس نے مجھے بتایا۔

''میں سن اٹھارہ میں اس محکمے میں کلرک بھرتی ہوا تھا۔ اُس وقت یہ محکمہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ یہ جو تمہیں پشاور سے لاہور تک جتنی سڑکیں اور پل نظر آ رہے ہیں، یہ سب ہم نے ہی بنائے ہیں۔ انگریز کی ایک خوبی کی داد دینا۔ یہ ویسے تو بڑی بھینچو قوم ہے پر بہت ہی ایماندار۔ اب دیکھ لو۔ اس وقت بھی جو پل بن رہے ہیں، اُن کی میعاد سو سال رکھی ہے حالانکہ پانچ سات سال بعد ہندوستان پہ آپاں حکومت کر رہے ہوں گے اور یہ واپس چلے جائیں گے۔''

رابرٹ سب انجینئر تھا اور اُس کے ساتھ فقط اُس کی بیوی رہتی تھی۔ پہلی بیوی سے دو بچے تھے جو برطانیہ میں رہتے تھے لیکن رابرٹ کے گھر کا پھیلاؤ دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھیلاؤ سے میری مراد وہ رقبہ ہے جس پر یہ گھر بنا ہوا تھا۔ گزشتہ صدی میں بنائے اس گھر میں ابھی تک گھوڑوں کے اصطبل کے لئے مختص جگہ بھی موجود تھی۔ دس کے قریب سرونٹ کوارٹرز تھے جن میں بیشتر خالی پڑے ہوئے تھے۔ یہ میرے لئے نئی بات ہو تو ہو، اُس زمانے میں ایسا ہی تھا۔ وہ انگریز جو دو کمروں والے گھروں سے اُٹھ کر ہندوستان پر حکومت کرنے آیا

کرتے تھے، یہاں اسی قسم کے شاہانہ گھروں میں رہا کرتے تھے۔ آزادی کے بعد مقامی حکمرانوں نے یہ روش برقرار رکھی چنانچہ آج بھی دیسی صاحب لوگ وسیع و عریض گھروں میں دادِ عیش دیتے ہیں۔ اس کوٹھی کے سرونٹ کوارٹرز میں سے چار کی چھتیں گر چکی تھیں اور بیرے نیاز محمد کے بیان کے مطابق اُن میں سانپ بھی رہتے تھے۔ مالی کا نام مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ وہ پنڈی کے نواح کا رہنے والا ایک سابق فوجی تھا اور اُس وقت بھی خاصا بوڑھا تو اُسے سبھی مالی بابا کہا کرتے تھے۔ وہ اپنا کام کا بہت بڑا ماہر تھا اور ہر موسم میں رابرٹ کے بنگلے کو گلستان بنائے رکھتا تھا۔ بیرہ نیاز محمد کوٹلی کشمیر کا رہنے والا تھا اور اس سے پہلے رابرٹ کے ساتھ سری نگر میں تھا۔ نیاز محمد ایک تیز طرار آدمی تھا اور رابرٹ کی بیوی کیتھرین کو، جیسے رابرٹ پیار سے کیٹی کہا کرتا تھا، اُس نے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ خانساماں جو شریف آدمی تھا اور اسم با مسمیٰ تھا یعنی اُس کا نام بھی شریف ہی تھا، پنڈی شہر کے کسی محلے میں رہتا تھا۔ وہ بہت موٹا آدمی تھا اور سائیکل پر سودا سلف لاتا تو سائیکل چلاتے وقت ایک کارٹون لگتا تھا۔

رابرٹ کی بیوی کیٹی سے میری ملاقات میرے وہاں قیام کو چند ہفتے گزر جانے کے باوجود، ابھی تک، محض اس لئے نہیں ہو سکی تھی کہ وہ اُسی شام شہر سے دلی چلی گئی تھی، جب میں نے کوٹھی کے سرونٹ کوارٹرز میں اپنا ٹین کا ''اٹیچی کیس'' پہنچایا تھا۔ میرے سونے کے لیے چارپائی پہلے دن مالی نے دی تھی اور دوسرے دن بیرہ نیاز محمد مجھ سے پانچ روپے لے کر میرے لئے ایک پرانی چارپائی کہیں سے لے آیا تھا اور یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہ چارپائی وہ اپنے گھر سے لایا تھا اور یہ پہلے اُس کے سسر کے استعمال میں تھی جو میرے وہاں پہنچنے سے چند ماہ پہلے اسی چارپائی پر فوت ہوا تھا۔ بعد میں میں نے سوچا تو پتہ چلا کہ مجھے خواب میں اکثر ایک باریش بڈھا جو چھڑی ہاتھ میں لیے ڈراتا ہے وہ وہی مرحوم ہو سکتا تھا جو مجھ سے پہلے اس چارپائی کا مالک تھا۔ پڑھنے لکھنے کے لئے میز اور تیل سے جلنے والا لیمپ مجھے چاچا محمد حسین عرف حسینا کے گھر سے مل گیا تھا۔ سرونٹ کوارٹرز میں بجلی نہیں تھی۔ یہ سہولت صرف کوٹھی والوں کو میسر تھی۔ نیاز محمد میرے لیے ایک الماری بھی لایا جس میں میرا سامان یعنی کتابیں اور کپڑے بخوبی سما گئے اور یوں میری آبادکاری مکمل ہو گئی۔ کھانے کے لئے میں ایک قریبی ہوٹل والے کو تیس روپے مہینہ دیا کرتا تھا حالانکہ نیاز محمد یہ ذمہ داری لینے کو تیار تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ مجھے رابرٹ کے گھر کا بچا کھچا کھلائے گا تو میں نے انکار کر دیا تھا۔

ابا جی کی لہسن پیاز کی آڑھت اپنے شہر میں چل رہی تھی اور میرا کوئی خاص خرچ نہیں تھا تو مہینے بھر میں میں ساٹھ ستر روپے بچا لیتا تھا جو اُس وقت کے حساب سے اچھی خاصی بچت تھی۔ میں مطمئن تھا۔ زندگی ایک ڈھرے پر چل پڑی تھی۔ لہنا سنگھ میرا بہت خیال رکھتا تھا اور مجھے اُس کے خلاف ابھی تک کوئی شکایت لے کر رابرٹ کے پاس نہیں جانا پڑا تھا۔ لہنا سنگھ کی بیوی ایک شوقین مزاج عورت تھی اور لہنا سنگھ یہ جانتا تھا

چنانچہ اُس نے کبھی مجھے اپنے گھر نہیں بلایا تھا لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے تو ایک دن مجھے لہنا سنگھ کے گھر یوں جانا پڑا وہ اچانک بیمار پڑ گیا تھا اور مجھے کچھ ضروری کاغذات کے لئے اُس کی الماری کی چابی درکار تھی۔

میں نے اُنہی دنوں پانچ روپے مہینے پر ایک سائیکل کرائے پہ لے لی تھی اور مجھے آنے جانے کے لئے ایک آنہ فی سواری والے تانگوں سے نجات ملی ہوئی تھی چنانچہ میں دس منٹ میں ہی لہنا سنگھ کے گھر پہنچ گیا۔ لہنا سنگھ دفتر کے قریب ہی ایک کرائے کے گھر میں رہتا تھا۔ پہلی بیوی سے اُس کے بچے شادی شدہ تھے اور دوسری سے کوئی اولاد تھی نہیں۔ میں اُس کے گھر پہنچا تو اُس کے بوڑھے سکھ ملازم نے مجھے گھر کی بیٹھک میں بٹھایا۔ ابھی نچلے اور متوسط طبقے میں ڈرائنگ روم کا رواج نہیں ہوا تھا اور مہمانوں کے بٹھانے کی جگہ کو بیٹھک ہی کہا جاتا تھا۔ اس بیٹھک کا ایک دروازہ گلی میں اور دوسرا گھر کے اندر کھلتا تھا۔ گلی والے دروازے کا ایک مصرف یہ بھی تھا کہ مہمان اس سے نکل کر گلی کی نالی میں بلا تکلف کمر بند کھول کر پیشاب بھی کر لیا کرتے تھے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر کُلی بھی۔ میں بیٹھک میں بٹھایا گیا۔ مجھے پتہ چلا کہ لہنا سنگھ جنرل ہسپتال دوائی لینے گیا ہوا تھا اور اُسے آنے میں دیر بھی ہو سکتی تھی۔ میرے پاس انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مجھے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی لیکن چونکہ میں اُس گھر میں بالکل اجنبی تھا تو میں نے گھوم کر نہ دیکھا۔ لہنا سنگھ کی بیوی میرے سامنے آئی تو میں احتراماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے لگا اُسے یہ احترام کرنا اچھا لگا تھا کیونکہ یہ خوشی اُس کے چہرے سے پھوٹی تھی۔ وہ مجھے پہلی نظر میں ہی ایک کھلی ڈُلی عورت لگی اور وہ تھی بھی۔

اُس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر اپنے وہ بال سنوارنے لگی جو شاید وہ سنوارتے سنوارتے مجھ سے ملنے چلی آئی تھی۔ وہ لہنا سنگھ سے بھی زیادہ خالص پنجابی بول رہی تھی۔

''منع کیا ہے میں نے دس دفعہ کہ اب بڈھے ہو گئے ہو، چھت پر مت ٹہلا کرو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی اور وہی ہوا۔ حالانکہ آج کل گرمی کا موسم ہے۔'' اُس نے لہنا سنگھ کے بڈھا ہونے تذکرہ یوں کیا جیسے وہ کسی خطرناک بیماری کا حال کہہ رہی ہو جو اُس کے شوہر کو لگ چکی تھی۔ میں نے کہا۔

''نہیں جی۔ ابھی تو سردار صاحب اچھے بھلے ہیں۔ تین آدمیوں کا کام اکیلے کرتے ہیں۔''

اس پر وہ ہنسی اور اُس کے بال سنوارتے ہاتھ لمحہ بھر کو رکے۔ پھر وہ ایک بڑی سی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''کرتے ہوں گے۔ ہمیں کیا پتا؟ ہے نا؟'' مجھے اس بات کا گنجل کھولنے میں چند لمحے لگے۔ رابرٹ نے کہا تھا کہ جب سردار یہاں سے ریٹائر ہو کر جائے گا تو اُس کی بیوی کیا کرے گی؟ یہ بات کہہ کر اُس نے مجھے آنکھ بھی ماری تھی تو اب میرے سامنے بیٹھی عورت جس طرح مجھے دیکھ کر مجھ سے باتیں کر

رہی تھی تو اُس آنکھ مارنے نے اپنے سارے در میرے سامنے وا کر دیئے تھے اور میں اُن کے پار ایک بوڑھے آدمی کی ادھیڑ عمر بیوی کا وہ ہیجانی رقص دیکھ سکتا تھا جس کے ہر بھاؤ میں اُس کی ہل مِن مزید کی خواہش چیختی چنگھاڑتی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کچھ اور ہی بات کی۔

''میں تو جی اجنبی ہوں اس شہر میں۔ نوکری کرنے آیا ہوں۔ سردار صاحب میرے ساتھ بہت اچھے ہیں۔'' بال سنوارتا ہاتھ پھر لمحہ بھر کو رُکا اور آنکھوں کی چمک بڑھی۔

''تم خود اتنے اچھے ہو تو لوگ تمہارے ساتھ اچھے کیوں نہ ہوں گے؟ ہمارے گھر چائے نہیں بنتی، لسی بنتی ہے۔ پیو گے؟''

میں ناشتہ کر کے آیا تھا اور میرا جی کسی بھی چیز کو نہیں چاہ رہا تھا تو میں نے نرمی سے منع کر دیا۔ لہنا سنگھ کی بیوی نے گھوم کر پیچھے دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

''بعض لوگ دیکھتے ہی اچھے لگتے ہیں۔ تم مجھے اچھے لگے ہو۔ پتہ نہیں کیوں؟'' میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں سر جھکا کر بیٹھ گیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب اُلجھن بھی ہونے لگی تھی۔ لہنا سنگھ کی بیوی جو ابھی تک مجھ سے فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھی تھی، اپنی جگہ سے اُٹھی اور اُسی کرسی کے عقب میں کھڑی ہو کر، اُس کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر قدرے جھکی اور بولی۔

''اکیلے رہنے میں تمہیں تکلیف تو ہوتی ہو گی۔'' میں نے اقرار کیا کہ ایسا ہی تھا۔ اُس کے چہرے پر شرارت بھرے تاثرات اُبھرے اور وہ بولی۔

''مگر اکیلے رہنے کے اپنے ہی عیش ہیں۔ ہے نا؟'' میں یہ بات نہ سمجھا تو میں نے کہا۔

''عیش؟ نہیں جی۔ بڑی تکلیفیں ہیں۔ وہاں گھر پر تو ہر چیز تیار ملتی تھی۔ یہاں خود جتن کرنا پڑتا ہے۔'' اُس نے اثبات میں یوں سر ہلایا جیسے مجھ سے متفق ہو اور پھر ہنس کر بولی۔

''مطلب کوئی پابندی نہیں۔ نہ کسی قسم کا ڈر خوف۔ ہے نا؟ اگر تمہاری کوئی سہیلی وہاں ملنے چلی آئے تو تمہیں کوئی فکر نہیں ہو گی۔ ایسا ہی ہے نا؟'' تھا تو ایسا ہی لیکن لہنا سنگھ کی بیوی جو مجھ سے پہلی مرتبہ مل رہی تھی، مجھ سے ایسی باتیں کر رہی تھی جو اُسے نہیں کرنی چاہئیں تھیں یا کم از کم اس ملاقات میں تو نہیں کرنی چاہئیں تھیں اس لیے مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ میں نے کہا۔

''جی وہ بات ٹھیک ہے لیکن اتفاق سے میری کوئی سہیلی نہیں ہے'' میں نے یہ بات مذاق کرنے والے لہجے میں کہی تھی لیکن وہ سنجیدگی سے بولی۔

''ہے نہیں تو کیا ہوا۔ تم اتنے جوان اور خوبصورت ہو۔ تمہارے لئے کوئی سہیلی بنانا کونسا مشکل

کام ہے۔ بنالو کسی کو اپنی سہیلی؟''

میرے کان یکدم اتنی شدت سے کھڑے ہوئے کہ مجھے لگا مانو میں نے اُن کی آواز سنی ہو۔ میری گردن کے بال بھی خوف کی لہر نے کھڑے کر دیئے اور وہ مجھے چبھتے محسوس ہوئے۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لہنا سنگھ کی بیوی کرسی کی پشت کے پیچھے سے نکلی اور مجھ سے اتنی قریب کھڑی ہوئی کہ میں سستے سینٹ کی لہسن میں ملی ہوئی مہک محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے اُس گود میں منہ گھسیڑ کر بیٹھنا اچھا نہیں لگا تو میں کھڑا ہو گیا اور نامحسوس انداز سے دو قدم دور ہٹ کر میں نے کہا۔

''نہیں جی۔ میں نے یہ سب کبھی نہیں سوچا'' لہنا سنگھ کی بیوی نے مجھ سے فاصلہ کم کیا، مسکرائی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی۔

''تو مجھے اپنی سہیلی بنالو'' میں نے بادل نخواستہ اُس کا ہاتھ تھاما اور چھوڑ دیا۔ اُس کا ہاتھ پسینے سے تر تھا تو مجھے لگا جیسے میں نے گندی نالی سے نکلی، بھیگی ہوئی چھچھوندر کو مٹھی میں لے کر چھوڑ دیا ہو۔ وہ بولی۔

''میرا نام نہیں پوچھا تم نے؟ میرا نام ہرپریت کور ہے اور.....''

ابھی ہرپریت کور کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ باہر سے لہنا سنگھ کی آواز سنائی دی جو ملازم کو پکار رہا تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھی اور اندر جاتے ہوئے بولی۔

''ہماری کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ سردار صاحب کو میرا کسی سے ملنا اچھا نہیں لگتا۔ پھر کسی دن ضرور آنا۔ اور آنے سے پہلے فون کر لینا۔ ہمارا نمبر تو تمہارے پاس ہوگا ہی۔ اگر نہیں تو آسان ہے بہت۔ چھبیس گیارہ۔ اچھا؟''

وہ باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد لہنا سنگھ گلی میں کھلنے والے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر مجھے دیکھ کر خوشی کے نہیں، ناگواری کے تاثرات اُبھرے اور وہ بولا۔

''خیر تو ہے کاکا؟'' میں اُسے اپنی آمد کی وجہ بتلائی۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں بیٹھا اور بولا۔

''بخار ہے ابھی تک۔ کل بھی چھٹی کروں گا۔ بتا دینا اُس حرامی کو۔ بلکہ درخواست لکھ دیتا ہوں، ساتھ ہی لے جاؤ۔''

اُس نے ملازم سے چابیاں منگوا کر میرے حوالے کیں اور مجھ سے رسماً بھی کچھ کھانے پینے کو نہ پوچھا۔ جب میں چلنے لگا تو اُس کے اندر سویا ہوا شکی مرد بیدار ہوا اور اُس نے کہا۔

''کتنی دیر تمہیں انتظار کرنا پڑا؟'' میں جانتا تھا کہ اسے کیا جواب دینا تھا تو میں نے کہا۔

''بس جی دو تین منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔''

مجھے لگا میرا جواب سن کر لہنا سنگھ مطمئن ہو گیا تھا کیونکہ کسی بھی قسم کی حرمزدگی اتنی قلیل مدت میں سرانجام نہیں دی جا سکتی تھی۔ مجھے بوڑھے سکھ پر بڑا ترس آیا۔

اتنا اندازہ مجھے ہو چکا تھا کہ لہنا سنگھ کی بیوی کے بارے میں رابرٹ نے گول مول لفظوں میں جو کچھ کہا تھا وہ کسی حد تک درست تھا اور اس کی بیوی کی شہرت دفتر تک پھیلی ہوئی تھی۔

یہ اُسی دن کی بات ہے جس دن میں لہنا سنگھ کے گھر گیا تھا۔ رابرٹ مہینے میں دو چار مرتبہ تو شہر سے باہر ضرور ہی جایا کرتا تھا، اُس شام بھی وہ گھر پر نہیں تھا۔ میں گرمیوں کی اُس شام بہت تھکا ہوا تھا تو دفتر سے واپس آ کر سو گیا۔ وہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ تھی جس سے میری آنکھ کھلی۔ میں کمرے سے باہر برامدے میں آیا تو بجلی زور سے چمکی، بادل پھر گڑگڑایا اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ میں پنڈی کی پہلی برسات دیکھ رہا تھا۔ بادل اتنے گھنگھور تھے کہ روشنی انتہائی کم ہو گئی تھی۔ ہوا کی شدت سے پانی برامدے تک آ رہا تھا لیکن میرے ہفتوں کے جھلسے ہوئے بدن کو وہ شراٹے اچھے لگ رہے تھے۔ میرے کوارٹر اور رابرٹ کے بنگلے کے درمیان ایک وسیع میدان حائل تھا اور اس وسیع میدان میں بارش نے ایک ایسا پردہ تان رکھا تھا جو تیز ہوا میں لہریں لے رہا تھا۔ انہی لہروں میں مجھے کیٹی کی پہلی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ برامدے میں تنہا کھڑی تھی اور اُس نے اپنا چہرہ یوں اُوپر اُٹھا رکھا تھا جیسے خنک بوندوں کی پھوار کو اُس میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔ اتنے فاصلے سے میں اُس کے نقوش کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا لیکن اُسے پہلی نظر دیکھنے والا بخوبی بتا سکتا تھا کہ وہ ایک طویل القامت عورت تھی۔ بجلی چمکی اور یہ چمک دو تین لمحوں تک برقرار رہی، ایسی چمک کے بعد ہمیشہ ایک بڑا دھماکہ سنائی دیتا ہے، اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ میرا خیال تھا وہ ڈر کر عمارت کے اندر چلی جائے گی لیکن وہ وہیں کھڑی رہی۔ مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ وہ یقیناً ایک دلیر عورت تھی۔

میں برآمدے سے قدرے ہٹ کر، اپنے کمرے کی دہلیز پر کرسی اُٹھا لایا کیونکہ اب برساتی پانی کے شراٹوں سے میرے مکمل طور پر بھیگنے کا خدشہ تھا۔ پھر میں نے سگریٹ سلگایا اور مزے سے کش لگانے لگا۔ مجھ اُن لمحوں میں وہاں بیٹھنا اور سگریٹ پینا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کیٹی اپنے برآمدے سے اُتری اور گھاس کے وسیع میدان میں یوں کھڑی ہو گئی جیسے وہ انسان نہ ہو، ملکہ کا وہ بت ہو جو ہندوستان کے شہروں میں جا بجا لگے ہوئے تھے۔ وہ آدھا میدان عبور کر چکی تھی۔ پھر بت میں جنبش ہوئی، وہ بارش سے کسی چھوٹی بچی کی طرح لطف اندوز ہو رہی تھی، میرے خیال میں وہ کسی قسم کا رقص تھا۔ میں اب اُسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ ننگے پیر تھی اور اُس نے لباس کے نام پر ایک لامبا گاؤن پہن رکھا تھا۔ اُس نے گاؤن گھٹنوں تک اُٹھا رکھا تھا اور وہ کسی بچے کی طرح بارش میں ناچ رہی تھی، ہنس رہی تھی اور اُس کے منہ

سے مسرت بھری آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ میں اس انگریز عورت کے بارے میں اُس وقت تک یہی اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ رابرٹ کی بیوی کیٹی تھی کیونکہ رابرٹ نے اور نہ ہی مالی یا نیاز محمد نے اُس گھر میں کسی اور عورت کی موجودگی کا تذکرہ کیا تھا۔ میں حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ یوں رکی جیسے اُسے کسی اور کی بھی وہاں موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ اُس نے مجھے یقیناً دیکھ لیا تھا۔ وہ لمحہ بھر اپنی جگہ صامت کھڑی رہی پھر میری جانب چلنے لگی۔ وہ سرونٹ کوارٹرز میں رہنے والوں کو یقیناً اچھی طرح پہچانتی تھی۔ جب وہ برآمدے سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر رہ گئی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ برآمدے میں آئی۔ اُس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا اور سنجیدہ لیکن تلخی کے کسی اظہار کے بنا مجھ سے بات کی۔

''کون ہو تم؟ مہمان ہو کسی کے؟'' میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''ٹھنڈک کی تلاش میں اکثر سانپ ایسے موسم میں اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔ آپ کو محتاط رہنا چاہئے۔'' وہ مسکرائی اور چپکے ہوئے بالوں کو چہرے سے ہٹا کر بولی۔

''شکریہ لیکن تم کون ہو؟''

میں نے اُسے اپنے بارے میں مختصراً بتایا۔ وہ کھڑی اثبات میں سر ہلاتی رہی اور اس دوران اُس نے اپنے گاؤن سے پانی جھاڑا اور اُسے ٹخنوں تک چھوڑ دیا۔ وہ کسی سوچ میں تھی۔ ہمارے درمیان خاموشی کا یہ وقفہ مجھے عجیب لگ رہا تھا بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس وقفے کی وجہ سے بے چینی کا شکار تھا تو غلط نہ ہوگا۔ پھر اُس نے اپنی بڑی اور گہری نیلی آنکھیں مجھ پر گاڑ کر کہا۔

''یہ کوارٹرز رہنے کے لئے محفوظ نہیں۔ ہر تیز بارش کے بعد ان میں سے کسی نہ کسی کی چھت گر جاتی ہے۔'' میں جانتا تھا لیکن اُسے علم نہیں تھا کہ وہ کوارٹر جس میں مَیں نے بستر لگا رکھا تھا، قدرے محفوظ تھا۔ میں نے کہا۔

''جی درست کہتی ہیں آپ لیکن یہ قدرے بہتر ہے۔'' وہ مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

''ہو سکتا ہے۔'' خاموشی کا ایک اور وقفہ ہمارے بیچ کھڑا ہو گیا۔ وہ جانے کے ارادے سے برامدے کی ایک سیڑھی اُتری۔ ابھی تک بارش کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ پھر گھومی اور بولی۔

''تم اچھی انگریزی بولتے ہو۔ ہے نا؟''

میں اپنی انگریزی کی اس استعداد کی خود تعریف نہیں کرسکتا تھا تو میں نے خواہ مخواہ جھوٹ بولا۔

''شکریہ۔ مجھے انگریزی ادب سے ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے۔''

نجانے اس جھوٹ میں کون سا جادو تھا کہ وہ پھر سیڑھی چڑھ کر برآمدے میں آ گئی اور انتہائی دلچسپی سے بولی۔

''اوہ رئیلی؟ کس کو تم بہت زیادہ پسند کرتے ہو؟'' ابھی میں بی اے میں اپنے نصاب میں شامل انگریزی مصنفین کے نام ہی سوچ رہا تھا کہ اُس نے کہا۔

''تھامس ہارڈی؟'' میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور ہنس کر کہا۔

''اُف۔ وہ تو میرا پسندیدہ ترین ہے۔'' چونکہ ہارڈی کی کتاب فارفرام دی میڈننگ کراؤڈ میرے سلیبس میں شامل تھی اور میں اُس پر بلاتکان گفتگو بھی کرسکتا تھا چنانچہ میں نے اُس کا تذکرہ شروع کر دیا۔ ہمارے انگریزی کے پروفیسر علی حسین صاحب نے ہمیں اس کتاب کے وہ وہ گوشے دکھائے تھے جو شاید ہارڈی نے بھی نہ سوچے ہوں گے۔ میں رواں ہو گیا اور تین چار منٹ بولتا رہا۔ اگر وہ مجھے نہ ٹوکتی تو میں شاید ساری شام اس کتاب پر بات کرسکتا تھا۔ وہ ہنسی۔ اُس کا موڈ انتہائی خوش گوار ہو گیا تھا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے روکا اور بولی۔

''دلچسپ۔ بہت ہی دلچسپ۔ رابرٹ نے ایک غلط آدمی کو سٹور میں بٹھا رکھا ہے۔ تمہیں تو کسی سکول میں انگریزی کا اُستاد ہونا چاہئے۔'' میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ بارش کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ اُس نے ایک ہاتھ باہر نکال کر اس کا اندازہ کیا اور لمحہ بھر سوچ کر بولی۔

''تم شام کی چائے میرے ساتھ پینا پسند کرو گے؟''

یقیناً ایسی مہربان اور با اخلاق عورت کے ساتھ چائے پی کر مجھے خوشی ہوتی لیکن میں دیسی ہندوستانی تھا جسے شوہر کی غیر موجودگی میں کسی کی بیوی کے ساتھ چائے پینا قابل اعتراض بلکہ معیوب سمجھا یا گیا تھا تو میں نے کہا۔

''جی ضرور لیکن رابرٹ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔'' اُس نے لمحہ بھر میری بات کو سوچا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسی۔

''ہمارے اکٹھے چائے پینے سے رابرٹ کا کیا واسطہ ہے؟ اوہ۔ تم قدیم ہندوستانیوں کی طرح سوچتے ہو؟ مجھے حیرت ہے انگریزی ادب نے ابھی تک تمہاری سوچ نہیں بدلی؟'' میں بس شرمندہ شرمندہ کھڑا رہا۔ پھر اُس نے اپنے سنہری بالوں کو ایک جھٹکے سے گردن کی پشت پر ڈالا اور میدان کے پار اپنے گھر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''پندرہ منٹ بعد ہم برآمدے میں چائے پی رہے ہیں۔ او کے؟'' اُس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا اور برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کر یوں بھاگتی ہوئی چلی جیسے بارش سے بچنا چاہ رہی ہو۔ یہ رویہ مجھے حیران کر گیا کہ جو عورت اسی بارش میں چند منٹ پہلے ناچ رہی تھی، اب وہ اس سے بچنا چاہ رہی تھی!

بارش کی شدت میں بہت کمی آ چکی تھی پھر بھی بھگونے کے لئے یہ پھوار کافی تھی تو میں نے تیز قدموں سے چلتے ہوئے میدان پار کیا اور برآمدے میں پہنچ گیا۔ میں شاید دو چار منٹ پہلے پہنچا تھا کیونکہ

برآمدے میں ایک میز پر چائے کے لوازمات تو دکھائی دے رہے تھے لیکن کیٹی کا پتہ نہ تھا۔اسی دوران بیرہ نیاز محمد وہاں کچھ رکھنے آیا اور حیرت سے بولا۔

''تم اِدھر کیا کر رہے ہو بابو؟ میم صاحب کے مہمان آنے والے ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''تو کیا ہوا، ایک مہمان اور سہی۔'' نیاز محمد پریشان ہو گیا اور قدرے جھجک کر بولا۔

''بڑے ٹیڑھے دماغ کی عورت ہے۔تمہیں پتہ نہیں اس کا پہلا شوہر ہندوستانی تھا۔مجھے کبھی کبھی لگتا ہے اسے دیسی لوگ اچھے نہیں لگتے اور.....''

میرے لیے یہ ایک انکشاف تھا لیکن اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس انکشاف پر مزید تبصرہ کرتا کیوں کہ اسی لمحے کیٹی برآمدے میں آئی۔ نیاز محمد گنگ کھڑا تھا اور وہ مزید گنگ ہو گیا جب اُس نے کیٹی کو مجھ سے ہنس کر بات کرتے دیکھا۔وہ مدتوں سے انگریزوں کا ملازم تھا تو اتنی انگریزی تو سمجھ ہی سکتا تھا جتنی کیٹی نے مجھ سے بولی تھی۔ یہ سمجھنے کے بعد میں ہی وہ مہمان تھا جس کے لیے چائے کی یہ تقریب سجائی گئی تھی، نیاز محمد میکانکی انداز میں مسکرانے لگا۔کیٹی نے نیاز محمد سے کہا کہ وہ چلا جائے اور یہ کہ چائے وہ خود ہی بنائے گی۔

کیٹی نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور بال بھی سنوار لیے تھے۔اُس نے انگریز عورتوں والا لباس پہنا تھا اور شاید ہلکی سی کوئی خوشبو بھی لگائی تھی۔ میں نے اُسے ڈھنگ کے لباس میں پہلی مرتبہ غور سے دیکھا۔میرے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ مختلف زاویوں اور انداز سے کبھی کبھی بہت ہی حسین دکھائی دینے لگتی تھی۔ ہنستے وقت یا سر کو خم کر کے کچھ سوچتے ہوئے یا پھر کسی بات کو غور سے سنتے ہوئے۔ جب ہم چائے پی رہے تھے تو اُس نے مسکرا کر کہا۔

''میں نے تم سے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔میرا نام کیتھرائن ہے۔تم مجھے کیٹی کہہ سکتے ہو۔سبھی یہی کہتے ہیں اور تمہارا نام حامد ہے نا؟ حامد.....یس، تم نے یہی بتایا تھا۔'' وہ حامد کو حمید کہہ رہ تھی لیکن مجھے یہ اچھا لگا۔ بارش اب تھم گئی تھی لیکن ہوا انتہائی خوشگوار ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی تیز جھونکا کیٹی کے سنہری بال اُس کے چہرے پر بکھرا دیتا جنہیں وہ ایک انداز سے درست کرتی۔ چائے کے دوران ہی اُس نے سگریٹ سلگایا اور دو تین آسودہ کش لے کر کرسی کی پشت سے ٹک کر خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے یہ ملک بہت پسند ہے۔اگر اتنا پسند نہ ہوتا تو میں اُس باسٹرڈ سے طلاق کے فوراً بعد اسے چھوڑ دیتی۔میرے باپ کی بہت بڑی جائیداد ہے وہاں۔ میرا ماموں دیکھ بھال کرتا ہے۔ مجھے ہندوستان کی محبت یہاں روکے ہوئے ہے۔'' اُس نے ایک اور کش لگایا، مسکرائی اور بولی۔

''یہ سرزمین مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ یہاں کے لوگ بہت سادہ اور کسی حد تک احمق ہیں۔

مذہب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے لیکن تعجب انگیز بات یہ ہے کہ وہ مذہب پر تو یقین رکھتے ہیں، اُس پر عمل اُس شدت سے نہیں کرتے۔'' وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی اور سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ مجھے اُس کی اس بات سے اتفاق تھا۔ میں نے کہا۔

''سادہ اور احمق ہونے میں فرق ہے۔ ہے یا نہیں؟ سادہ شاید اس لیے ہیں کہ انگریزوں نے ہر گندہ حربہ استعمال کر کے اس سرزمین پر قبضہ کیا۔اس میں حماقت والی کونسی بات ہے؟ دھوکہ تو بڑے سے بڑے سمجھدار آدمی کو دیا جا سکتا ہے۔'' اُس نے میری بات سے اتفاق کیا تبھی تو سر یوں ہلانے لگی جیسے میں نے سچ بولا ہو۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ تو ہندوستانیوں کو پسند نہیں کرتی تو یہاں کے لوگوں کے بارے میں کوئی حتمی بات کیسے کر رہی تھی لیکن میں نے یہ سوال یوں نہیں پوچھا کہ یہ بات مجھ سے نیاز محمد بیرے نے کہی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری وجہ سے کسی مشکل میں پڑے۔ پھر وہ بولی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ملکوں پر قبضہ کرنے کے معاملے میں ہماری تاریخ قابل شرم ہے۔ہم اپنے کو برطانیہ عظمیٰ کہتے ہیں لیکن یہ عظمت مانگے تانگے کی ہے۔جس دن برطانیہ کے زیر اقتدار علاقوں پر سورج غروب ہونا چھوڑ دے گا، اُس دن ہم نجانے خود کو کیا کہیں گے..... ہے نا؟'' مجھے اُس کی یہ بات پسند آئی۔

اگر نیاز محمد مجھے اُس کی پہلی کسی شادی کے بارے میں نہ بتا چکا ہوتا تو مجھے یقیناً کسی باسٹرڈ کے تذکرے پر حیرت ہوتی لیکن میں نے فوراً ہی باسٹرڈ کے بارے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔وہ اُس وقت سر کو خم دیئے سگریٹ کی راکھ جھاڑ رہی تھی۔اُس کا اس انداز سے بیٹھنا یقیناً اُسے دل کش بنا رہا تھا۔کسی باسٹرڈ کے تذکرے کے بعد مجھے کوئی اور بات کرنے میں وقت لگا کیونکہ میں موضوع سوچ رہا تھا۔وہاں گفتگو ویسے بھی مشکل ہو جاتی ہے جہاں موضوعات تیزی سے تبدیل ہو رہے ہوں اور یہاں یہی صورت حال تھی۔اُس نے اس کے بات اور کوئی بات نہ کی اور خاموشی کا وقفہ عجیب لگنے لگا تو میں نے کہا۔

''تو آپ کی وہاں بہت بڑی جائیداد ہے؟'' وہ مسکرائی اور سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں.....لیکن مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اُس میں۔''

اُس کی پہلی شادی والی بات ایک پھانس بن کر میرے دل میں چبھی جا رہی تھی اور میں اس بارے میں تفاصیل جاننا چاہتا تھا۔مگر میں محتاط تھا۔وہ بہرحال میرے افسرِ اعلیٰ کی بیوی تھی اور یہ اُس کی مہربانی تھی کہ اُس نے مجھے پڑوسی اور پڑھا لکھا جانتے ہوئے چائے کی دعوت دے دی تھی۔ میں اُس پر کسی قسم کا ایسا تاثر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ میں کوئی پڑھا لکھا جاہل تھا جسے دوسروں کے معاملات جاننے کی بڑی جلدی ہوتی ہے حالانکہ اندر سے میری ہندوستانی خصلت مجھے مسلسل بے چین کیے ہوئے تھی۔وہ اس مرتبہ خود ہی بولی۔

''میں اب اُنتیس سال کی ہوں۔ مجھے یہاں ہندوستان میں یہ پانچواں سال ہے۔ میں یہاں کبھی نہ آتی لیکن اُس باسٹرڈ نے مجھے اپنی محبت کے جال میں پھنسا لیا تھا۔ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ مجھے اُس کی ریاست میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، میری جتنی بڑی جائیداد ہے، اُس کو دیکھو تو میرے دل میں مزید کا لالچ پیدا ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ بس مجھے اُس سے محبت ہوگئی تھی اور جب اُس نے شادی کا کہا تو مجھ سے انکار نہ ہوسکا۔''

وہ اُنتیس برس کی تھی تو مجھ سے کم وبیش کوئی پانچ برس بڑی تھی۔ عین ممکن تھا عمروں کے اس فرق کے باوجود ہم آگے چل کر اچھے دوست بن جاتے۔ مجھے، میرے اصرار یا خواہش کا اظہار نہ کرنے کے باوجود، اُس کا مجھ پر یوں بھروسہ کر کے دل کھولنا، بہت اچھا لگا۔ میں نے سگریٹ سلگایا تو مجھے لگا جیسے اب وہ وقت آ گیا تھا جب میں اُس سے اس کی ناکام شادی کے بارے میں کھل کر بات کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

''اوہ.....شادی ناکام ہوجانا واقعی یقیناً تکلیف دہ ہوتا ہوگا۔'' اُس وقت نجانے کیوں مجھے لہنا سنگھ اور اُس کی بیوی ہرپریت کور کا خیال آ گیا۔ وہ شادی بھی تو ان معنوں میں ناکام ہی تھی کہ لہنا سنگھ اپنی بیوی کی چٹیا پر ہاتھ رکھ کر سوتا تھا۔ اُس کی بڑی اور نیلی آنکھیں لمحہ بھر کو دھندلائیں اور اُس نے کہا۔

''اوہ یقیناً..... بہت تکلیف دہ لیکن میں اپنی شادی کی ناکامی سے بہت خوش ہوں۔ میں نے تین برس، پورے تین برس اُس جہنم میں، اُس گھٹیا آدمی کے ساتھ گزارے تھے اور یہ تین برس میری زندگی کا انتہائی برا وقت تھا۔'' میں نے قدرے جھجک کر پوچھا۔

''تو وہ کوئی نواب تھا؟'' اُس نے نیا سگریٹ سلگا لیا اور میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے کچھ دیر سگریٹ کے جلتے سرے کو دیکھ کر بولی۔

''راجہ ہے ایک ریاست کا۔ جب اُس نے مجھ سے شادی کی تھی تو اُس کا باپ راجہ تھا۔ اپنے باپ کو اُس نے زہر دلوا دیا تھا کیونکہ اُسے گدی نشینی کی بہت جلدی تھی۔'' میں یہ سن کر کانپ گیا۔ میں نے حیرت سے کہا۔

''زہر دلوا دیا تھا..... باپ کو؟'' اُس نے ایک چھوٹا سا کش لیا اور دھواں تیز ہوا کے جھونکے سے فوراً ہی تحلیل ہوگیا۔ وہ بولی۔

''ہاں۔ یہ بات مجھے اُس سے طلاق کے بعد کسی نے بتائی تھی۔ بہر حال میری طرف سے جہنم میں جائے۔ میں اب اُس کی قید سے آزاد ہوں۔'' مجھے بھی خوشی تھی کہ اُس جیسی کومل عورت کسی کی قید میں نہیں تھی۔ وہ سگریٹ پیتی رہی پھر چونک کر بولی۔

''تم اور چائے لوگے..... میں تو لوں گی؟'' اس بار اصرار کر کے میں نے چائے بنائی۔ اُس نے گھونٹ لیا اور

مسکرا کر بولی۔

''اچھی چائے بنائی ہے تم نے؟''

اندھیرا اس لیے کچھ جلدی پھیل گیا تھا کہ ابھی تک گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی اور میں مغربی اُفق میں ایک بار پھر بجلی چمکتی دیکھ سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کچھ ہی دیر میں ایک مرتبہ پھر بارش ہوسکتی تھی۔ نیاز محمد دبے پاؤں آیا اور اُس نے ہمارے سروں پر لگا قمقمہ روشن کر دیا۔ قمقمے کے گرد جلد ہی پروانے جمع ہونے لگے اور کچھ میز پر بھی گرے تو ہم اپنی اپنی کرسیاں وہاں سے فاصلے پر لے گئے اور برآمدے کے سرے پر بیٹھ گئے۔ کیٹی نے چائے ختم کر کے پھر سگریٹ سلگایا اور بولی۔

''میں وہاں بہت خوش رہتی۔'' وہاں سے اُس کی مراد برطانیہ تھا۔

''میرا بہت اچھا مستقبل تھا اپنے اخبار کے ساتھ۔ دو ہی سال تو ہوئے تھے مجھے وہاں کام کرتے لیکن قسمت میں ہندوستان لکھا تھا تو میں کیسے نہ آتی؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''آپ قسمت میں یقین رکھتی ہیں؟'' اُس نے لمحہ بھر مجھے غور سے دیکھا اور بولی۔

''ہاں جب سے میرے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے، میں مقدر کو ماننے لگی ہوں۔ تم نہیں مانتے؟'' یہ میرے حسابوں ایک مشکل سوال تھا۔ میں نے کہا۔

''جب بھی کوئی مجھ سے یہ سوال پوچھتا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کا کیا جواب دوں؟ اگر سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہے تو برے کام پر سزا کیوں ملتی ہے؟ میرے خیال میں یہ گتھی سلجھانے میں انسان کو ابھی بہت وقت لگے گا۔ جب وہ خدا سے کچھ اور قریب ہو جائے گا۔ آپ خدا پر یقین رکھتی ہیں؟'' کیٹی نے چند لمحوں تک سوچا اور بولی۔

''ہاں کیوں نہیں؟ تم نہیں رکھتے؟'' میں نے بتایا کہ میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ پھر میں نے بات کا رخ موڑا اور کہا۔

''تو آپ صحافی ہیں؟'' وہ مسکرائی تو مجھے اُس کی مسکراہٹ میں ایک چھپا ہوا فخر بھی دکھائی دیا۔

(جاری)

◂◂ ● ▸▸

C/o : Dr. Rehana Iqbal
Hazara Road, Hasan Abdal
Dist: Attock 47000 (Pakistan)

- **نوسٹیلجیا کا ایک باب**
- **سلمان باسط**

نوسٹیلجا

گورنمنٹ کالج چکوال ایک وسیع رقبے پر محیط تھا۔ کالج کے لان کی روشیں مختلف رنگوں کے پھولوں سے سجی ہوتیں اور میرا اکثر جی چاہتا کہ میں اپنی پسند کے پھول ہاتھ بڑھا کر توڑ لوں مگر ابا جی ہمیشہ پھول توڑنے سے منع کرتے اور کہا کرتے کہ پھول شاخوں پر ہی رہنے چاہئیں۔ ان کو صرف دیکھنا چاہیے۔ مجھے اس بات کی کبھی سمجھ نہ آتی اور میں ناخوش سا ہو کر کسی اور طرف متوجہ ہو جاتا۔ میں کبھی کبھار ضد کر کے ابا جی کے ساتھ کالج چلا جاتا۔ دیگر پروفیسر حضرات مجھ سے پیار کرتے، کیفیٹیریا سے میرے لیے چیزیں منگواتے اور میں خود کو بہت اہم شخصیت سمجھنے لگتا۔ جب پروفیسرز سیاہ گاؤن پہنے دیوتاؤں کیسے وقار کے ساتھ سٹاف روم میں داخل ہوتے تو مجھے وہ بہت پرکشش لگتے اور میں مبہوت ہو کر انہیں دیکھتا رہتا۔ میرا جی چاہتا کہ میں بھی جلدی سے پروفیسر بن جاؤں اور گاؤن پہن کر پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سٹاف روم میں داخل ہوں۔ میرے لیے چپڑاسی چائے لائے اور میں کبھی کسی کتاب کی ورق گردانی کروں اور کبھی خلا میں گھورتا رہوں۔ مجھے لگتا یہ دنیا کا سب سے خوبصورت کام ہے۔ آتے جاتے طلبہ سلام علیکم سر کہتے اور پروفیسر صاحبان گردن کو خفیف سا خم دے کر، لبوں پر دلآویز سا تبسم سجائے، وعلیکم السلام اچھالتے آگے بڑھ جاتے۔ شاید میں تبھی اس طلسم کدے میں کہیں کھو گیا تھا اور غیر شعوری طور پر انہی دنوں پروفیسر بن گیا تھا۔ کالج کا سالانہ ہفتۂ تقریبات چل رہا تھا۔ دیگر سرگرمیوں کے ساتھ سٹاف کے بچوں کی دوڑ کا مقابلہ بھی منعقد کروایا گیا۔ مقررہ وقت پر سب بچوں کو ان کی عمروں کے اعتبار سے مناسب فاصلے پر کھڑا کیا گیا۔ مجھے عمر میں سب سے چھوٹا ہونے کے باعث سب سے آگے کھڑا کیا گیا۔ دوڑ کے آغاز کا اعلان کرنے کے لیے ایک کھلونا پستول سے فائر کیا گیا جس سے میں خوفزدہ ہو گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب بچے آگے کی طرف دوڑے اور میں اپنے ابا جی کی طرف دوڑ پڑا۔ یہ منظر دیکھ کر ہر طرف سے قہقہے گونجنے لگے۔ میں کھسیانا سا ہو گیا۔ ڈی پی صاحب نے مجھے گود میں اٹھایا اور ٹریک پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ مجھے خوب دلاسا دینے کے بعد دوڑ کا نئے سرے سے آغاز کیا گیا۔ اس بار پستول سے فائر کرنے کی

بجائے ایک دو تین سے کام چلایا گیا۔ میں دوڑا تو اپنی منزل کی جانب ہی مگر میری عمر کی کم مائیگی میری رفتار کو بڑھانے میں ناکام رہی۔ کالج کے پرنسپل سلطان بخش صاحب نے مجھے آ کر اٹھا لیا اور ٹافیوں کا ایک بڑا سا پیکٹ میرے چھوٹے سے ہاتھوں میں تھما دیا۔ میری تالیفِ قلب کے لیے یہ سامان کافی تھا۔ میں ٹافیوں کا پیکٹ تھامے ابا جی کی طرف لپکا اور ان کے کندھوں پر سوار ہو گیا۔ خوش رنگ ٹافیوں کے پیکٹ نے میرے تمام خوف، میری تمام خجالت کا یکسر خاتمہ کر دیا تھا اور میں اس وقت کالج، اس کی روشوں، طلبہ، اساتذہ اور ارد گرد وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات سے مکمل طور پر غافل تھا۔ میری توجہ کا مرکز صرف وہ ٹافیوں کا پیکٹ تھا جس کو میں جلد از جلد کھولنا چاہتا تھا مگر مجھے اندیشہ تھا کہ سرِعام پیکٹ کھولنے سے شاید بہت سے لوگوں کو اس میں حصّہ دار بنانا پڑے۔ بالآخر تقریب کے جھمیلے ختم ہوئے اور میں نے گھر پہنچتے ہی ٹافیوں کے پیکٹ کو کھول لیا۔ ٹافیوں کے ساتھ وابستہ انہی دنوں کا ایک ایسا واقعہ بھی ہے جو آج بھی یاد آنے پر میرے دل کو مسل دیتا ہے۔ ایک دفعہ میں ابا جی کے ساتھ کہیں باہر گیا اور حسبِ معمول ٹافیاں لے کر گھر آیا۔ بھائی جان کے لیے ان کی پسندیدہ کوئی اور چیز تھی جو اب مجھے یاد نہیں۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے وہ چیز بانٹ کر کھائی۔ جواباً میں نے بھی خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں کمال فیاضی سے ایک عدد ٹافی عنایت کر دی۔ بھائی جان کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی کہ وہ چیزوں کو وقتی طور پر سنبھال کر رکھ لیتے تھے اور بعد میں ان کو اپنی سہولت اور اہتمام سے استعمال کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ہر ماہ ہم دونوں بھائیوں کو پاکٹ منی ملتی۔ میرے حصّے کی پاکٹ منی عموماً ایک آدھ دن میں اختتام پذیر ہو جاتی اور بھائی جان اسے کسی اور دن پر اٹھا رکھتے اور وہ کوئی اور دن تب آتا جب میں بھی اس میں شریک ہو جاتا۔ جس وقت میں نے بھائی جان کو ٹافی دی، وہ امّی جی کے ساتھ ڈرائنگ روم کے فرنیچر کی سیٹنگ تبدیل کروا رہے تھے۔ انہوں نے میری عطا کردہ ٹافی جیب میں رکھ لی اور کام میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں بھائیوں میں کسی بات پر لڑائی ہو گئی۔ جب بات زیادہ بڑھی تو میں نے اپنی دی ہوئی ٹافی واپس مانگ لی۔ بھائی جان نے جیب سے وہ ٹافی نکالی اور مجھے تھما دی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر ریپر کھولا اور اسے منہ میں ڈال لیا۔ جب میں ٹافی کھا چکا تو مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے آج بھی وہ کیفیت بخوبی یاد ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرا دل بیٹھ رہا ہے اور کوئی میری آنکھوں میں دھواں بھر رہا ہے۔ لیکن وقت گزر چکا تھا۔ وہ احساس ایک پھانس بن کر ہمیشہ میرے سینے میں زندہ رہا ہے۔

عید کا دن تھا۔ ہم دونوں بھائی نئے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ابا جی نے ہم دونوں کو سرپرائز دیتے ہوئے نئی گھڑیاں عید کے تحفے کے طور پر دیں۔ ہماری خوشی دیدنی تھی۔ ہم گھڑیاں اپنی اپنی کلائی پر باندھ کر اترا رہے تھے اور بار بار وقت دیکھ رہے تھے۔ امی جی نے ہمیں تیار کیا اور ہم سب باہر گھومنے کے لیے نکلے۔ میرے

بال گھنگریالے تھے۔ امی جی ہمیشہ میرے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے ایک منفرد سٹائل بناتی تھیں۔ میرے بالوں میں دائیں اور بائیں دو پف بناتیں۔ میرے گھنگریالے بال ان میں کہیں جھولتے رہتے۔ امی جی کی خواہش تھی کہ ہم دونوں بھائیوں کی تصویر کھنچوائی جائے۔ ہمارے گھر سے نکل کر دائیں جانب ایک گلی سیدھی بازار میں جا نکلتی تھی۔ غالباً اس کا نام چھپّڑ بازار تھا۔ سردیوں کی مہربان، نرم اور گلابی رنگت والی دھوپ پورے بازار میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہمارے اندر کا موسم باہر کی اس دلآویزی سے ہم رنگ تھا۔ صاف نیلے آسمان تلے میں خوشی کو پور پور میں محسوس کر رہا تھا۔ اسی کیف آگیں کیفیت میں ہم ایک فوٹو سٹوڈیو پہنچے۔ نیچے والی منزل صرف پبلک ڈیلنگ کے لیے مخصوص تھی۔ تصویر کھینچنے کے لیے لکڑی کی سیڑھیوں کے ذریعے اوپر سٹوڈیو میں لے جایا گیا۔ ہمیں ایک بنچ پر بٹھا دیا گیا جس کے عقب میں ایک بھاری پردہ تھا۔ جب تصویر کھینچنے کا مرحلہ آیا تو ہمیں مسکرانے کو کہا گیا۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ میں نے تو گھڑی باندھی ہوئی ہے اور وہ نظر نہیں آ رہی۔ میں مسکرانا بھول کر گھڑی سامنے کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بھائی جان نے ہاف سویٹر پہنا ہوا تھا سو قمیض کے کف ہٹانے سے ان کی گھڑی تو واضح نظر آنے لگی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں نے ہائی نیک سویٹر پہن رکھا تھا اور اس کے لمبے بازو بار بار میری گھڑی کو چھپا لیتے تھے۔ میں پوری یکسوئی کے ساتھ سویٹر کے بازو پیچھے کر کے گھڑی کو اس پوزیشن میں لانے کی کوشش میں مصروف تھا مگر جیسے ہی تصویر بنانے کا وقت آتا تو سویٹر پھر گھڑی کے اوپر آ جاتا اور میں پھر سے گھڑی کی طرف متوجّہ ہو جاتا۔ فوٹو گرافر نے میری مشکل کو آسان بنانے کے لیے آگے بڑھ کر سویٹر میری گھڑی کے ساتھ اٹکا دیا۔ میں نے فوٹو گرافر کی طرف تشکر آمیز نظر ڈالی۔ اس نے میرا گال تھپتھپاتے ہوئے مجھے حرکت نہ کرنے اور مسکراتے ہوئے کیمرے کی طرف دیکھنے کی ہدایت کی۔ بالآخر تصویر بن گئی۔ وہ یادگار تصویر آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔

ہمارے ہاں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ سب کا کلر کہار جانے کا پروگرام بنا۔ روانگی سے ایک رات قبل کھانے تیار کیے گئے۔ مجھے ان تیاریوں کی گہما گہمی بہت بھلی لگ رہی تھی اور رات دیر تک میرا سونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اگلی صبح سب ایک بڑی گاڑی میں سوار ہو کر منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہوئے۔ جب ہم کلر کہار کے مضافات میں پہنچے تو پھل دار درختوں کے گہرے سائے بہت دل نواز محسوس ہونے لگے۔ کئی جگہوں سے گزرتے ہوئے تو لوکاٹ اور خوبانی سے بوجھل شاخیں ہماری دسترس میں تھیں۔ مجھے جنّت کے بارے میں وہ تمام کہانیاں یاد آنے لگیں جو امی جی اکثر اوقات سونے سے پہلے مجھے سنایا کرتی تھیں۔ مجھے ان تمام کہانیوں میں سب سے زیادہ دلکش وہ حصّے لگتے تھے جن میں رس ٹپکاتے ہوئے پھلوں سے جھکی ہوئی شاخوں کا ذکر ہوتا۔ جب میں نے اپنے ہاتھ کی پہنچ میں انہی کہانیوں جیسے پھل دیکھے تو مجھے لگا کہ شاید میں جنّت

میں پہنچ گیا ہوں۔ مگر ابا جی اور امی جی کی مسلسل اور کڑی نگرانی کے باعث میری وہ جنّت مجھ سے دور ہی رہی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہاں ہمارے قیام کے دوران بہت سے پھل کھانے کو مل گئے اور جب ہم واپس آنے لگے تو لوکاٹ اور خوبانی کے کچھ کریٹ ہمارے ہمراہ تھے۔ آخر کار ہم کلر کہار کے ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ کچھ دیر رکنے کے بعد ہم باہر سیر کے لیے نکلے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار مور دیکھے۔ انہیں ناچتے دیکھا، ان کی آوازیں سنیں۔ میرے لیے مور کے پھیلے ہوئے پنکھ اور ان پر بنے ہوئے خوشنما رنگ بہت دلچسپی کا باعث تھے۔ میں بہت دیر تک فطرت کی اس بے حجابی میں کھویا رہا۔ ہماری اور بھی سرگرمیاں رہی ہوں گی مگر وہ میرے ذہن سے محو ہو چکی ہیں اور میرے تصوّر کی آنکھ کے سامنے آج بھی وہی خوبصورت مور ناچ رہے ہیں۔

گرمیوں کی دوپہروں میں ہم دونوں بھائی جانگیے پہن کر باتھ روم میں گھس جاتے۔ پانی کی ٹوٹی کھول دیتے اور ٹھنڈے پانی کی فراخ دل دھار ٹب کو لبالب بھرتی رہتی۔ ٹب سے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اڑتے اور ہمارے بدن اس ٹھنڈک سے سرشار ہوتے رہتے۔ ایسے میں لاہور کے مصری شاہ کے دودھ والے کا ''پوئے'' کوکڑاہی میں ڈال کر دودھ بھرنے، اسے اوپر اٹھانے اور ایک مخصوص بلندی تک لے جا کر ایک دلکش دھار کی صورت میں پھر سے کڑاہی میں منتقل کرنے کا منظر ہمارے تصور میں زندہ ہو جاتا۔ ہمارا وہ رومانس جاگ جاتا اور ہم اپنا اپنا مگ لے کر پانی میں ڈبوتے اور پانی کو دودھ مان کر اس کی دھار بناتے۔ اپنے تئیں ایک دوسرے کو دودھ بیچتے اور کنکریوں کو پیسوں کی شکل دے کر باقاعدہ حساب رکھتے۔ میرا حساب ہمیشہ سے کمزور رہا ہے۔ میں اکثر غلطی کر جاتا اور دودھ کے اس کاروبار میں گھاٹے کا شکار ہو جاتا۔ مال کی یہ آزمائش ہمارے لیے کٹھن ثابت ہوتی۔ اکثر ہم آپس میں الجھ پڑتے اور کئی بار صرف دودھ کا نامکمل کاروبار ہی ہوتا اور ہم نہائے بغیر ہی باتھ روم سے باہر آ جاتے۔ امی جی کو پہلے سے ہی ہمارے جھگڑے کا علم ہوتا۔ ہم دونوں اپنا اپنا مقدمہ بھرپور انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے اور امی جی ''اچھا اچھا'' کہتے ہم دونوں کا بازوؤں سے پکڑ کر واپس باتھ روم لے جاتیں اور ہمیں ٹھیک سے نہلا کر اور تولیوں میں لپیٹ کر باہر نکالتیں۔ باتھ روم سے باہر نکلنے تک ٹھنڈے پانی کی دھار میں ہمارا جھگڑا کہیں بہہ چکا ہوتا۔

میری زندگی کا اگلا پڑاؤ کمالیہ میں تھا جب ابا جی کی تعیناتی پریم سٹی ٹرسٹ کالج کمالیہ میں ہوئی۔ تب کمالیہ ضلع لائلپور کا حصّہ ہوا کرتا تھا اور لائلپور نے ابھی فیصل آباد کا چولا نہیں پہنا تھا۔ یہ ایک گرد آلود قصبہ تھا جس کی گلیوں میں اتنی مٹی تھی کہ امی جی کا سارا دن گھر کے اندر در آنے والی مٹی کو ہر چیز سے صاف کرنے پر گزرتا تھا۔ امی جی کی صفائی پسند طبیعت کو کمالیہ کی یہ حرکت بہت ناپسند تھی اور اسی لیے وہ ابا جی کے کمالیہ آنے کے فیصلے سے زیادہ خوش نہیں تھیں۔ کمالیہ میں کوئی کنڈر گارٹن سکول نہیں تھا لہٰذا مجھے اور بھائی جان کو ایک گورنمنٹ سکول میں داخل کروا

دیا گیا۔ یہ سکول ہمارے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا مگر ہمیں کچھ فاصلہ سڑک کے ساتھ پیدل طے کرنا پڑتا۔ بھائی جان خود سڑک کی جانب چلتے اور مجھے ٹریفک سے بچانے کی خاطر اپنی داہنی سمت رکھتے۔ مجھے یہ بات اپنی خود اعتمادی پر کاری ضرب محسوس ہوتی اور کئی بار میرا جی چاہتا کہ میں بھی بڑا بن کر سڑک پر رواں دواں ٹریفک کے قریب سے بلا جھجک گزروں اور کوئی روک ٹوک نہ ہو مگر سڑک کا کنارا میرے لیے ہمیشہ شجرِ ممنوعہ ہی رہا۔

یہ سکول رقبے کے اعتبار سے چکوال کے سکول کی نسبت منا کو کے مقابلے میں روس کی حیثیت رکھتا تھا۔ بڑے بڑے کھیل کے میدان، بڑے کلاس رومز اور بچوں کی کثیر تعداد۔ جب پہلے دن سکول کا وقت ختم ہوا اور بچے اندھا دھند باہر کی طرف بھاگے تو میں گھبرا گیا اور کلاس روم کے باہر کھڑا ہو کر منہ کھولے زور زور سے رونے لگا۔ مجھے لگا میں کھو گیا ہوں اور اتنی بھیڑ میں مجھے کوئی ڈھونڈ بھی نہ سکے گا۔ ابھی مجھے اس کیفیت میں تھوڑا وقت ہی گزرا تھا کہ بھائی جان دوڑتے ہوئے آئے اور آتے ہی مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا، بڑوں کی طرح پیار کیا، خاموش کروایا اور یوں میرا رونا ہچکیوں میں تبدیل ہوا اور بتدریج میں خاموش ہو گیا مگر خوف دل سے دور نہ ہو سکا۔ بھائی جان مجھ سے پانچ سال بڑے تھے اور خود بھی ابھی بچے تھے مگر میرے لیے ایک چھتنار درخت سے کم نہ تھے۔ گھر پہنچتے ہی بھائی جان نے امی جی سے کہا کہ اس کو کسی اور سکول داخل کروا دیں جب یہ روتا ہے تو مجھے بھی رونا آتا ہے۔

یہ ایک مکمل روایتی اردو میڈیم سکول تھا جہاں بچے خوف کے سائے میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور تھے۔ اکثر اساتذہ اس فلسفے پر یقین رکھتے تھے کہ بچے مار کے خوف کے بغیر پڑھ ہی نہیں سکتے اور وہ ہاتھوں، ڈنڈوں اور گالیوں کے ذریعے قوم کے نونہالوں کی کردار سازی میں مصروف تھے۔ میں نے یہاں آ کر زندگی میں پہلی بار اساتذہ اور بچوں کو آپس میں وہ بے ہودہ الفاظ بولتے ہوئے سنا جن سے میں تب تک یکسر نا آشنا تھا۔ ہمارے گھر کے ماحول میں تو کسی کو کتا کہنے پر بھی شدید ڈانٹ پڑ جایا کرتی تھی اور امی جی ڈانٹ کے بعد ہمیں توبہ کرنے کو بھی کہا کرتی تھیں۔ میں نے ایک دفعہ اپنے کلاس فیلوز کو بات بات پر گالیوں کے استعمال پر ٹوکا اور توبہ کرنے کو کہا تو سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے اور میں خفّت کے مارے یوں خاموش ہو گیا جیسے گالی میں نے دی ہو اور وہ سب میری بے ہودگی پر میرا مزاق اڑا رہے ہوں۔ انہی لڑکوں میں ایک ایسا بچہ بھی تھا جس کی زبان سے میں نے کبھی گالی نہیں سنی تھی۔ وہ اکثر خاموشی سے اپنے کام میں مگن رہتا۔ کلاس ختم ہوئی تو شفقت میرے قریب آیا، مجھ سے ہاتھ ملایا اور یوں ہم بغیر کچھ کہے دوست بن گئے۔ اس کے بعد شفقت اور میں ایک ہی ڈیسک پر بیٹھنے لگے اور اکٹھے لنچ بھی کرنا شروع کر دیا۔ بھائی جان اس تبدیلی پر بہت خوش تھے کیونکہ اس سے قبل بریک کے اوقات میں سارا وقت میں انہی سے چمٹا رہتا اور انہیں نہ اپنے دوستوں سے کھیلنے دیتا اور نہ ہی خود سے الگ ہونے دیتا۔ گھر سے بھی بھائی جان کو یہی ہدایت تھی کہ مجھے اکیلا

نہ چھوڑا جائے چنانچہ بھائی جان تلملاتے ہوئے مجھے ساتھ ساتھ لیے پھرتے اور کڑھتے رہتے۔ شفقت کے ساتھ میری دوستی نے گویا ان کو آزادی سے روشناس کروا دیا۔ اب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتے مگر وقفوں وقفوں سے آ کر مجھ پر بھی نظر ڈال لیا کرتے اور میں ان شفیق آنکھوں کی پھوار میں بھیگتا رہتا۔

ہمارا سکول آٹھویں جماعت تک تھا اور یہاں ملک بھر سے اساتذہ ٹریننگ لینے اور پیشہ وارانہ کورسز کے لیے بھی آیا کرتے تھے۔ سکول کی عمارت کا ایک حصّہ ان زیرِ تربیت اساتذہ کی رہائش کے لیے مخصوص تھا۔ ہمارے ایک ماموں زاد بھائی جو مجھ سے بہت بڑے تھے، ٹیچر ٹریننگ کے لیے آئے اور ہمارے اصرار پر ہاسٹل کی بجائے ہمارے ہاں ہی ٹھہرے۔ بھائی جان اجمل بہت باذوق تھے اور اکثر اچھے اشعار اور نثری فن پاروں کے اقتباسات سنایا کرتے۔ بھائی جاں اجمل کے آ جانے سے ہم دونوں بھائی بہت خوش تھے۔ ہمارے مختصر سے کنبے والے گھر میں جب کوئی مہمان آتا تو ہم بہت خوش ہوا کرتے اور پھر یہ تو بہت دنوں کے لیے آئے تھے۔ بھائی جان اجمل کی شخصیت ہمیشہ سے بہت شفیق تھی۔ مجھ سے بہت پیار کرتے اور ہر اچھے کام کی حوصلہ افزائی کرتے۔ میری آنکھوں میں آج بھی وہ دن روشن ہے جب ایک چھٹی کے دن ہم گھر کے آنگن میں سردیوں کی مہربان اور خمار آلود دھوپ کا لطف لے رہے تھے۔ میں نے اپنی تختی دھو کر سوکھنے کے لیے دیوار کے ساتھ ٹکا کر رکھی ہوئی تھی۔ بھائی جان اجمل نے مجھے اٹھ کر تختی پکڑنے اور لکھنے کو کہا۔ میں ابھی کام کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر جواباً زندگی کا پہلا شعر کہا جو برجستہ اور فی البدیہہ تھا:

تختی مری ابھی سوکھی نہیں　　سورج کی گرمی بھی اٹھی نہیں

اس وقت مجھے اتنا ادراک کہاں تھا کہ الفاظ کی نشست و برخواست موزوں ہے یا نہیں۔ میں نے تو اپنی طرف سے مذاق میں یہ شعر کہہ دیا مگر بھائی جان اجمل بہت خوش ہوئے اور امی جی، ابا جی کو فوراً بتایا کہ اس نے اتنی چھوٹی سے عمر میں شعر کہا ہے۔ گھر میں سب نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میرا شعر گوئی کی طرف وہ پہلا قدم تھا تو بے جا نہ ہوگا۔

امی جی کا ادبی ذوق ہمیشہ سے بہت عمدہ تھا۔ اقبال، غالب میر کے علاوہ بھی بہت سے اردو اور پنجابی کے شعرا کے اشعار ان کو ازبر تھے اور سنایا کرتی تھیں۔ ہمارے سکول میں باقاعدگی سے بزمِ ادب کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ میں غالباً دوسری یا تیسری میں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے امی جی نے اقبال کے جواب شکوہ سے کچھ اشعار یاد کروائے جن کو میں نے پورے سکول کے سامنے بزمِ ادب میں اشاروں کے ساتھ پڑھا۔ میرے معصومانہ انداز، درست تلفّظ اور برجستہ ادائیگی کو سب حاضرین نے بہت سراہا اور دیر تک میرے لیے تالیاں بجتی رہیں۔ اشعار ختم ہو گئے، تالیاں بھی ختم ہو گئیں مگر میں وہیں کھڑا رہا کیونکہ مجھے علم نہیں تھا کہ اشعار پڑھ کر واپس اپنی جگہ پر

جانا ہے۔ میری معصوم ''ہٹ دھرمی'' دیکھ کر ایک استاد آگے بڑھے اور مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر میرا رخ واپس جانے والے راستے کی طرف موڑ دیا اور ساتھ ہی مجھے واپس جانے کو کہا۔ اس منظر نے تالیوں میں اضافہ کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب تالیوں میں حاضرین کے قہقہے بھی شامل ہو چکے تھے۔ جب میں واپس جاتے ہوئے اسٹیج کے قریب سے گزرا تو مسندِ صدارت پر متمکن شخصیت نے مجھے پاس بلایا اور شاباش کہتے ہوئے پانچ روپے انعام کے طور پر دیئے۔ میں نے ان پانچ روپوں کو وقت ضائع کیے بغیر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ ان پانچ روپوں نے اس وقت مجھے جو خوشی دی تھی وہ مجھے کبھی نہیں بھولی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے بہت بڑا معرکہ سرانجام دیا ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ میری خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ جب میں انعام لے کر اپنے کلاس فیلوز کی قطار میں واپس آیا تو ہر بچہ مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس دن میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وجہ اس وقت بھی پانچ روپے نہیں تھے کیونکہ ہم دونوں بھائیوں کو ہر ماہ اچھی خاصی پاکٹ منی ملا کرتی تھی۔ بات اس اعزاز کی تھی جو پورے سکول کے سامنے مجھے ملا تھا اور میری کم عمری کے باوجود وہ احساس میرے اندر خوب رچ گیا تھا۔ گھر آ کر میں نے سب کو خوشی خوشی پورا واقعہ سنایا اور چمکتی آنکھوں سے وہ پانچ روپے بھی دکھائے جو مجھے انعام میں ملے تھے۔ امی جی نے مجھے گود میں اٹھا کر خوب چوما اور شاباش دی۔ ابا جی نے بھی بہت پیار کیا اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ بھائی جان بھی بہت خوش تھے اور مجھے ''میرا ویر میرا ویر'' کہہ کر بار بار پیار کرتے۔ بھائی جان اجمل نے بھی بہت شاباش دی۔ مجھے اس رات دیر تک نیند نہ آئی۔ اس واقعے کی حقیقت مجھ پر بہت بعد تب کھلی جب میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ بھائی جان اجمل نے ایک دن بتایا کہ وہ پانچ روپے در حقیقت میرے والدین نے بھائی جان اجمل کو اس لیے دیے تھے کہ وہ جنابِ صدر کے ذریعے مجھے انعام دلوائیں تا کہ پہلی بار ایک بڑے مجمع کے سامنا کرنے کی وجہ سے میرا اعتماد بڑھ جائے۔ اتنے برسوں بعد یہ جان کر میری آنکھیں بھیگ گئیں کہ میرے والدین نے زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے کس کس طرح میری مدد کی تھی۔ ان کے اس چھوٹے سے عمل نے مجھ میں ایک بھرپور روح پھونک دی اور میں پورے زمانۂ طالب علمی میں سکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر ہر جگہ بہترین مقرر رہا۔ لاتعداد بین الکلیاتی مباحثوں، بیت بازی کے مقابلوں اور مشاعروں میں بے شمار انعامات حاصل کیے۔ ان مقابلوں نے میری عملی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے اور مجھے کبھی بڑی سے بڑی محفلوں میں کبھی کسی قسم کی جھجک محسوس نہ ہوئی۔ آج مڑ کر دیکھتا ہوں تو ان تمام کامیابیوں کے پیچھے میرے مہربان، شفیق اور دانا والدین کے مسکراتے اور ہمت بندھاتے چہرے نظر آتے ہیں۔

English Language Center Yanbu University College,
Yanbu Royal Commission City,Saudi Arabia Phone: 00966560628132

تبصرے

نام کتاب : نئی صدی کے افسانے (منتخب افسانوی مجموعہ)
مرتب : پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ
ناشر : بک ایج پبلیشرز
قیمت : پاکستان ۴۸۰ روپے بیرون ملک ۸/ڈالر
مبصر : ارشد علی اسلام آباد (پاکستان)

اردو افسانہ اپنے آغاز سے ہی ایک واضح فکری اور معنوی سمت متعین کرتا دکھائی دیتا ہے۔ پریم چند ایسے افسانہ نگاروں نے سماجی حقیقت نگاری اور ترقی پسندانہ فکر کو اس نئی پنپنے والی صنف کی بنیاد میں شامل کیا۔ ازاں بعد دیگر افسانہ نگار (جن میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے) منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، رشید جہاں، علی سردار، حیات اللہ انصاری، قراۃ العین حیدر، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، وغیرہ نے اسی بنیاد پر اردو افسانے کی دیواریں اٹھائیں اور اسے ایک مضبوط عمارت کا روپ سروپ عطا کیا۔ یہی وجہ تھی کہ تقسیم ہند کو افسانہ نگاروں نے ایک انسانی المیے کے طور پر محسوس کیا اور اس دور میں لکھا گیا افسانہ ہر طرح کی چھوٹی نظریاتی بنیادوں سے بالاتر ہو کر انسانی بے وقعتی، ہجرت، اور دکھ کے نوحے کو متن کرتے ہوئے اپنے ہونے کا بھرپور اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد پے در پے مارشل لاء، بیوروکریسی اور اسٹیبلشمنٹ نے سوچی سمجھی سازش اور نظریہ ضرورت کے تحت صوفیانہ طرز فکر کو مجموعی طور پر ادب کا حصہ بنانے کی کوشش کی اور اسی دوران صوفیانہ فکر کے ساتھ ساتھ افسانہ نام نہاد جدیدیت، وجودیت، اور مابعد الطبیعاتی موضوعات کو متن کرتا دکھائی دینے لگا۔ یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند شاعر و ادیب اور ترقی پسند فکر زیر اعتاب اور ریاستی جبر کا شکار تھی اور پھر یہ سلسلہ مہینوں، سالوں سے ہوتا دہائیوں تک دراز ہوتا چلا گیا۔ اس وجودیت، جدیدیت اور تصوف کا کمال تھا کہ قاری جو افسانے میں اپنی سماجی شناخت، حیثیت اور مسائل کو رقم ہوتے دیکھنے کا خواہش مند تھا دل برداشتہ ہو کر افسانے سے اسی طور کٹتا چلا گیا جیسے افسانہ معروض سے کٹ کر ذات کی پہنائیوں میں غرق ہو چکا تھا۔

اور اگر کہیں کوئی افسانے کو ان مابعد الطبیعاتی بھول بھلیوں سے آزاد کروانے کے لئے کوشاں بھی

تھا تو وہ بدترین رسالہ جاتی سازشوں کا شکار ہوکر نمایاں طور پر سامنے نہ آسکا۔ اس تناظر میں سوشل میڈیا نے معاصر ادیب کو ان جکڑ بندیوں سے آزاد کروانے میں اہم کردار ادا کیا اور اد باء قاری تک اپنی آواز پہنچانے کو اس جدید تر میڈیم سے جڑتے چلے گئے۔ نتیجتاً بہت کم وقت میں بہت سے لوگ اکٹھے ہونے سے نہ صرف جدید اردو افسانے کے خدوخال سامنے آئے۔ بلکہ ان میں سے بیشتر ہم خیال لوگ کے ملنے سے ''پروگریسیو اردو رائٹرز گلڈ'' کا قیام بھی عمل میں لایا گیا اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ اور آج کے سماجی ماحول سے مطابقت رکھے افسانوں کو عام قاری تک پہنچانے کے لیے ''نئی صدی کے افسانے'' کی صورت ایک انتخاب زیور اشاعت سے آراستہ کیا گیا۔

اردو افسانے کی ہمیشہ سے بدقسمتی رہی کہ اس کے بیشتر 'انتخاب' ذاتی وابستگیوں یا پبلشرز کے مفادات کے تحت ہی مرتب کیے گئے نہ کہ معاصر افسانے کو قاری تک پہنچانے کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اسے جدید افسانے سے روشناس کروانے کو۔ لیکن انتخاب ہذا میں سوشل میڈیا سے جڑے اور دنیا کے کسی بھی خطے میں موجود اردو لکھنے اور پڑھنے والے کو اس انتخاب میں شامل ہونے کا پورا موقع فراہم کیا گیا۔ اس طرح یہ انتخاب کسی حد تک اردو لکھاری کی مجموعی سوچ اور اس کے موضوعات کا احاطہ کرتا محسوس ہوتا ہے۔ ''نئی صدی کے افسانے'' میں شامل افسانے اپنے موضوعات، تکنیک، اور اسلوب میں اتنا ہی تنوع لیے ہیں جتنا اس میں شامل تخلیق کاروں کی مختلف خطوں سے وابستگی ہے۔ اس مجموعہ میں پاکستان، ہندوستان، یو اے ای، سعودیہ، کینیڈا، امریکہ، آسٹریلیا، سوئزرلینڈ، نیوزی لینڈ، اور یورپ وغیرہ میں بسے اردو لکھنے والوں کی تخلیقات شامل ہیں۔

یوں ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب آتی ہے جس کا ہر افسانہ اپنے ماحول، موضوع، تکنیک اور اسلوب میں سابقہ سے مختلف ہے۔ ان افسانوں میں جہاں وطن سے دوری کا نوحہ ہے وہیں طبقاتی کشمکش کی جکڑ بندیوں میں بندھے کردار بھی ہیں۔ نئے خطوں میں آباد ہونے والوں کا اپنی شناخت کو تلاش کرنے کا عمل ہے تو کہیں اپنے ہی خطوں میں بے شناخت ہو رہنے والوں کا درد بھی ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے گلوبلائزیشن کو بھی موضوع بنایا ہے اور پوسٹ ماڈرن متن بھی اس انتخاب کا حصہ ہے۔ آج کا انسانی نہ صرف مقامی ہے بلکہ وہ گلوبلائزیشن کی وجہ سے بین الاقوامی بھی ہے اور بین الاقوامی سیاست و معاشیات سے اسی طور متاثر ہوتا ہے جیسا کہ مقامی حالات میں تبدیلی اس کی زندگی میں تغیر کا باعث بنتی ہے اور ان نکتہ کا شعور و ادراک اور عالمی سیاسی و معاشی صورت حال پر نظر رکھنا آج کے لکھاری کے لیے بہت ضروری ہے اس افسانے میں شامل افسانے یہ ثبوت باہم پہنچاتے ہیں کہ اردو افسانے کا لکھاری اس حوالے سے مکمل طور آگاہ

ہے اور قاری کو بھی آگاہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس انتخاب میں تانیثیت کی توانا آواز پدرسری سماج کا پردہ چاک کرتی دکھائی دیتی ہے تو کہیں افسانہ نگار مابعد الطبیعاتی سیاست کو آشکار کرتے اور رد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں ایسے متن بھی موجود ہیں جو اسلوب، تکنیک اور موضوع کے حوالے سے کئی ادبی مباحث کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ تمام متن باطنی سطح پر ترقی پسند فکر کی مضبوط افسانوی روایت سے جڑے ہوئے بھی محسوس ہوتے ہیں۔

آخر میں نعیم بیگ صاحب کے جملے کو دہرانا چاہوں گا کہ اس انتخاب کو میں اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کا ماحاصل دنیائے ادب کا شاہنامہ تو شاید نہ کہہ سکوں لیکن اتنا اضافہ ضرور کرنا چاہوں گا کہ اردو افسانے کو ہمیشہ ایسے انتخابات سے محروم رکھا گیا اور ایسی توانا آوازوں کو نظرانداز کرنے کا رویہ اپنایا گیا یا کم از کم اس کی دانستہ کوشش ضرور کی جاتی رہی سو یہ انتخاب اس تمام روایتی انتخاباتی طریقہ کار کی نفی کرتے ہوئے اردو افسانے کہ اب تک کے چند چنیدہ انتخابات میں ایک نئے تازہ اور توانا اضافے کے طور پر سامنے آیا ہے۔

☆☆☆

نامِ کتاب	:	گردش ایّام (افسانے)
مصنفہ	:	سرفراز جہاں
قیمت	:	200 روپے
زیر اہتمام	:	اقبال حسن آزاد
ناشر	:	ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ۔ مونگیر
مبصر	:	انجم قدوائی (علی گڈھ)

سرفراز جہاں کے افسانوں کا مجموعہ ''گردشِ ایّام'' میرے سامنے ہے۔ اس مجموعہ میں 44 افسانے ہیں۔ افسانوں میں محبت کا دلفریب رنگ ہر جگہ نمایاں ہے، جبکہ زیادہ تر افسانے ناکام محبت کی داستان سناتے دہراتے نظر آتے ہیں۔ اس موضوع کو دائرۂ قلم میں لاتے ہوئے بارہا انکے ہاتھ زخمی ہوئے ہوں گے، کہیں کہیں مخملی نرمی بھی محسوس ہوئی ہوگی۔ انھوں نے ماضی کے چند قصّوں اور حادثوں کو دورِ حاضر کے مسائل کے ساتھ پیش کیا ہے، ''خوبصورت دھوکا''، ''چوٹ''، ''معصوم چاہت''۔ جیسے

کئی افسانے معصوم محبت کے فسانے بیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ انکا ایک افسانہ ''راکھی'' جس میں محبت ناکام تو نہیں مگر کامیاب بھی نظر نہیں آتی شاید اس کا انجام سرفراز جہاں نے قاری کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ بیشتر افسانے ایسے ہیں جس میں انھوں نے محبت کا سفر ''نا تمام'' رہنے دیا ہے۔ جس کی وجہ سے قاری

کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔''عورت'' نام کے اک مضمون میں انھوں نے عورت کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہا''مگر عورت کیا ہے۔اسے سمجھنا آسان نہیں۔بقول ارسطو''عورت وہ بلوّری صراحی ہے جس کا سرا نہیں ملتا''یعنی عورت ایسی شے ہے جس کی گہرائی ایک اتھاہ سمندر کے مانند ہے،جس کے اندر اگر خوفناک جانور ہیں تو بہت قیمتی پتّھر،ہیرا،موتی اور جواہر بھی ہیں۔''اس مضمون کو پڑھ کر ان کے عقیق مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔بلبل پر لکھا ہوا خاکہ کافی معلوماتی ہے۔

سرفراز جہاں نے اس ہنرمندی سے اپنی بات سامنے رکھی ہے کہ وہ قاری کے دل و ذہن میں اترتی چلی جاتی ہے۔کسی بھی افسانے کو طویل نہیں ہونے دیا،انکا مطالعہ وسیع ہے۔آگہی کا کرب ان کے افسانوں میں کئی جگہ روشن الاؤ کی طرح سلگتا نظر آتا ہے۔زندگی کا تجربہ ان کی تحریر میں سمٹ کر آ گیا ہے۔

ان کے افسانوں مین''اذان''،''تسکین''،''راکھی''جیسے کئی بہت عمدہ افسانے ہیں۔مجموعی طور پر یہ کتاب اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

☆☆☆

کتاب کا نام: شجر ہونے تک (کلیات باصر سلطان کاظمی)

مبصر:سلیم خاں

سال اشاعت:2015

صفحات:334

ناشر:سنگ میل پبلیکیشنز لاہور

قیمت:1200روپے(پاکستان)

باصر سلطان کاظمی اس دور کے ان معدودے چند قلمکاروں میں سے ایک ہیں جو مختلف اصنافِ سخن میں اپنے فن کا لوہا منوا چکے ہیں۔'پسرِ لائقِ میراثِ پدر' کی مصداق ناصر کاظمی کی زمین میں ان کے نورِ نظر کا شاعری کرنا حیرت کا سبب نہیں ہیمگر شیکسپیئر کی سرزمین برطانیہ میں کسی پردیسی کا ڈرامہ کھیلنا یقیناً حیرت انگیز امر ہے۔کلیاتِ باصر'شجر ہونے تک' میں ان کے ۴ ڈرامے اور ایک افسانہ شامل ہے۔افسانہ'مانوس اجنبی'یوں تو'بساط' کا شانِ نزول ہے لیکن اسے بیان کرنے کیلئے اس قدر انوکھا اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ میں ایک افسانہ بن گیا۔باصر کاظمی کے موضوعات کا تنوع انہیں ممتاز و منفرد مقام پر فائز کرتا ہے اور اس کے سبب قاری تکرار کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے۔'شریکِ درد' کا محور ایک روایتی خاندان اور اس کے مسائل ہیں جبکہ نئی زندگی ازدواجی معاشرت کی جدید الجھنوں سے بحث کرتا ہے۔یہ دونوں ڈرامے

زمانۂ حال کے ترجمان ہیں،اس کے برعکس''بساط''صدیوں پرانی تاریخ کے دریچہ میں بچھائی گئی ہے اور''روبوٹ۴۲۰''اپنے قاری کو سو سال بعد کی میکانکی دنیا میں لے جاتا ہے۔

ان تمام ڈراموں میں متضاد کرداروں کی موجودگی مشترک ہے۔''شریکِ درد''میں بھائی راشد اور بہن جمیلہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ایک برسرروزگار تو دوسرا بے روزگار۔بہن انیلہ اگرچہ کہ بہت خوبصورت ہے تو جمیلہ بس قبول صورت۔ماں وحیدہ بیوہ ہو چکی ہے مگر جمیلہ ابھی کنواری ہے۔وحیدہ موت کی دہلیز پر کھڑی سکون سے مرنا چاہتی ہے اور جمیلہ نئے انداز میں جینے کیلئے زندگی کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔اس ڈرامے کے تانے بانے قنوطیت اور رجائیت کے سیاہ و سپید دھاگوں سے بنے گئے ہیں اور بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔

''نئی زندگی'' کی کہانی ایک ایسے خاندان کے اردگرد گھومتی ہے جس میں خاوند شفیق اور زوجہ فہمیدہ کا مزاج ایک دوسرے سے متضاد ہے۔ڈرامہ شروع سے آخر تک ایک تناؤ کے ماحول میں آگے بڑھتا ہے لیکن فہمیدہ بالآخر اپنی سمجھ بوجھ سے صورتحال کو یکسر بدل دیتی ہے۔ڈرامہ کا اختتام اس قدر خوشگوار فضا میں ہوتا ہے کہ قاری یک گونہ سکون و مسرت محسوس کرتا ہے۔اس ڈرامہ میں عصرِ حاضر کے مرضِ بے اطمینانی کی تشخیص کرنے کے بعد اس کا مؤثر حل بھی سجھایا گیا ہے۔''روبوٹ۴۲۰''دو ایسے خاندانوں کی کہانی ہے جن میں سے ایک پاکستانی اور دوسرا بنگلہ دیشی ہے۔ان کی زبان و تہذیب کے علاوہ فکر و نظر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔اس کے مرکزی کردار مرزا صاحب اور ان کی بیگم نادرہ کا مزاج بھی آپس میں میل نہیں کھاتا۔بے حس روبوٹ میکانکی خادم ہونے کے باوجود ایک زندہ علامت ہے۔جدید معاشرے میں بغیر سوچے سمجھے زندگی گزارنے والے بے حس انسانوں اور روبوٹ ۴۲۰ کے طرزِ حیات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور دونوں کی تباہ کاریاں بھی یکساں ہیں۔

چوتھا ڈراما''بساط''ایک حقیقی شاہکار ہے۔اس کی ضخامت بقیہ تین ڈراموں کے کل صفحات سے تین گنا زیادہ ہے۔اول الذکر معاشرتی کھیلوں سے مختلف یہ سیاسی نفسیات کی کہانی ہے۔اس کے مرکزی کرداروں کا تعلق دو مختلف طبقات سے ہے۔ایک شاہی محل میں پلنے والی شہزادی شذرہ ہے تو دوسرا گلی محلے کا رہنے والا فقیر منش سارب۔جہاں ایک طرف شذرہ کی سوچ اہلِ دربار سے یکسر مختلف ہے تو وہیں سارب اپنے دوستوں اور اہلِ خانہ سے منفرد فکر و نظر کا حامل ہے۔یہ کہانی جہاں محلوں اور بستیوں کے نشیب و فراز بیان کرتی ہے وہیں ان دونوں مقامات پر بسنے والے کرداروں کے قلب و ذہن کے خیالات و جذبات سے بھی روشناس کراتی ہے۔اس کہانی کا سب سے اہم کردار شطرنج ہے جو زندگی کی علامت ہے۔یہی شطرنج کا

کھیل سارب اور شذرہ کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔

انسانی معاشرے کے ظاہر و باطن کو اجاگر کرنے والا یہ کھیل کبھی افراد کی نفسیاتی گتھیاں سلجھاتا ہے تو کبھی نظامِ سیاست کے جبر و استبداد کو بے نقاب کرتا ہے۔ علم و حکمت کے گہرے سمندر سے خوبصورت لعل و گہر نکالنا اور انہیں عام فہم مثالوں کی مدد سے تراش کر نہایت خوش اسلوبی سے اپنی بساط پر سجا دینا باصر کاظمی کا امتیاز ہے۔ باصر کاظمی کی اس خوبی کا اعتراف تمام ہی مبصرین نے کیا ہے۔ اس ڈرامہ کو بلا مبالغہ منظوم ڈرامہ کہا جاسکتا ہے۔ باصر نے بساط کے اندر سے ۴۶ اقتباسات کو علاحدہ کر کے نثری نظموں کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ چونکہ شطرنج کی بازی میں ۶۴ خانے ہوتے ہیں اس لیے انہوں نے ۶۴ پر اکتفاء کیا ورنہ اس ڈراما کے اندر سے باصر بھی با آسانی میر کی طرح ۷۲ نشتر برآمد کر سکتے تھے۔ یہی مکالمے اس ڈراما کا مغز ہیں۔ مطالعہ کے دوران وہ قاری کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں اور خاتمہ کے بعد قلب و ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

افسانہ پڑھنے کے لیے لکھا جاتا ہے جبکہ ڈراما کو کھیلنے کی خاطر ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے۔ بغیر اسٹیج اور زندہ کرداروں کے ڈراما کا تصور محال ہے۔ آج کل ڈراما کے نام پر جو شئے ٹیلی ویژن یا یوٹیوب پر دیکھی جاتی ہے وہ دراصل ڈراما کا عکسِ مجازی ہے۔ مردہ تصاویر کبھی بھی زندہ کرداروں کا نعم البدل نہیں بن سکتیں۔ ڈراما کی تازگی اور برجستگی برقرار رکھنے کے لیے اس کا زندہ ہونا ناگزیر ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ڈراما سے مستفید ہونے کے لیے ناظرین کا ایک خاص وقت میں کسی خاص مقام پر موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ گویا زندگی کی مانند ڈراما بھی زمان و مکان کا پابند ہے۔ جو لوگ اس موقع سے محروم رہ جاتے ہیں وہ ٹی وی یا کمپیوٹر کے پردے پر اسے دیکھ کر یا پھر صفحۂ قرطاس پر پڑھ کر اپنے آپ کو کسی درجہ مطمئن کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود ڈرامے کو لکھنے کے اپنے فائدے ہیں۔ قرطاس و قلم کے توسط سے ڈراما دور دراز علاقوں میں موجود ان لوگوں تک پہنچ جاتا ہے جو بعد کے زمانوں میں بھی اسے کھیل سکتے ہیں۔ ''بساط'' کا شمار یقیناً ان ڈراموں میں ہوتا ہے جو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیے جانے کے مستحق ہیں۔ انگریزی ترجمہ تو خیر ہو چکا ہے لیکن دیگر یوروپی و جنوبی امریکہ میں بولی جانے والی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہونا چاہئے۔ ہندوستان کے مختلف علاقائی زبانوں مثلاً بنگلہ، مراٹھی اور گجراتی میں بھی ڈرامے مقبول عام ہیں اور ان میں سے ہر زبان کے قارئین کی تعداد یوروپین ممالک کی آبادی سے کم نہیں ہے۔ اس طرح ''بساط'' کی رسائی ان شائقین تک ہو جائے گی جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اس ڈراما کو اس وقت تک کھیلیں گے جب تک کہ اسٹیج کی دنیا شاد بادر ہے گی۔ باصر کاظمی قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے

''بساط'' لکھ کر ڈراموں کی دنیا میں آبِ حیات نوش فرمالیا ہے۔

''بساط'' بچھانے کی ترغیب دینے والے مانوس اجنبی سے باصر کاظمی کی ملاقات کو ۴۰ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ''بساط'' کی اولین اشاعت بھی ۲۸ سال پرانی ہو چکی ہے اس لیے اردو ڈرامہ کے شائقین بجا طور ان سے ایک نئی بازی کی توقع اس شعر کے ساتھ کرتے ہیں کہ ؎

رہا تو کر انہیں پھر دیکھ معجزے باصر
جو قوتیں ہیں تیری خاکِ ناتواں میں اسیر

☆☆☆

نامِ کتاب	:	اردو کی شخصی مرثیہ نگاری میں چکبستؔ اور محرومؔ کا حصہ
مصنف	:	ڈاکٹر سید مسعود عالم
قیمت	:	250 روپئے
صفحہ	:	208
سن اشاعت	:	۲۰۱۴ء
مبصر	:	ڈاکٹر شکیل احمد قاسمی

عنوان قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، عام طور پر لوگ مرثیہ کی صنف سے ہی گریز کرتے ہیں کہ ان کی زندگی خود انہیں کرب و بلا میں گھری ہوئی محسوس ہوتی ہے، دوسری بات یہ کہ اگر مرثیہ نے ان کو اپنی طرف آمادہ کیا بھی تو وہ شہدائے کربلا کے مرثیے میں ہر دو اعتبار سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک تو شہدائے کربلا کا مرثیہ مذہبی عقیدے سے جڑا ہوا نظر آتا ہے اور اس کے بعد یہ کہ اس جہت کو شعرا نے جس قدر بلندی عطا کی ہے، شعری سرمائے میں اس کی ہمسری دوسری بیانیہ صنف نہیں کر سکتی۔ بالخصوص اردو ادب میں، انیسؔ، دبیرؔ کے کارنامے کو کسی طرح میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی کارکردگی سے کم نہیں قرار دیا جاسکتا۔ نہ سوداؔ، قلی قطب شاہ، ملا وجہی اور میر حسن سے کم درجے کا ٹھہرایا جاسکتا ہے، لہذا کلاسیکی ادب سے دلچسپی لینے والے اور عصری ادب سے وابستہ سنجیدہ قاری بھی مرثیہ کا نام آتے ہی میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کو ہی اپنے ذہن کے افق پر ہویدا پاتے ہیں۔

مرثیہ ایک صنف ہے جس کا اطلاق کسی کے مرنے پر اس کے اوصاف اور اس سے اپنی وابستگی پر شعری پیرائے میں کیا جاتا ہے، تب رہا کہ موضوع کے اعتبار سے اس میں کسی طرح کی قید و بند نہیں ہے، لیکن مرثیہ کا تعلق شہدائے کربلا سے ہی وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب میں ایسے مرثیوں کی کمی نہیں

جو شخصی طور پر اپنے کسی عزیز، دوست یا کسی رہنما، مفکر اور بڑی شخصیت کے لیے قلم بند کیے گئے ہوں، ہر خاص و عام یہ جانتا ہے کہ غالبؔ نے اپنے بھتیجے عارف کے انتقال پر اس کا مرثیہ لکھ کر شخصی مرثیہ کی داغ بیل ڈالی۔ مگر سید مسعود عالم صاحب کی کتاب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاہ برہان الدین جانم نے سب سے پہلے اپنے والد شاہ میراجی کا مرثیہ لکھا۔ ہر چند کہ شاہ برہان الدین جانم کی تحریروں پر بیجاپوری ادب کا سرنامہ بھی لگا ہوا ہے۔ جب کہ اردو ادب کے طول و عرض میں بیجاپوری، دکنی، شمالی ہند کا ادب، بابا فرید کے عہد اور ان کے گرد و پیش کے ادب کی آمیزش اور ہم آہنگی ہے۔ اس کتاب میں اس کی روداد بھی سیر حاصل انداز میں ملتی ہے۔

ابتدا سے آج تک شخصی مرثیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر مسعود عالم کو بھی یہ احساس ہے کہ اس ضمن میں خاطر خواہ پیش قدمی نہ ہو سکی ہے۔ عصری ادب میں تو شخصی مرثیے کا فقدان نظر ہی آتا ہے۔ جس کی ایک وجہ تو صاف نظر آتی ہے کہ آج ہم لوگ ایک دوسرے سے اس قدر جڑے ہوئے نہیں نظر آتے ہیں، جس قدر آج سے قبل خلوص و محبت اور ایثار و انس کے تقاضوں کے ساتھ ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور ہم قدم نظر آتے تھے، پھر یہ کہ قدروں کی پامالی میں ویسی شخصیتیں سامنے نہیں آ رہی ہیں، جس کا مرثیہ لکھا جائے یا جو آئندہ زمانے تک ہماری زندگی میں اپنی کمی کا احساس دلائیں پھر یہ کہ ہر کوئی شعر گوئی کا فن بھی کہاں سے لائے۔ ایک زمانہ تھا جب قصیدے میں بھی حقیقت پسندی پائی جاتی تھی، عرب کی تاریخ کا ایک واقعہ حالیؔ نے اپنی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے اپنے قصیدے کی فرمائش کی تو صاحب فن نے جواب دیا کہ تم کچھ ایسا کرو کہ ہم تمہارا قصیدہ لکھیں۔ حالیؔ کے الفاظ ہیں۔

''ایک بار بنی تمیم نے سلامۃ بن جندل سے جو ایک جاہلی شاعر ہے۔
درخواست کی کہ ''مجدنا بشعرک'' یعنی تو اپنے مدحیہ اشعار سے ہماری عزت بڑھا اس
نے کہا ''افعلوحتی اُقول'' یعنی تم کچھ کر کے دکھاؤ تا کہ اس کو بیان کروں'' (ص:۱۰۳)

یہ کتاب ڈاکٹر مسعود عالم کا ایک مقالہ ہے جس کے لیے پروفیسر عبدالواسع نگراں رہے ہیں، اس بات کا ذکر صاحب کتاب نے صفحہ بارہ پر کیا ہے، مقالہ نگار کی نگاہ میں چکبستؔ اور محرومؔ کے یہاں بھی سب سے زیادہ شخصی مرثیے ملتے ہیں اور دونوں شعراء کے مراثی فن کے اعتبار سے بھی عمدہ ہیں، لہذا انہوں نے ایک طرف جہاں ان حضرات کے یہاں پائے جانے والے مرثیوں پر خاطر خواہ نظر ڈالی وہاں ان کا مقصد یہ بھی رہا کہ دونوں کے تقابلی مطالعے کیے جائیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''یہی سبب ہے کہ اس خصوصی تناظر میں خاکسار نے ان کے تقابلی مطالعے کا قصد کیا'' (ص:۴۷)

اس بیان سے قبل سید مسعود عالم ''حرفے چند'' کے تحت لکھتے ہیں کہ

''.....میں نے محسوس کیا کہ چکبستؔ اور محرومؔ ایسے شعرا ہیں جو اس
میدان میں جداگانہ مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے شخصی مرثیہ نگاری کو صنفی طور پر
برتنے کی کوشش کی ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے رثائی نظموں کے تناظر میں ان
دونوں کے تقابلی مطالعے کا منصوبہ بنایا'' (ص۱۲)

کتاب کے لیے تقابلی مطالعہ کا مقصد اور منصوبہ بنایا گیا، لہذا اس کتاب کے باب چہارم کا عنوان بھی یہی ہے جو صفحہ نمبر 182 سے صفحہ نمبر 194 تک یعنی تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، جو اس کتاب کا ایک اہم باب ہے، جب کسی چیز کا جائزہ لیا جاتا ہے تو تقابلی امر کو ملحوظ رکھنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کا اعتراف تقابلی جائزے کی روح سے لگایا جا سکتا ہے، جہاں انہوں نے چکبستؔ اور محرومؔ کے فن سے بحث کی ہے، جب کہ ''اردو کی شخصی مرثیہ نگاری میں چکبست اور محروم کا حصہ'' کے عنوان سے بھی ایک باب مختص کیا گیا ہے۔ جو اس کتاب کا عنوان بھی ہے، یہ باب صفحہ 196 سے 198 یعنی تین صفحات پھیلا ہوا ہے، چونکہ اس کتاب میں دو الگ الگ باب بنا کر چکبستؔ اور محرومؔ کے فن پر الگ الگ سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، اس لیے یہ آخری باب ''شخصی مرثیہ نگاری میں محرومؔ اور چکبستؔ کا حصہ'' تمام مطالعہ سے کشید کیے گئے عطر کی مانند تین صفحات پر مشتمل اپنی معنویت کے لیل و نہار کو روشن کر رہا ہے۔

چکبست اور محروم کے جدا جدا باب میں فن کا دائرۂ عمل واضح کرتے ہوئے دو شعرا کے شخصی مرثیے پر مطمئن کرنے والی بحث ملتی ہے۔ ان شعرا کے نمونۂ کلام کو پیش کر کے قاری کو سیر کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ جہاں تک شخصی مرثیے کے خد و خال اور اس کے تنقیدی پیرائے کی بات ہے تو وہ ان کے پہلے باب کے مطالعے سے ظاہر ہو جاتا ہے، باب اول ''اردو میں شخصی مرثیہ نگاری اور تہذیبی روایت'' کے عنوان سے اپنا بھرپور تاثر پیش کر رہا ہے، جس کے اندر مرثیہ، اس کی روایت، شخصی مرثیہ اور اس کی روایت مع خد و خال اور اب تک جن لوگوں نے شخصی مرثیے لکھے، سب کا ذکر بہ خوبی ملتا ہے، جس نے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں چار چاند لگا دیا ہے، اس کی سب سے بڑی خوبی سید مسعود عالم کا اسلوب نظر آتا ہے۔ پوری کتاب کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے کتاب میں جس ذہانت اور فطانت کا ثبوت دیا ہے وہ ایک کہنہ مشق ادیب کا ہی حصہ ہے۔ اسلوب میں نکھار بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ تحریر اگر بول نہ پڑے تو لکھنا لکھانا بے لطف ہی رہ جاتا ہے، ان کے آبدار اسلوب کی ایک مثال دیکھی جا سکتی ہے۔ ''حرفے چند'' کے عنوان سے لکھتے ہوئے صفحہ نمبر گیارہ کی یہ تحریر قابل تعریف ہے، لکھتے ہیں۔

''جس شخص کی موت کا غم جھیلتے ہوئے غالبؔ قیامت کے دور سے

گزرے وہ مر کر بھی زندہ نہ ہو جائے اور حیات جاوداں حاصل نہ کرے تو غالبؔ کیا
اور اس کا اعجاز سخن کیا۔'' (ص:۱۱)

ہمارے یہاں قارئین کا ایک تاثر یہ بھی سامنے آیا ہے کہ وہ کتابوں میں حوالوں سے گھبراتے ہیں، مگر تحقیقی مضامین میں اس کی کمی ہی اس کی کجی ہو جائے گی، دیکھنا یہ ہے کہ جتنے حوالے اس کتاب میں آئے وہ کس نوعیت کے ہیں۔ سید مسعود عالم نے تمام حوالے معتبر ادیبوں اور مستند کتابوں سے لیے ہیں۔ اس سے اس کی افادیت اور اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ نہ تو چکبستؔ محرومؔ سے بڑے شاعر ہیں نہ محرومؔ چکبستؔ سے بلند بانگ رہے ہیں، ایسے میں ان دونوں کا مطالعہ تقابلی انداز سے کرنے کا عزم وارادہ ہی اپنے آپ میں قابل تعریف ہے، مصنف انصاف کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے محرومؔ کو شخصی مرثیہ نگاری میں ایک گراں قدر فن کار کا درجہ دیتے ہیں، تو چکبستؔ کے شعری اوصاف بیان کرتے ہوئے چکبست کی تحسین میں حرف آخر بھی لکھ جاتے ہیں البتہ فیصلہ محرومؔ کے حق میں جاتا ہے کہ یہ موصوف کا جانچا پرکھا ہوا فیصلہ ہے، کیوں نہ ہو کہ محروم نے جس قدر مرثیے لکھے وہ کسی اور کا حصہ نہ ہو سکا۔ اپنی باتوں کو دوٹوک انداز میں لکھتے ہوئے سید مسعود عالم تحریر کرتے ہیں۔

''اس مقالے کا چوتھا باب محرومؔ اور چکبستؔ کے تقابلی مطالعے سے متعلق ہے، اس باب میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، تاہم دونوں شاعروں کی بنیادی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس باب میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ چکبست کا کام اہم ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی دعوی کیا گیا ہے کہ محروم کا کام اہم تر ہے۔'' (ص:۱۵)

فاضل مصنف نے جگہ جگہ چکبست کو محروم پر افضلیت دی ہے، لیکن محروم کے مکمل مطالعے کے بعد فیصلہ محروم کے حق میں جاتا ہے، ایک نمونہ تو درج بالا اقتباس میں ملتا ہے، اور ایک نمونہ یہ ہے، باب چہارم ''محروم اور چکبست - ایک تقابلی مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''کچھ ایسی ہی کیفیت تلکؔ کی وفات سے متعلق محرومؔ اور چکبستؔ کی نظموں میں ہے، محروم نے اس موضوع پر کئی نظمیں کہی ہیں، لیکن کسی میں بھی وہ زور بیان پیدا نہیں ہو سکا ہے جو چکبست کا طرۂ امتیاز ہے۔'' (ص:94-193)

درج بالا اقتباس میں کوئی بات سہو قلم کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ چکبست اور محروم کے مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ فیصلہ لینے میں پیش وپس پیدا کرتا ہے اور کہیں لیے گئے فیصلوں میں تزلزل پیدا کرتا ہے۔ یہاں قاری کو

اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے اور محروم کے ساتھ ساتھ چکبست کے مطالعے کا ذوق اپنی طرف آمادہ کرتا ہے۔ اس اعتبار سے مسعود عالم کی کتاب جہاں موضوع پر سیر حاصل تسکین مہیا کراتی ہے وہیں قارئین کے ذوق مطالعہ کو مہمیز لگاتی ہے۔ ہر دو صورت میں ڈاکٹر سید مسعود عالم قابل ستائش ہیں

پروفیسر علیم اللہ حالی کا یہ اعتراف سند کا درجہ رکھتا ہے ''ڈاکٹر سید مسعود عالم نے اس نوع کے مراثی کے تدریجی ارتقاء کا عالمانہ اور تجزیاتی جائزہ لیا ہے'' ڈاکٹر منظر اعجاز کا یہ خیال بھی درست کہ ''شخصی مرثیہ نگاری کی روایت کو جس طرح سید مسعود عالم نے اس کتاب میں سمیٹا ہے اس سے موضوع کے حدود میں کافی وسعت اور کتاب کی قدر و قیمت اور وقعت میں کافی اضافہ ہوا ہے''

ڈاکٹر سید مسعود عالم نے مشکل موضوع پر تحقیق وتنقید کے معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذمہ دارانہ کام کیا ہے، معتبر شخصیات کے اعترافات فاضل مصنف کے لیے خراج تحسین ہیں، سنجیدہ قاری کو موصوف کی نگارشات، مضامین اور تصنیفات کا آئندہ بھی انتظار رہے گا، اب جبکہ انہیں فرصت میسر ہے اور اپنی تعلیمی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں، اپنی معلومات، مشاہدات وتجربات سے دوسروں کو فیض پہنچاتے تو اچھا ہوتا۔

◂◂ ● ▸▸

قطرہ قطرہ احساس اور مردم گزیدہ کے بعد

اقبال حسن آزاد

کی

تنقیدی کتاب

نثری اصناف ادب اور طنز ومزاح کی روایت

شائع ہو چکی ہے

صفحات 152 قیمت 300/

ملنے کا پتہ

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ، مونگیر

''ثالث'' پر تبصرے

● **محمد حامد سراج**
(میاں والی پاکستان)

ثالث کا سنگ میل نمبر ۶

فیس بک پر ''ثالث'' کی اشاعت کی خبر مل جانے کے بعد انتظار سوا ہو گیا۔ کیوں کہ انٹرنیٹ کی سہولت کے ساتھ لیپ ٹاپ' کمپیوٹر' ٹیب کی سہولت کے باوجود جو لطف کتاب ہاتھ میں لے کر ورق الٹنے اور صفحہ بہ صفحہ مطالعے میں ہے وہ ان جدید ترین مشینوں میں نہیں۔ صبح کا وقت ہے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے پرندوں کی آوازیں سماعت تک اپنی کہانی کہہ رہی ہیں۔ ہزاروں کتابوں کے درمیاں بیٹھا میں خاموشی سے ہم کلام سوچ رہا ہوں کہ معلوم ادبی جرائد کی تاریخ میں پرنٹ میڈیا کی سہولت کی وجہ سے یہ ایسا دور ہے جس میں تو تر سے ادبی جرائد سامنے آ رہے ہیں۔ لیکن معیار جو بنیادی اکائی ہے وہ ناپید ہے۔ زیادہ تر جرائد شوق ناموری میں نکالے گئے ہیں۔ ثالث ثابت قدمی سے اپنے سفر پر گامزن ہے۔ یہ شمارہ کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اردو زبان و ادب کے معتبر ترین ادباء نے اس کو لائق اعتناء جان کر اپنی تحاریر سے اسے اعتبار دیا ہے۔ قاری کو شموئل احمد کی آپ بیتی ''اے دل آوارہ'' کا انتظار تھا۔ لیکن وہ ناول کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ صفدر امام قادری نے اس کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ کتابوں پر تجزیئے معمول کی بات ہے لیکن صفدر امام قادری صاحب کے اس تجزیئے میں جو خوبی سامنے آئی ہے کہ انہوں نے ''اے دل آوارہ'' کے مطالعے کے بعد شموئل احمد کی شخصیت ان کے افسانوی اور تخلیقی سفر پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ناول کی خامیاں خوبیاں کھول کر پرت در پرت بات دلیل سے کی ہے۔ کتاب میں موجود کمزور جملوں تک کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے ''مجھے یقین ہے کہ اردو ادب کے قارئین شموئل احمد کی اس خود نوشت کو بہ نظر توجہ نہیں دیکھیں گے اور یہ کتاب اردو کی بہت سی کتابوں میں گم ہو کر رہ جائے تو کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ قادری صاحب کے آخری جملے سے اتفاق ممکن نہیں ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اردو ادب کا وہ آفتاب جہاں تاب ہیں جن کے تخلیقی سفر کی تحسین کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ثالث کی خوش بختی کی علامت ہے کہ انہوں نے اسے اپنی تحریر سے اسے ثمر بار کیا۔ ''شمس الرحمٰن فاروقی'' کے تبصرے اس شمارے کا اعزاز ہیں۔ انہوں نے انیس انصاری کی نئی کتاب ''درد ابھی محفوظ نہیں'' کے ساتھ نیر عاقل مرحوم نے اپنی زندگی میں ''گلستان'' کا جو منظوم ترجمہ کیا تھا اس کا تعارف کراتے ہوئے جلد اس کی اشاعت کی خوش خبری سنائی ہے۔ اردو گھر'' کی مساعی سے بہت جلد یہ علمی جوہر زیور طبع سے آراستہ ہو کر سامنے آ رہا ہے۔ فاروقی صاحب نے یاسمین حمید کی ''پس آئینہ'' کے ساتھ کشمیری لال ذاکر کے افسانوی مجموعے ''تجھے ہم ولی سمجھتے'' کو اعتبار بخشا ہے۔

اس شمارے میں آٹھ افسانے شامل ہیں۔

ڈاکٹر نگہت نسیم نے ''آلو قیمہ'' ایسا افسانہ تراش کر قاری کو اشک بار کر دیا۔ افسانہ تخلیق کار کے باطن سے پھوٹتا ہے۔ کرداروں کی باطنی کیمسٹری کو قلم سے پینٹ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ نگہت نسیم نے یہ کمال کر دکھایا ہے۔ ایک نفسیاتی مریضہ اور محبت سے محروم بچوں کے دمیان سسکتی کراہتی کیفیات کو قلم کی آنکھ سے مصور کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ ممتاز رفیق کا افسانہ ''آدھا عشق'' کمال بنت کاری کے باوجود افسانہ نہیں بن پایا۔ افسانے میں ایک نہیں کئی سقم ہیں۔ کردار واحد متکلم جو ایک قلم کار ہے وہ ایک مصورہ کے عشق میں گرفتار ہے۔ دونوں کے درمیان تعلقات استوار ہوتے ہوتے بے تکلفی کی حدود کو چھونے لگے۔ ایک خوبصورت عورت نے اپنا مہکتا بدن اس پر انڈیل دیا۔ مصورہ کے گھر مکمل تنہائی' کافی کے مگ' دونوں کا جڑ کے بیٹھنا' بوس و کنار' انتظار میں سلگنا' پھر بھی لہریں لیتے سمندر کی پر شور موجوں سے بچ جانا' عجیب فلسفہ ہے جو میری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ مرد کی سرشت ہی نہیں۔ مرد فاعل ہے عورت مفعول ہے۔ افسانہ نگار نے افسانے میں تخلیق پر ارتکاز کی بجائے اپنا دامن بچایا ہے۔ کہ کوئی چھینٹا ان کے سفید لباس پر نہ آ گرے۔ کوئی جملہ منٹو سے ادھار مانگ لیتے تو افسانہ بن جانا تھا۔ اور عقل اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتی کہ کردار اگر اتنا ہی نیک' پارسا' اور مضبوط کردار کا مالک تھا تو اس نے مصورہ سے روابط کیوں استوار کئے۔ اس کے نسوانی اور جنسی جذبات کو کیوں انگیخت کیا اور اسے تشنہ چھوڑ کے فرار ہو گیا۔ کردار کا یہ کہنا کہ ''میں موتی کو آب سے محروم نہیں کر سکتا'' تو سوال یہ ہے کہ اتنے دنوں وہ موتی سے کیوں کھیلتا رہا۔ وہ دن جب وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر اس کے ساتھ تھا۔ ''میں نے ہاتھ چھڑا کر اسے اپنی اور کھینچ لیا۔ وہ بھی پھولوں سے لدی مہرباں ڈالی کی طرح میری جھولی میں آ گری۔ ہم پر دیر تک بے خبری کا یہ عالم طاری رہا''۔ جنسی موضوعات کو

تخلیقی سطح پر نبھانا ہر کس وناکس کے بس کا روگ نہیں۔

م۔ص۔ایمن کا افسانہ پڑھ کے اس لئے لطف آیا کہ ایک عرصہ بعد سادہ اور اصلاحی افسانہ پڑھا۔اب ایسے افسانے کم کم لکھے جاتے ہیں۔بہت محنت سے تراشا گیا ''کیمیا'' قاری کو مایوس نہیں کرتا۔بہت اچھا لگا۔کہانی بھی ہے' مکالمے' اور بات کرنے کا انداز سیدھا سادہ دل میں اترنے والا' کرداروں کے ساتھ بھی افسانہ نگار نے انصاف کیا ہے کہ وہ قاری سے مانوس ہو کر ہم کلام ہو گئے۔

شاہد جمیل احمد میرے دوست ہیں۔''بھوری کتیا'' کی علامت سے انہوں نے افسانے کو معنویت دینے کی اچھی کوشش کی ہے لیکن موضوع وہی جو صدیوں سے برتا جا رہا ہے۔غیرت کے نام پر قتل ،منتقم دماغ جن کی کھوپڑیوں میں انتقام کی ہنڈیا کھولتی رہتی ہے۔شاہد جمیل احمد ہم آپ کے قلم سے بڑے موضوع پر ایک بڑے افسانے کے منتظر ہیں۔عبدالغنی شیخ نے ''صرف چند کلومیٹر دور'' کی مسافت طے کی ہے۔افسانے کی قرات کے دوران میں تھوڑا اکتایا کہ دیار غیر جا بسنے والی ناخلف اولاد کے والدین کا یہ نوحہ کوئی نئی بات نہیں۔لیکن افسانہ نگار نے ''عنوان اور اختتام'' کے جوڑ بٹھا کر اسے ایک عمدہ افسانے میں ڈھال دیا۔ہمارا اندرونی خاندانی ڈھانچہ توڑ پھوڑ کا شکار ہے۔نفسا نفسی ہے' مادیت کا دیو' اخلاقیات' روایات' رواداری' رکھ رکھاؤ کو نگل گیا ہے۔طلعت زہرا آپ کو افسانہ تراشنا اور موضوع نبھانا آتا ہے۔اس موضوع پر گزشتہ ایک عرصہ سے جو افسانے میری نظر سے گزرے ہیں ان پر میرے شدید تحفظات ہیں۔لیکن اس نازک ترین موضوع پر یہ پہلا افسانہ ہے جس پر میں آپ کو داد دیتا ہوں۔تہذیب کی ساری سیڑھیاں اتر کر جس طرح ریمنڈ نے رشتوں کی حرمت کو پامال کیا' مسل ڈالا' اس کریہہ انسان کے کردار کو آپ نے افسانوی سطح پر نبھا دکھایا ہے۔افسانے پر آپ کی محنت روشن نظر آ رہی ہے۔محمد علم اللہ کا افسانہ عمدہ ہے۔ہمارے یہاں علی اکبر ناطق کو متنازع نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔کہنہ اور نامور افسانہ نگار اسے سرے سے افسانہ نگار ہی تسلیم نہیں کرتے۔کچھ کا کہنا ہے کہ وہ کیا جانے افسانہ کیا ہے۔۔۔؟نظم اس کی تخلیقی سطح پر توانا شمار کی جاتی ہے۔لیکن یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔کوئی نئی بات نہیں۔میں نے علی اکبر ناطق کو مکمل پڑھا ہے۔فن کا قدرداں ناقد کبھی نہیں ہو سکتا۔فن کا اصل پیمانہ قاری ہے۔جو اس میزان پر پورا اترے اس کا فن لازوال ہے۔میں ایک قاری کی حیثیت سے سمجھتا ہوں کہ علی اکبر ناطق بہت عمدہ افسانہ نگار ہے۔وہ علامت کی اندھی پیچ در پیچ وادیوں میں قاری کو بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑ دیتا۔اس کا قلم' اس کی تحریر رواں ہے۔اس کی کہانی میں جھرنوں کا بہاؤ ہے۔اس کا افسانہ تھکے ہوئے ذہن کو مسرت کی نوید سناتا ہے۔''سیاہ ٹھپہ'' میری

بات کی دلیل پر پورا اترتا ہے۔میں قد آور افسانوں نگاروں کے افسانے انہماک اور مکمل یک سوئی کے ساتھ تنہائی میں پڑھتا ہوں۔اور علی اکبر ناطق ان میں شامل ہے۔

اقبال حسن خان میرے بزرگ ہیں' دوست ہیں۔ان کے ناول ''راج سنگھ لاہوریا'' کا پہلا باب انتہائی کمزور ہے۔ناول کے کردار واحد متکلم اور کلثوم کی محبت' چھتوں پر چھپ کے ملنا' وعدے وعید' یہ باتیں یہ کہانیاں تو بہت پرانی ہیں۔یہ تو ممتاز مفتی کے ساتھ سینکڑوں تخلیق نگار برت چکے۔ناول میں جو تاریخی ٹچ ہے اس میں بھی کوئی تخلیقیت نہیں۔یہ ٹچ تو ان کے ناول ''گلیوں کے لوگ'' میں برتا جا چکا۔اب مکمل ناول سامنے آئے تو دیکھا جائے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

ارشد جمیل کا مضمون ''شمس الرحمٰن فاروقی :ایک مختصر جائزہ'' انتہائی تشنہ ہے۔مضمون کے مندرجات سے میں اتفاق نہیں کرتا۔یہ مضمون تو کسی درسی کتاب کے تقاضے بھی پورے کرتا نظر نہیں آتا۔مدیر کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنی تنقیدی بصیرت پر چھان پھٹک کے بعد تخلیقات کو جگہ دے۔اقبال حسن آزاد صاحب آپ کو شمس الرحمٰن فاروقی ایسی عبقری شخصیت پر یہ مضمون شامل نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

سلیم خان نے پیغام آفاقی کے ناول ''پلیتہ'' پر اختصار کے باوجود ناول کی پرتیں کھولی ہیں۔اور ان کے ناول ''مکان'' کے ساتھ موازنہ کر کے اپنے مضمون کو بامعنی کیا ہے۔ان کے اس تبصرہ پر میں نے رانچی اپنے دوست غالب نشتر کو یہ دونوں ناول بھجوانے کی درخواست کی ہے۔

مصطفیٰ کریم نے ''پیارے بھائی سید ارتضیٰ کریم کی یاد میں'' میں یادوں کے ساتھ درد سمو دیا ہے۔میں مطالعے کے بعد بہت دیر اداس رہا۔مجموعی طور پر ثالث کا یہ شمارہ اردو ادب کے نئے روشن مستقبل کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ایک ڈر' جو ہمیشہ سے میری نفسیات کا حصہ ہو گیا ہے کہ اللہ نہ کرے کہیں مالی مسائل کی وجہ سے یہ جریدہ بند نہ ہو جائے۔ایک عاجزانہ سی درخواست ہے کہ اب اقبال حسن آزاد صاحب دوست داری کو مکمل طاق پر دھر دیں اور شمارہ نمبر سات سے اس کا معیار اور کڑا کر دیں۔معیار ہی وقار اور دوام کی علامت ہے۔سینکڑوں امثال ہیں ایک پر اکتفا کر کے اپنا تبصرہ سمیٹتا ہوں۔سراج منیر مرحوم نے ادبی جریدہ ''روایت'' نکالا۔جس کے چار شمارے شائع ہوئے۔وہ آج بھی میرے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔جن پر مجھے فخر ہے۔

☆☆☆

● ڈاکٹر یحییٰ صبا
پروفیسر، کڑوری مل کالج، دہلی یونیورسٹی

اقبال حسن آزاد اور اردو سہ ماہی 'ثالث'

ثالث، ۱۵ اپنے قیمتی اور منفرد مشمولات کی وجہ سے خاصا دلچسپ اور لائق مطالعہ رسالہ ہے۔ اس کے مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد ایک معروف افسانہ نگار اور افسانہ کے اچھے پارکھ ہیں۔ ان کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہتی ہے کہ اردو افسانہ کے حوالہ سے کچھ نئی باتیں سامنے آئیں۔ آج اردو افسانہ میں نئے سماج کے تعلق سے کن سوالات کو اُٹھایا جا رہا ہے، معاشرہ کی عکاسی کس طرح کی جا رہی ہے اور اردو افسانہ میں داخلی وخارجی سطح پر کیا کیا تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں؟ ان تمام پہلوؤں پر اقبال حسن آزاد برابر غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور ایسی سوچ کے حامل افراد کا وہ والہانہ استقبال بھی کرتے ہیں۔

'اداریہ' میں رسالہ کے ایک سال کے مکمّل ہونے اور دوسرے سال میں داخل ہونے تک، اس کی اشاعت کے سلسلہ میں جن مرحلوں سے گذرنا پڑا ہے اور جن تلخ وشیریں تجربات کا سامنا ہوا ہے، ان کی طرف ہماری توجہ مبذول کی گئی ہے۔ مہمان اداریہ ''اردو افسانے کا مستقبل.....عالمی تناظر میں'' کے عنوان کے تحت نورالعین ساحرہ نے موجودہ عہد میں اردو افسانہ کی صورتِ حال سے بحث کرتے ہوئے، اس کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ یہاں انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اردو افسانہ فکری وفنّی سطح پر جس طرح ترقی کر رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے اس کا مستقبل کافی تابناک نظر آتا ہے۔ اس رسالہ میں ادارہ کی طرف سے قلم کاروں کا مختصر تعارف بھی شامل ہے۔ اداریوں کے بعد حمد اور نعت کو شامل کیا گیا ہے۔ ادبی رسالہ میں حمد اور نعت کی شمولیت قابلِ داد ہے یا محلِّ نظر، اس پر علمائے ادب کا مختلف ردِّعمل رہا ہے۔ غزلوں اور نظموں کا حصّہ خاصا دلچسپ ہے۔ آج بھی ایسی خوبصورت غزلیں کہی جا رہی ہیں اور فکر انگیز نظمیں لکھی جا رہی ہیں جو دل ودماغ دونوں کو بیک وقت متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہاں جتنی بھی غزلیں اور نظمیں ہیں، انھیں میں منتخب شاعری کے زمرہ میں رکھنا مناسب سمجھتا ہوں۔ علی اکبر ناطق پاکستان کے کہنہ مشق اور پختہ شعور کے حامل شاعر ہیں۔ حالیہ برسوں میں برِّصغیر ہندو پاک میں ان کی نظموں نے باذوق قارئین کو بے حد متاثر کیا ہے۔ یہاں بھی ان کی نظمیں 'دامنِ دل می کشد' کے مصداق کی حامل ہیں۔ ایوب خاور اور اقبال حسن آزاد کی نظمیں بھی نئے عہد کے سیاق میں کافی اہم ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے بعد

اردو افسانہ پر مذاکرہ ہے۔ اس کا عنوان ''کیا اردو افسانہ نگاروں کے پاس نیا لکھنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے؟'' ہے۔ اس عنوان کے تحت اردو افسانہ کے حوالہ سے شرکاء نے بڑی معنی خیز بحثیں کی ہیں اور انتہائی اہم اور فکر انگیز باتیں سامنے آئی ہیں۔ یہاں آج کے اردو افسانہ کے کیف وکم کو بھی اُجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اردو افسانہ پر یہ مذاکرہ بہت ہی جاندار اور غور وفکر کا متقاضی ہے۔ 'یادِ رفتگاں' کے تحت ڈاکٹر منظر اعجاز نے شمیم فاروقی کی شخصیت وشاعری کے منفرد پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

مضامین کے تحت کُل سات مضامین شامل ہیں۔ ان میں پہلا مضمون ''فطرت اور حقیقت کا شاہکار.....شکست'' از پروفیسر علی احمد فاطمی، کافی عمدہ ہے۔ یہاں فاطمی صاحب نے کرشن چندر کے ناول ''شکست'' کا مطالعہ جس طرح کیا ہے، وہ ہمیں کئی زاویوں سے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ انسان کے فطری جذبات کو سماجی رسم ورواج کس طرح کچلتے ہیں اور ایسے میں انسان کی کیا نفسیاتی صورتِ حال ہوتی ہے؟ اس پہلو پر مضمون میں بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''ادب کا فلسفۂ نجات'' کے عنوان کے تحت منی بھوشن کمار نے رسالہ 'آمد' کے مدیر خورشید اکبر کے تصورِ فلسفۂ نجات کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ ''ان کا فلسفۂ نجات کسی ''رام راجیہ'' کے تصور کے موافق ہے جس کے خدوخال اب تک کسی پر واضح نہیں ہیں'' (ص،۸۲) ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا مضمون ''بلند اقبال اور ''فرشتے کے آنسو'' بہت محنت سے لکھا گیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے نئے اُبھرتے ہوئے افسانہ نگار ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوں کے موضوعات اور ان کی افسانہ نگاری کے فکری وفنّی زاویوں پر مدلّل ومفصّل انداز میں بحث کرتے ہوئے اردو افسانہ میں ان کی اہمّیت اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ ویسے ہمایوں اشرف ایک سنجیدہ فکشن ناقد ہیں۔ یہ مضمون بھی ان کی سنجیدہ تنقید کی ایک مثال ہے۔ دیگر مضامین ''منفرد لب ولہجے کا شاعر.....سرور جہاں آبادی'' از ڈاکٹر ندیم احمد، ''کشمیر کے معاصر اردو افسانوں کے تخلیقی رویے'' از ڈاکٹر ریاض توحیدی، ''افسانہ میں حقیقت نگاری اور فحش نگاری کا فرق'' از ڈاکٹر نگہت نسیم اور ''اردو دنیا کا ارتقاء اور جدید ٹکنالوجی'' از احسان اللہ بلوچ، بھی کافی موثر ہیں۔ یہ مضامین ہماری فکر وفہم کو نئے زاویوں سے ہمکنار کرتے ہیں اور نیا ذائقہ عطا کرتے ہیں۔ 'انتخاب' کے تحت احمد ندیم قاسمی کا افسانہ 'گنڈاسا' ہے۔ یہ احمد ندیم قاسمی کا نمائندہ اور خوبصورت افسانہ ہے۔ اس کا تجزیہ ڈاکٹر افشاں ملک نے کیا ہے۔ یہ تجزیہ بھی بہت خوب ہے۔ افسانوں کے حصّے میں کُل گیارہ افسانے ہیں۔ یہ سارے افسانے جدید عہد کے سیاق میں لکھے گئے ہیں اور جدید موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان افسانوں کو بھی جدید منتخب افسانوں کے زمرہ میں رکھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان افسانوں میں موجودہ عہد کے سنگین وپیچیدہ مسائل کو اس طرح سمویا گیا ہے کہ ان میں عہدِ حاضر کی روح

کلبلاتی نظر آتی ہے۔ان میں زمانہ حاضر کے درد وکرب اور دھڑکن کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ افسانے آج کے مسخ شُدہ حالات کی تصویریں ہیں۔ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے بھی یہ افسانے بے حد متاثر کرتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد ایک خوشگوار فنّی ذائقہ کا احساس ہوتا ہے اور یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ یقیناً اردو افسانہ کا مستقبل تابناک ہے جیسا کہ مہمان اداریہ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ثالث، ۵ کے مطالعہ کے بعد جو تاثر اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے مشمولات متنوّع اور معیاری ہیں۔جیسا کہ گذشتہ شماروں کے مشمولات رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اتنے قلیل عرصہ میں اہلِ ادب کے درمیان اس رسالہ کو نمایاں انفراد واختصاص حاصل ہوا ہے۔ دراصل اقبال حسن آزاد تخلیقات ومضامین کے انتخاب میں انتہائی دیدہ ریزی کا ثبوت دیتے ہیں۔ان ہی کی سنجیدہ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ 'ثالث' کو باذوق قارئین کے درمیان اتنی جلد ایک معیار ووقار حاصل ہوا ہے۔وہ جس ادبی لگن اور تن دہی سے 'ثالث' کو قارئین کے درمیان پیش کررہے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے اس کے تابناک مستقبل کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ہمیں اُمّید ہے کہ یہ رسالہ اسی طرح تخلیقی وتنقیدی رنگارنگیوں کے ساتھ منظرِ ادب پر نمودار ہوکر تشنگانِ ادب کو سیراب کرتا رہے گا۔

☆☆☆

● صابر حسن رئیس

ثالث کا شمارہ۔۶ ملا۔حسب سابق یہ شمارہ بھی دیدہ زیب سرورق سے لیکر شعری ونثری تخلیقات اور مضامین تک آپ کی جمالیاتی حِس اور حسنِ انتخاب کا آئینہ ہے۔آپ نے اداریے میں جن مسائل پر روشنی ڈالی ہے، اُن میں سب سے زیادہ فکر انگیز مسئلہ بچوں کو اردو کی طرف راغب کرنے سے متعلق ہے۔اگر ہمیں اپنی آئندہ نسل میں اردو کے لئے دلچسپی پیدا کرنی ہے تو موجودہ حالات پر بین کرنے کے بجائے کوئی ٹھوس لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔اس کے علاوہ نوجوان نسل میں سے جن میں تخلیقی جوہر تو ہے، لیکن زبان وادب کے مطالعہ کی ضرورت کا احساس نہیں ہے، ان کو بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے مطالعے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلانا ہوگا۔ یہ کام سیمیناروں اور کانفرنسوں کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔اسے تو مقامی سطح پر منصوبہ بند طریقے سے انجام دینا ہوگا۔

حالانکہ آپ نے دوسو چوبیس صفحات میں سے شعری تخلیقات کو صرف سولہ صفحات ہی دئے ہیں، لیکن باقی مشمولات کو پڑھکر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ تو ہونا ہی چاہئے تھے۔مضامین میں بھی تقریباً سب

ہی معیاری ہیں۔فرداً فرداً ہر ایک پر اظہارِ خیال کرنا اس مختصر تبصرے میں نہ تو ممکن ہے، نہ مجھے خود پر ایک عام قاری سے زیادہ کچھ ہونے کا گمان ہے۔ پرانے اور ماہر قلمکاروں کے مضامین میں فراہم کردہ معلومات اور ان کے اسلوبِ نگارش سے کچھ سیکھنا اور نئے قلمکاروں کی تحریروں میں ان کے تابناک مستقبل کے امکانات کو پاکر خوش ہونا، ایک قاری کی حیثیت سے میرا یہی مزاج ہے۔

جہاں تک شروع سے لے کر اب تک کے سبھی شماروں میں شامل افسانوں کا تعلق ہے، یہ افسانوی ادب پر آپ کی گہری تنقیدی نظر کا ہی کمال ہے کہ ''ثالث'' کے قارئین کو ایک ہی شمارے میں اتنی بڑی تعداد میں اعلیٰ درجے کے افسانے پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔مجموعی اعتبار سے ''ثالث'' کا یہ شمارہ بے حد قابلِ تعریف ہے، جس کے لیے آپ کے ادارے کے جملہ اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آخر میں نہایت ادب کے ساتھ ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔نثر ہو شاعری، اگر اُس میں کمپوزر کی غلطی سے، یا پروف ریڈر کی لاپروائی سی کچھ املا کی غلطیاں در آتی ہیں تو وہ قلمکار کے لیے اکثر دل آزاری کا باعث ہوتی ہیں۔اور اس دل آزاری کی شدت اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب اصل لفظ کی جگہ آنے والا لفظ مطلب کو بدل دے۔

☆☆☆

● نسترن احسن فتیحی

میرے ہاتھ میں ثالث کا شمارہ نمبر ۶ ہے اور میں اس پر اپنے تاثرات قلم بند کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اور یہی فرق ہے ہم میں اور اقبال حسن آزاد صاحب میں کہ جب تک ہم ثالث کے ایک شمارے پر اپنے سہ حرفی تبصرے کو بھی مکمل نہیں کر پاتے وہ ایک پورا شمارہ تزئین اور اشاعت کے مشکل تر مراحل سے گزار کر ہمارے ہاتھوں تک پہنچوا دیتے ہیں. زیرِ نظر شمارہ بھی فنی اور تخلیقی اعتبار سے اپنے سابقہ معیار پر قائم ہے اور اقبال حسن آزاد صاحب نے معیاری مضامین، افسانوں نظموں اور غزلوں کو اس کے اوراق پر نگینے کی طرح سجا کر اسے تحفۂ خاص بنا دیا ہے۔اس کے اداریے میں آپ شعر وادب کے مطالعے کو ایک تہذیبی عمل گردانتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہی عادت انسان کو انسان بناتی ہے اور شائد ان کا یہی جذبہ انہیں اردو ادب کی اس بے لوث خدمت میں مشغول رکھتا ہے اور وہ بغیر کسی مفاد کے ہر نا مساعد حالات میں بھی اس کی اشاعت کے کام سے جڑے ہیں۔اور کوئی بھی طوفان ان کے اس ارادے کو متزلزل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا اور صرف دوسال کے عرصے میں انہوں نے ''ثالث'' کو صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی رسالے کے طور پر شہرت دلا دی ہے، اور یہ دنیا کے ہر گوشے میں بروقت پہنچتا ہے۔اس

شمارے میں انہوں نے اقبال حسن خان کے ناول ''راج سنگھ لاہوریا'' کا پہلا باب شامل کر کے ایک دلچسپ سلسلہ شروع کر دیا ہے، جو ادبی دنیا میں پزیرائی کا سبب بنے گا کیونکہ بھاگتی دوڑتی زندگی میں ناول کے اقساط یہاں مہیا کرنے سے لوگ بہ آسانی اسے پڑھ سکیں گے۔ اور پاکستان میں لکھے جانے والے ادب کے ہر صنف سے متعارف ہونے کا موقع ملے گا۔ اس کے علاوہ اس شمارے کے سارے کے سارے تنقیدی مضامین اسے بہت خاص بنا رہے ہیں، وہ ارشد جمیل کا ''شمس الرحمٰن فاروقی: ایک مختصر جائزہ ہو' یا پروفیسر فتحی کا ''جانکی اور نسائی جنسیت کا شعور''، ''پیغام آفاقی کے ناول پلیتہ'' پر سلیم خان کا تبصرہ ہو یا ''میرا جی کے شعری روئے'' پر فیضان احمد ملک کا مضمون، یہ سب بہت عمدہ، معیاری اور فنی و فکری بصیرت کو جلا بخشنے والے ہیں۔ نظموں اور غزلوں کا انتخاب بھی ہمارے ادبی ذوق کو سیراب کرتا ہے۔ مجھے نسیم سید کی نظم ''سمجھوتہ'' بہت پسند آئی۔ افسانے کا جہاں تک ذکر ہے ممتاز رفیق، شاہد جمیل احمد جیسی شخصیت کا نام ہی اس فہرست میں دیکھ کر آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے اس کے علاوہ علی اکبر ناطق کا افسانہ ''سیاہ ٹھپہ''، م۔ص۔ ایمن کا افسانہ ''کیمیا''، نگہت نسیم کا افسانہ ''آلو قیمہ'' اور طلعت زہرا کا افسانہ ''سیڑھیاں'' خصوصیت سے پسند آئے اور ہر افسانہ الگ سے تفصیلی تبصرے کا متقاضی ہے۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصرے، غضنفر کا خاکہ اور صفدر امام قادری کا شموئل صاحب کی کتاب پر تبصرہ اسے اور بھی خاص، اور بھی اہم بنا رہے ہیں۔ اور ہمارے معلومات میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اقبال حسن آزاد جیسی ادب دوست شخصیت کا استقلال کسی بھی حالت میں نہ ڈگمگائے اور وہ ادب کے خزانے میں دنیا کے سمندر سے قیمتی موتی چن چن کر یونہی جمع کرتے رہیں۔ (آمین)

◀◀ ● ▶▶

سہ ماہی ذہن جدید (نئی دہلی) ترتیب: زبیر رضوی قیمت ۷۵ روپے صفحات ۲۲۴	ماہانہ زبان و ادب (پٹنہ) مدیر: مشتاق احمد نوری قیمت دس روپے صفحات ۸۰
عالمی انوار تخلیق (رانچی) مدیر: ڈاکٹر ایم۔ اے۔ حق قیمت ۵۰ روپے صفحات ۸۴	سہ ماہی ابجد (۱۶) ارریہ (گوشہ پرویز شہریار) مدیر: رضی احمد تنہا قیمت ۵۰ روپے صفحات ۱۴۴
سہ ماہی اردو (امراوتی) قیمت ۱۰۰ روپے	مدیر: وسیم فرحت کارنجوی (علیگ) صفحات: ۱۱۲

مکتوبات

☆ ''آپ ہم سے واقف نہیں۔ ہم کڑواہٹ برقرار رکھنے کا قرینہ بھی رکھتے ہیں۔''

''آپ نے مجھے مالا مال کر دیا ہے۔ اچھا کل ملتے ہیں'' میں نے ایک بوسہ ہوا میں اچھالتے ہوئے کہا۔

''پھر وہ مہکتی کافی کے ساتھ میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔''

'اُس کا ہاتھ تھام کر ایسا لگا جیسے پورے بدن میں برقی رو دوڑ گئی ہو۔''

'کسی مرد کے ہاتھ کا پہلا لمس عورت کو ذائقے کی کیسی سبک اور دھیمی دھیمی آنچ سے ہم کنار کرتا ہے اسے اب ہم بیان میں لا سکتے ہیں۔''

'میں نے ہاتھ چھُڑا کر اسے اپنی اور کھینچ لیا۔ وہ بھی پھولوں سے لدی مہربان ڈالی کی طرح میری جھولی میں آ گری۔ ہم پر دیر بے خبری کا یہ عالم طاری رہا۔''

''اندر دھڑ دھڑاتی اس آگ کا کیا کروں؟''

''صاحب جسم کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ انہیں باتوں سے کب تک بہلایا جا سکتا ہے؟''

''آدھا عشق'' تو وہی کر سکتا ہے جو ادھوری شخصیت کا حامل ہو۔ ممتاز رفیق کی ''اوّل کرداری بیانیہ پر مبنی'' کہانی جسے افسانے کے ذیل میں رکھا گیا جس پیش رسی کے ساتھ آغاز سے انجام تک پہنچائی گئی اس میں خاکہ نگاری میں تلخ و تند لہجہ اختیار کرنے والا قلم کار خاصا شوخ تیز و طرار نظر آتا ہے۔ جُملوں کی بے ساختہ یا ساختہ کاٹ دکھانے والا اور الگ تھلگ رہنے والا لاابالی سا انسان اپنے بیانیے میں مرکزی کردار کے طور پر جس طرح مکالمہ کرتا دکھائی دیتا ہے اس میں کسی قسم کی پراسراریت ہے نہ افسانوی رنگ البتہ کچھ آپ بیتی یا 'خاکہ نگاری' کا ہی گمان ہوتا ہے۔ بین السطور جنس مخالف کے روبرو ہیجانی کیفیت اور کش مکش کو چابک دستی سے

پیش کیا گیا ہے اور قاری ''اہمال وابتذال'' سے بڑی حد تک بچا رہتا ہے ''میرا دل چاہا کہ اٹھ کر اسے سینے سے لگالوں اور اس پر بوسوں کی بارش کردوں لیکن خود کو باندھے بیٹھا رہا'' تک کا احوال جس طرح اس کہانی میں کھل کر سامنے آیا کیا یہ منٹو کی جانکی کے شعور سے قدرے مماثل نہیں؟

علی اکبر ناطق کی کہانی ''سیاہ ٹھپّہ'' پہلے پڑھی گئی اور اس پر گفتگو کا محل اس سے زیادہ نہیں کہ یہ افسانہ قاری کو پہلی سطر سے اختتامیہ تک پڑھتے چلے جانے پر ذہنی طور پر آمادہ کرتا ہے۔ مرکزی کردار اور راوی خوش بیان کی تلخ وترش گفتگو پہلی نظر میں مجرم قاتل کی ماں کو دیکھنے کے بعد آخر میں اس تک پہنچنے کی خواہش ایک ''مرد کی نفسی یا نفسانی جبلت'' کو بہت خوبی سے پیش کیے جانے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر نگہت نسیم کا 'آلو قیمہ' ان کی کلینکل اسٹڈی اور پریکٹس کے دوران پیش آمدہ واقعات کو کہانی کے تار و پود میں سمیٹنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ ہمارے سماج میں جو متضاد انسانی رویے موجود یا نظر آتے ہیں ان کا بیانیہ عبدالعلیم شیخ، طلعت زہرہ، شاہد جمیل احمد اور محمد علم اللہ کی کہانیوں میں بہت عمدہ طریقے سے معرض اظہار میں لایا گیا ہے۔ م۔ص ایمن کی اپنی لائبریری کے حوالے سے ایک صاحب علم شخصیت کی کردار نگاری اور محنت کی عظمت کے پیغام پر منتج کی گئی کہانی بھی لائق ستایش ہے۔ بلاشبہ دنیا میں شر کے ساتھ خیر اسی طرح موجود ہے جیسے رات ڈھلنے کے بعد سورج کی کرنوں سے پھوٹی روشن حرارت بخش زندگی ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ ثالث کا شمارہ ٦ نہ صرف لکھنے والوں کے اعتماد واعتبار کی توثیق کرتا بلکہ مدیر اعزازی اور ان کے ہم کاروں کی ذہانت، انتخاب اور ترتیب وپیش کش کی ستایش پر بھی آمادہ کرتا ہے۔ حصہ نظم بھی کسی بھی ادبی جریدہ میں شامل تخلیقات ومنظومات سے کم درجہ نہیں ہے۔

سید انور جاوید ہاشمی (پاکستان)

☆ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے انتخاب کی خبر دے دی۔ مضمون شائع ہونے سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ پہلا رسالہ ہے جہاں سے اتنی جلدی جواب مل گیا۔ ظاہر ہے اصول بھی یہی ہونا چاہیے۔ کیوں کہ مہینوں تک جواب نہ ملنے کی وجہ سے ہمارا ایک ہی مضمون کئی کئی رسالوں میں شائع ہوجاتا ہے اور بعد میں شرمندگی اٹھانی پڑتی

ہے۔ اس مضمون کو بھی ہفتہ پہلے دو رسالوں میں بھیج چکی ہوں۔ لیکن جواب نہ دارد۔ آپ کا جواب ملنے کے بعد انھیں منع کر دیا ہے کہ نہ چھاپیں۔ آپ کا یہ طریقہ کار قابل تحسین ہے۔ یہی حال رسالوں کی ممبر شپ کا بھی ہے۔ سوائے ایوان اردو اور انشاء کے دوسرے رسالے پورے سال میں بمشکل ہی دو چار شمارے مل پاتے ہیں۔ باقی خدا جانے راستے سے کہاں غائب ہوجاتے۔ ستمبر میں ان رسالوں کی مدت پوری ہو رہی ہے۔ آئندہ کے لیے معافی ان سب سے۔ اب راوی، ثالث، تحقیق، سہیل، وغیرہ کی ممبر شپ لینی ہے۔ خدا کرے مایوسی نہ ہو۔

شہناز رحمٰن (علی گڈھ)

☆ دو نظمیں 'کائنات کا دائمی مسخرہ' اور نظم 'جلاوطنی اور تاج پوشی' بھیج رہا ہوں۔ ان میں ترتیب وار دو کردار ہیں، پیڈرو اور چتر پٹ۔ آپ سوچیں گے، نظم میں کردار؟ چونکئے مت، ایک مدیر کی حیثیت سے یہ آپ کے لیے دردسر ہی پیدا کرنے والا ہے۔ مگر پھر میں سوچتا ہوں، یار، اردو ادب اب ایک بہت سنجیدہ کاروبار بن کر رہ گیا ہے۔ مفاہیم تو اتنے سیدھے سادے، اتنے superficial اتنے direct اتنے concerned ہوگئے ہیں جیسے وہ ڈاکٹروں کا تجویز کیا ہوا کھانا ہو جو ہمارے معدے پر بوجھ نہ بنے اور ہمیں کموڈ پر بے چینی نہ ہو۔ اور ہمارے قلم کاروں کا کیا کہنا، جسے دیکھئے انسان کی دم سیدھی کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ابھی سرکاری رسالہ آجکل کے تازہ شمارے میں ایک مبصر نے افسانے کی ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ یوں لکھا ہے کہ قارئین اس کو پڑھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ افسانے پر عمل کرنا، میں تو سر بھی پٹک نہ سکا۔ ایسے میں پیڈرو اور چتر پٹ کو میں نے لومڑیوں کی طرح مرغیوں کے ڈربے کے اندر بھیجا ہے۔ ادب میں ایک ہلکی سی افراتفری تو ہو۔ ریزر کے کچھ تار تو کٹیں۔ کوئی تو یہ کہے کہ بھئی، بہت ہو چکا اب لوگوں کو کال کوٹھریوں سے باہر آنا چاہئے۔ ثالث کے لیے نیک خواہشات۔

صدیق عالم (کلکتہ)

☆ God bless you bonus, physical condition, prosperity, elevated rank position, command,, authority capability, prospect, assets, constancy to enhance for the promotion and projection

of peace, organization, alliance, egalitarianism around the humankind.

I have been a regular reader of your online/published literary magazine and I do not have any hesitation in calling your esteemed magazine as one of best journals available on line as well published. Even many colleagues of my institution regularly refer to the scholarly and erudite articles and papers published in your magazine and even ask students and other researchers to consult them. The quality and contents of the articles are of high and international standards. I think an able editorship and strict adherence to high standards on your part ensures the high and literary quality of articles in your magazine.

In my opinion, your magazine is rendering a great service to promotion of Urdu language, literature and good literary values among lovers of Urdu language. As we are aware increasing population of world is becoming Internet savvy and prefers to surf the Internet from the comforts of their homes and offices in search of information and materials. It just a matter of time that even lovers of Urdu would first search online for any information and reference.

I, therefore, consider your contribution and efforts in publishing the online magazine is commendable and is keeping in pace with the modern times. The articles and papers of young and budding scholars which get published online without the usual fuss of hardcopy magazines and journals would encourage them to write more and keep their interest alive.

I also seek your encouragement and support in my academic pursuits. I have also tried and written an article keeping in view the high standards of your magazine. I am sending the same, attached herewith, for publication in your esteemed magazine. This will really encourage and inspire me to continue my studies and research. With best regards and Thanking you in anticipation of a positive response from your side, Uzma Sethi (Lahore, Pakistan)

☆ Please find a article on your journal which had send by you in past sorry for delay I pray to holy God your intellectual practices of multilingualism will be a concern for core academic and research communities.

I hope to continue this literary relationship with you and your

intellectual fragrance including your writings in future and contribute research based papers and harmony based communication as much as possible with best regards and thanking you in anticipation of a positive response from your side kindly acknowledge this mail if you wish.

God bless you please accept my best regards take your care be happy and please pray for me.

Dr. Syed Mohd. Yahya. Saba Delhi

☆ میں فیصل اباد سے کل ہی آیا ہوں عید کے سلسلہ میں والدین کے پاس تھا۔ایک دو دن میں ابتدائی رائے دوں گا لیکن ایک چیز طے ہے کہ معیار کو آپ نے برقرار رکھا ہے اور یہ ایک ریاضت طلب کام ہے جس میں آپ کی نیک نیتی اور محنت کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔

اردو رسائل کو چلانا جب کہ اس میں اشتہارات بھی نہ ہوں ایک مشکل کام ہے بلکہ اپنی ذاتی جیب ہلکی کرنے کا نام اردو رسالہ ہے اور پھر پلے سے پیسے لگا کر اسے ارسال کرنا بھی ایک کار دارد ہے۔ میں تو صرف اس بات کا شکریہ ہی ادا کرنے سے قاصر ہوں کہ بہت دور سے اتنی محبت کے ساتھ آپ اسے ارسال کرتے ہیں کہ جہاں سرحدوں کی باڑ بہت اونچی ہو اور ہمارے لیے ثالث ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی فاختہ اڑان بھر کر ہماری منڈیر پر آ اترے۔ یونس خان (پاکستان)

☆ بہت ہی خوبصورت اداریہ لکھا ہے آپ نے خاص طور پر زبان کی گرتی حالت پر آپ کے ذکر و فکر سے نئی نسل کو یقیناً نئی روشنی ملی گی۔

ڈاکٹر پرمود بھارتیہ (مسوری، اتراکھنڈ)

☆ ''ثالث'' کا چھٹا ایشو مجھے کافی پہلے مل گیا تھا اور اس کو پڑھنے کے بعد موبائل پر آپ سے بات بھی ہوئی تھی۔اس میں شامل بیشتر ادب پارے قابل قدر ہیں۔قلم کاروں کی تعریف کے ساتھ ساتھ آپ کی ادارت کی بھی تعریف بھی ہونی چاہئے۔کہ اتنی جلدی اپنی محنت اور ایمانداری سے آپنے ''ثالث'' کی ادبی دنیا میں ایک الگ شناخت دے دی ہے۔میں اس پرچے کی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

سردار آصف (شاہ جہاں پور، یوپی)

☆☆☆